

کیا اس کا کہ شہیدوں کا  
خون رائیگاں جائے گا؟



اگست 2015

اگست 2015ء



آزادی  
نعم  
1947  
تا  
2015

WWW.PAKSOCIETY.COM

قیمت - 90 روپے





سالانہ چندہ

رجسٹرڈ انٹرنیٹ

لاہور  
حکایت  
ماہنامہ

پاکستان 800 روپے

7000 روپے

1

سعودی عرب، کویت، اردن، ایران، سری لنکا، ابو ظہبی، بحرین،  
دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائجیریا اور  
انگولہ، مغربی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے،  
سویڈن، فرانس، ملائیشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگا پور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برطانیہ

7000 روپے

2

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، ویتنام، یونان، امریکہ،  
نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

غیر ملکی سے رقم بھجوانے کے لئے "وفاقی شاہد" کے نام کا ڈرافٹ دلائیں۔

پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کی پی پی پی جاتی، رقم پہلے بھجوائی نہ دینی ہے۔

کتابوں پر ایک خرچ خرید فرمائیں گے کے ذمہ ہوگا۔

خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلی پتہ کی اطلاع سب سے پہلے دیجئے۔

26- پیالہ گراؤنڈ، لنک میگزین روڈ، لاہور۔ فون: 042-37356541



# نورِ مبین



(اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی) ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے خدا اس کو جانتا ہے (۲۱۵)

## سورة البقرہ

READING  
Section



بنی  
عنایت اللہ  
شاہد بن عنایت اللہ

حکایت  
ماہنامہ

جلد 44 نمبر 12 دسمبر 2015

سرگولیشن منیجر

فضل رزاق

عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات

خرم اقبال

محمد اشفاق مومن

کمپیوٹرنگ

محید

پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیریت سہ ماہی  
عارف محمود  
نظیر سعد شاہد

وقاص شاہد پیرایہ  
سیدہ حفصہ  
میاں محمد ابراہیم

محسن مشہور  
بہار بیلا عظمت فاروق  
نعمت اللہ شاہد شمیم حسین  
ذات اللہ بی بی ذات اللہ شمیم  
ذات اللہ بی بی محمد اقبال

0323-4329344

0321-4616461

0343-4300564

0322-4847677

قیمت - 90 روپے

بیزنس 26- پیالہ گراؤنڈ لنگ میگزین روڈ لاہور 042-37356541

monthlyhikayat44@gmail.com

primecomputer.biz@gmail.com

www.paksociety.com

SCANNED BY AMIR

READING  
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



# الحسن ششماز پبلیشرز

9	فضائل مظہر انجم	غصہ و سر، فیچر	نگہ دین ٹک وشن
15	میدرم شمس الحسن	حیدر آباد	یوم پاکستان کے تقاضے
21	ابدال بیلا	پاکستان کھانی	چوک پر آگ اس
33	محمد امیر انجم	میں نے پاکستان بننے دیکھا	طنز و مزاح
30	غلام حسین محمد	محبت	قاریخی کھانی
35	محمد رفیق اختر	مظاہر فی مقیم	ایک ملو ایک کھانی
65	بشیر شمس	آزادی کے چراغ ابوبت	جہاں ہمارے گتے تھے
177	ایمان محمد حسن	ماہانہ قراوس	آزادی کی قیمت
81	محمد شمس	پس انداز	دست انداز
150	دقیقہ محمد	آپ کا پتہ کون سا ہے	اندھیرے سے احوالے
88	ایمان محمد	شب و بزم	شہر آباد
91	ایمان محمد	شہر آباد	داعیان آبادی
94	شہر آباد	پیشہ گوئی سے پرورش	
97	مسافر		

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



# کتابوں کی فہرست

113	پندرہویں صدی	چار دیواری کی دہائی
122	پندرہویں صدی	حالات حاصرہ
129	پندرہویں صدی	پاکستان کے خلاف سازشیں
165	پندرہویں صدی	ایک جہیز ایک افسانہ
171	پندرہویں صدی	پندرہویں صدی
195	پندرہویں صدی	سینئر کلبھی
209	پندرہویں صدی	مرکبہ مت
217	پندرہویں صدی	حرم و سرا
221	پندرہویں صدی	آتش پلا
225	پندرہویں صدی	سلسلہ وار ملول
229	پندرہویں صدی	آکاس ٹیکس
120	پندرہویں صدی	قندھار
194	پندرہویں صدی	جنہیں مہموں نے
		ایک فنر
		آگ انجمن پختون
		ضرب سنگدوی
		پاکستان کیوں شہرہ رنج تھا
		مکافات عمل
		مقام غیرت
		تکلیف
		صحرائی جاسوس
		مظلومات
		ڈاکوستان
		غزل



## حقیقت نگار قلم کار میاں محمد ابراہیم طاہر کی شاہکار کتابیں

رنگین تصاویر، ترجمہ و اضافے کے ساتھ

### عالمی سفر نامہ

صفحات: 406

قیمت: 700 روپے

1947ء کی داستانِ خونچکاں

### آزادی کی قیمت

قیمت: 250 روپے

جی دار لوگوں کی سرزمین

### جرمنی

قیمت: 300 روپے

تجارت مند کے روح پرور اور ایمان افروز سفر نامہ کامل

### سفر حج

صرف 25 روپے کے ایک گن بچ کر طلب کریں۔

ہدایت کو گم نہ ہونے والی قابل قراؤش داستان

### کشمال سے ناظرنگ

صفحات: 256

قیمت: 250 روپے

سفر نامہ

### امریکہ

تائن ایون سے پہلے اور بعد

صفحات: 344

قیمت: 350 روپے

شاگست

سیریاں محمد ابراہیم طاہر

54700 205M

0300-4154083

لکھنؤ سرنگ

125

کتبہ پاکستان

042-3735654

26

READING

SHAN



## کہنے کی بات

### یوم پاکستان — قائد اعظمؒ کے افکار کی روشنی میں

24 نومبر 1945ء کو پشاور میں ایک کانفرنس سے خطاب فرماتے ہوئے حضرت قائد اعظمؒ محمد علی جناح نے بانیگ دہلی کہا تھا:

”ہمارا کوئی دوست نہیں۔ یہ انگریز ہمارا دوست ہیں نہ ہندو۔ ہمارے فریمن صاف ہیں ہمیں دونوں سے نہیں ہے۔ یہ دونوں بنایا ہونے کے ٹاٹے ہمارے خلاف اگر متحد ہو جائیں، ہم پھر بھی خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ ہم ان دونوں کی متحدہ طاقت سے مقابلہ کریں گے اور ان شاء اللہ آخر میں فتح ہماری ہوگی۔“

حضرت قائد اعظمؒ کے عزم و ہمت نے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں کر دی اور برصغیر کے مسلمان اپنے عظیم قائد کی انتھک جدوجہد، بے لوث قیادت اور لازوال قربانیوں کے بعد دونوں کی متحدہ طاقت کو شکست دے کر آزاد وطن پاکستان حاصل کرنے میں فتح یاب ہو گئے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1947ء میں ہمیں وہ پاکستان نہیں ملا جس کا خواب حضرت علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور جس کے لئے حضرت قائد اعظمؒ جدوجہد کرتے رہے تھے لیکن جو کچھ بھی ملا دشمنوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فریب کاریوں کے باوجود ماہ رمضان المبارک کی ستائیسویں کی شب کو اللہ رب العزت کی رحمت خاص سے ملوایں گے ابتداء میں مسلمان برصغیر اسے ”مملکت خداداد پاکستان“ کہتے پکار رہے تھے اور لکھتے تھے پاکستان کا قیام اسلامی تاریخ کا ایک ایسا معجزہ تھا جس کی مثال عالمی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آزادی کے چوتھے روز، عید الفطر کے موقع پر، اپنے ایک لٹری پیغام میں حضرت قائد اعظمؒ نے قوم کے نام پر یہ تہنیت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”نیا بھر کے مسلمانوں کے لئے خوشی اور مسرت کا یہ دن ہماری قومی آزاد ریاست کی تخلیق کے فوراً بعد آیا ہے۔ اس لئے یہ دن ہمارے لئے خصوصی اہمیت اور خوشی کا باعث ہے۔ خدا ہمیں اتنی ہمت و قوت دے کہ ہم پاکستان کو دنیا کی اقوام کے درمیان واقعی ایک عظیم قوم بنا سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ تاہم یہ محض ایک مقصد کا آغاز ہے۔ ہم پر بہت



بھاری ذمہ داریاں پڑنے والی ہیں، انہیں پورا کرنے کے لئے ہمیں پختہ عزم و استقلال، حوصلے اور محنت سے کام لینا ہوگا۔“

ایک اور موقع پر حضرت قائد اعظمؒ نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔  
 ”پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے بنا ہے، یہ غریبوں کا ملک ہے اور اس پر غریبوں کو ہی حکومت کا حق ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیار زندگی اتنا بلند کیا جائے گا کہ غریب اور امیر میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ پاکستان اسلامی نظام اقتصاد کے سنہری اصولوں کے مطابق ہوگا جس نے غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔ پاکستان میں غریب اور امیر دونوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔“

قیام پاکستان کے بعد کی 68 سالہ تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو کسی بھی دور میں اور کسی بھی مقام پر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوگا کہ غریب غوام ہی پاکستان کے اصل حاکم ہیں اور ملک میں وہ مساوات قائم ہو چکی ہے جس کا خواب قائدؒ نے دیکھا اور قوم کو دکھایا تھا۔ قائدؒ کی آنکھ بند ہونے کے فوراً بعد ہی ملک پر جاگیرداروں اور استحصالی طبقوں نے قبضہ کر لیا اور آج تک قوم کی نحیف و نزار گردن پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ اب تو شاید کوئی خرابی انقلاب ہی ان سے نجات کا ذریعہ ثابت ہوگا۔  
 ایک موقع پر قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا۔

”وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد بن جاتے ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن حکیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ ایک اللہ، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک کتاب اور ایک امت۔“

یہ ایک انتہائی افسوسناک امر ہے کہ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد، م اتحاد اور تنظیم کا راستہ چھوڑ کر فرقوں، ذاتوں، برادریوں اور مختلف طبقوں میں بٹ کر انتشار اور بد نظمی کی راہ پر چل پڑے اور سیاستدانوں، افسر شاہی، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور دیگر استحصالی طبقوں نے اکثریت کو اپنا غلام بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہے آج پورا ملک دہشت گردی، بد امنی، خلفشار اور افراتفری کا شکار ہے۔ انا قانونیت عروج پر ہے اور حکومت کی رٹ کہیں نظر نہیں آتی۔

آج پھر ہمیں قائد اعظمؒ کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں، اتحاد، تنظیم اور ایمان پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں راہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ (آمین!)





## ننگ دیں ننگ وطرہ!

ufzalmazhar@gmail.com

☆ افضال مظہر انجم

ساریپ، سب سے پہلے اور گفتگو کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔  
فرما رہے تھے کہ قائد اعظم جیسی شخصیات کا سردار دیکھ کر  
اور آج کے زمانے کے مسلمان دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ یہ  
لوگ اللہ کے ولی تھے۔ سعید جہد صاحب پاکستان کی  
سیاست کے صاف ستھرے کردار اور دانش مند خان جسے  
میں ہمیں آف پاکستان کہا کرتا ہوں، کے قریب بھی  
رہنے میں سے متعلق بھی ایسی گفتگو کر رہے تھے کہ  
ایسی شخصیت جس پر پاکستان کی ان فوٹوں کو جی مغبوط  
بنا دیا اور 46 سال یعنی 1969ء تا حال آپسے سیاست  
دانوں میں ایک دو صاحب ستھرے اور ایماندار سیاست  
دان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے وہ فرما رہے تھے کہ  
آج کل کی نسل کو ملک و مائے وطن اور مغبوط کرنے والی  
شخصیات کے پر غصے اور بے لوث کردار کے بارے میں  
بتایا جاتا ہے تو وہ حیرت سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ لوگ ہی  
ملک کے باشندے تھے اسی معاشرے سے ہی ان کا تعلق  
تھا۔ کیونکہ کرپشن اور اس کے بارے میں گفتگو سے ان منہ نہیں  
بہ کر دیا اور جھوٹے معاشرے میں آئے ان طریق کی  
شخصیات کو ہونڈنے سے نہیں مل پاتا تھا۔

69 سال ملک کی شاہی قوم کی ہر بادی  
ملک سے نکلنے کی کہانی کہاں سے شروع کی  
جسے، عوام کی زیادتی کی داستان بیان کرنے کے لئے  
بفائز کے دفتر پر کاربند۔ 69 سال تھوڑا بہت نہیں پون  
صدی کا عرصہ کتنی قوم کو ذلت سے آغاب بنا دیتا ہے۔  
زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے جانے کے  
لئے کافی مدت ہے۔ ایسا ہوا بھی ہے جن قوموں کے عمل  
کر کے دکھایا ہے ان کے پیش نظر اپنا ملک، اپنی قوم  
اولین ترجیح تھی۔ انسانی حقوق میں اور جہاں تک پہنچنے میں  
کا مناسب رہے۔ دینا کی عظیم فوٹوں اور اقتصادی طاقت  
پہن کی مثال دی جائے جس کو ہم سے ایک سال بعد  
آزادی نصیب ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں تباہ و برباد  
ہونے والے جاپان کی مثال دی جائے یا ہر بادی کر۔

ملک چند روز پہلے ایک بڑا ننگ اور گھڑا میز پر سجایا  
بدر صاحب کے ہاں بیٹھا تھا اور یہی گفتگو جاری تھی کہ  
1947ء سے پہلے ایسی ایسی طاقتور طاقتیں تھیں کہ  
ہوئیں کہ ان کی عظیم شخصیات ملک سے نکلے جاتے تھے۔ یہ  
تھے جن کی وجہ سے اس ملک میں ہر گز ہو چکی ہے؟  
نہیں ہو چکی ہے۔ ہر مسلمان کو یہ یاد دلانا چاہیے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

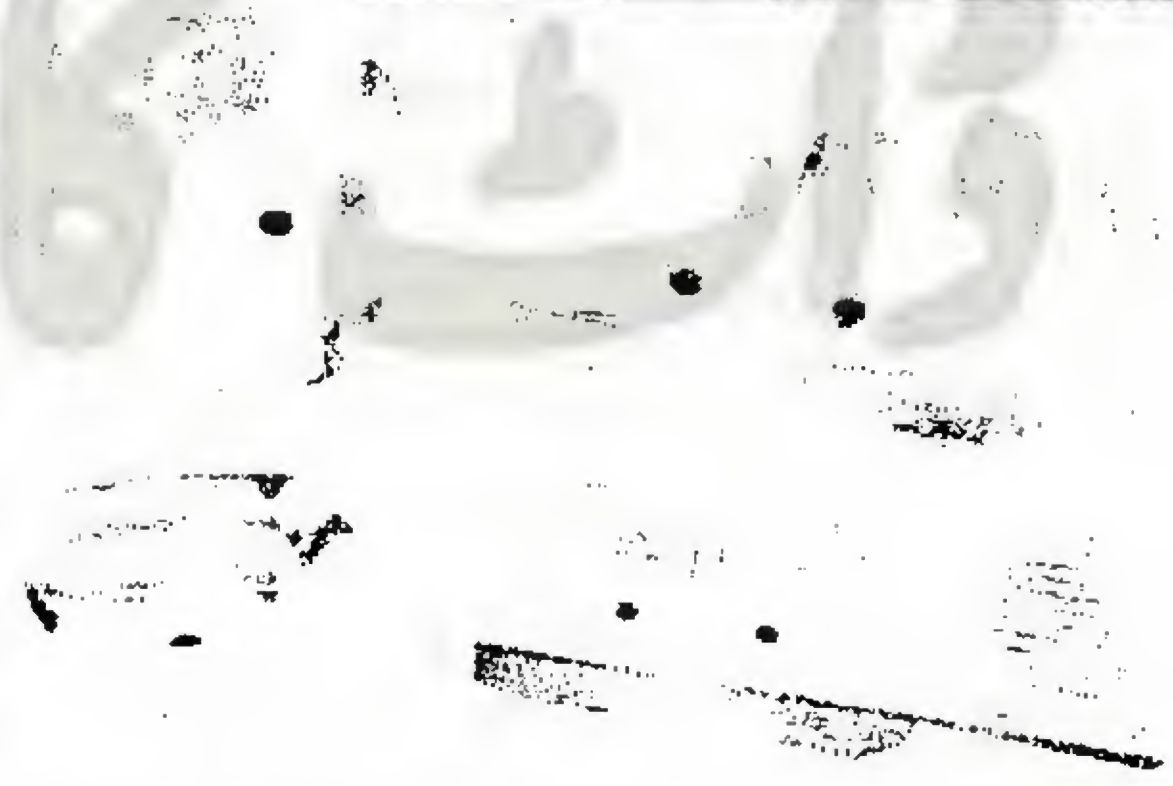
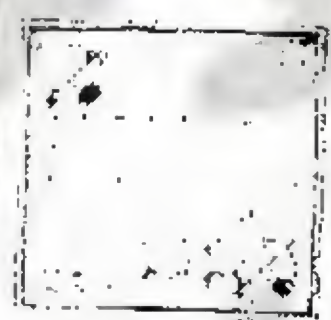


جڑتے بے نیاز غریب کی سے زیادہ مشہور

# اتلس

100% سٹیل  
سینک سینک

پاکستان میں سب سے پہلے بناڑ والے



اتلس وائیگل براؤز

یکین سینک

واش پین

لیبارٹری باؤل

سٹیل سٹیل

مین ہول کور



## HUSSAIN STEEL INDUSTRIES

Office:  
Bazar Kharadan, Gujranwala, Pakistan.  
Phone: 25-1777777, Fax: 0092-55-210945  
E-mail: info@atlas.com Web: www.atlaskinks.com

Factory:  
Opp. Global Village Hotel,  
G. T. Road, Gujranwala Cantt, Pakistan.  
Phone: 0092-55-210945



## جمہوریت

بادشاہت میں تو سر کا واسطہ صرف ایک جماعت سے پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں انہوں کی پوری قوم سے پڑتا ہے۔ (اتریشی - "بھیا ملک جیو")

انتخابی جواویدر - تلمذ نگہ

حاصل کیا یہ تھا۔ اس ملک کی آزادی کی لڑائی انہوں نے فسطوں سے محکمہ ظارہا اور کسی قسم کے نقصان سے بچاؤ ہو رہی تھی۔ قومی اور اخلاقی فرض تھا۔ یہ امر انہوں نے اپنا جھنڈا اس میں کروڑوں کی تعداد میں اٹھانے کا پتہ دیا تھا۔ یہ غیرتی اور بے مکی کی انتہا تھی۔ سپریم کورٹ اسے ہی وطن کو اس کے باسیوں کے لئے لونا شروع کر دیا اور اس لوٹ مار میں بھوکے لنگے بھوکے پسینے سے لگی کھاتے پیتے لوگ شامل تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار ہوں یا سردار، سیاسی جماعتوں کے لیڈر ہوں یا دیہات پرزے، جرنیل ہوں یا سرکاری افسر، نجی ہوں یا صنعت کار، مذہبی لیڈر ہوں یا کاروباری افراد، کبھی نے اس ملک کو اس طرح سے بھینھوڑا، تاخت و تار کی گریبے رکھ دیا کہ ہمیشہ سے اپنے شکار کا بھی نہ کرتے ہوں گے اور عرصہ دراز خصوصاً چھپاؤ میں سال سے یہ کام جاری و ساری ہے۔ رکھنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

## چمن اجاڑ کے رکھ دیا گیا

قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کی ٹیم نے اس ملک کے شہداء کے ہمراہ اس ملک کو بنانے کے لئے جو قربانیاں دی تھیں بعد میں آنے والے حکمرانوں نے زیر سایہ اس ملک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے، اس کی جڑیں کمزور کرنے، اس کی معیشت کو تباہ کرنے کے لئے ہر گھناؤنا فعل انجام دیا۔ یہ جو اس ملک کا دشمن اور دشمن بھارت تک انجام نہیں دے سکتے ہو گے۔ جمہوریت کی خدمتوں

رنگے آجس کا خون بہانے میں اور مسلمانوں کی طاقت کے ضیاع کے عمل میں مصروف کار ہیں۔

## یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے

عمر 69 سال، آبادی 19 کروڑ نفوس، بے روزگاری کی تعداد پڑھ لکھے 40 لاکھ، ان پڑھ 2 کروڑ، اس کے سامنے برابری تاپشاور ایک ملک نہیں بن سکی، بھوکے لنگے 7 کروڑ 60 لاکھ (40 فیصد افراد غربت سے نچلی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور)، صحت 15 کروڑ افراد علانی معالجہ سے محروم، تعلیم 5 کروڑ تعلیم سے بے بہرہ، تعمیر و ترقی 69 سال میں برجوں، حکومتیں صاف پانی کا مسئلہ حل نہیں کر سکیں۔ سیلاب ہر سال آکر تباہی مچاتا ہے۔ مسائل حل ہونے تک بھی نہیں بلکہ ان میں 5000 فیصد تک کا اضافہ ہوا۔ بجلی بند، پیڑوں مہنگا، پینے کو گندا پانی، گیس غائب، اشیائے ضروریہ مہنگی، انصاف غریب کی پہنچ سے دور، قرضے ملکی وغیرہ ملکی 16630 ارب روپے کے قرضے۔

## قومی خزانہ لوٹنے کے ریکارڈ قائم

انگریزوں نے دو سو سال اس خطہ پر حکومت کی لیکن وہ بھی یہاں سے کہانی گئی دولت کا کچھ فیصد حصہ برطانیہ بھجوا کر رہا تھا باقی کی رقم سے برصغیر ہندوستان میں عوام کے لئے تعمیر و ترقی کے پراجیکٹ مکمل کئے گئے۔ ریلوے لائنیں بچھائی گئیں، نہریں، پل، بیراج اور سڑکوں کی تعمیر کی جاتی رہی۔ میڈیکل کالج، انجینئرنگ ادارے اور سائنسی تعلیم کے ادارے قائم کئے گئے۔ یہ ایک نیا قوم کا کردار ہے جس نے مفتوح ملک سے بھی سو فیصد حصہ خود کھانے یا استعمال کرنے کی بجائے یہاں کے عوام کی خوشی کے لئے استعمال کیا لیکن پاکستان تو ہمارا اپنا ملک تھا لیکن وہاں سے اس ملک کی قربانی کے بعد



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



پوری آرمی مشعل ہو گیا۔ بچوں کی تعلیم، علاج، ادب کے لئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہ رہی۔ یہی سارے غبنے یا مافیہ زسے اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو راستے سے ہٹانے کے بعد ملک کی کثیر آبادی یعنی 80 فیصد عوام کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ ان کے مقابل آ کر انہیں غلط کام سے روکیں اور اپنے حقوق اور وسائل ان سے طلب کر سکیں۔ گویا 69 سال بعد ملک کی حالت ایسی بنادی گئی کہ عوام اور صنعت کے لئے تو بجلی، گیس موجود نہیں ان کے لئے چولہے جلانے کے وسائل موجود نہیں اور ان کے سبکے خوراک کی کمی کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے اور ملک کو لوٹنے والا طبقہ توانا و تو گھر ہوتا جا رہا ہے۔

”حکایت“ کے قارئین اندرون ملک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں خصوصاً وہ بزرگ خواجہ امداد علی اس کے قاری رہے ہیں جب ”حکایت“ ایک تحریک، ایک دلولہ تعصبات سے پاک ملک و قوم کی ترقی کے لئے ایک فکری تحریک کے طور پر کام کر رہا ہے۔ دیار غیر میں ایسے ہی آباد لاکھوں پاکستانیوں میں بیچاس سال سے برطانیہ (گلابگوں) میں آباد محمد صدیق صاحب کی شخصیت بھی ہے جو راقم سے اور ایڈیٹر ”حکایت“ عارف محمود صاحب سے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں اور اپنے وطن کے متعلق فکر مند ہوتے ہیں۔ محمد صدیق صاحب اور انہی جیسے غیر ممالک میں آباد پاکستانیوں کے اطمینان کا باعث صرف یہی بات ہے کہ خطرات اور مشکلات اور شدید رکاوٹیں پیش آنے کے باوجود یہ خطہ جو 10 لاکھ شہداء کے خون کی قربانی کے بعد 27 رمضان المبارک کو وجود میں آیا تا اب دنیا کے نقشے پر چمکتا رہے گا اور اس کو نقصان پہنچانے والے، لوٹنے والے سیاہ چہروں کا نام تاریخ نے صفحات پر ننگ ملت، ننگ وطن کی حیثیت سے سیاہ حروف میں ہی لکھا جائے گا!

○\*○

رہے۔ اپنے مذموم عزائم کی خاطر فرقہ پرستوں نے معصوم لوگوں کو ہی استعمال کیا۔

یہی طرح سے عوام شش حکومتوں کے دور میں ہر قسم کا بوجھ، ٹیکس، مہنگائی، خوراک کی کمی، اودیات کا ناپید ہونا سبھی عوام کو ہی برداشت کرنا پڑا۔ ٹیکس بھروسہ و غوغا نہ دینے اور دولت مند سے ٹیکس نہ وصول کرنے کی وجہ سے آنے روز پٹرول، بجلی، گیس کے نرخ بدھا کر ہر شے کے نرخوں میں اضافہ کا سارا بوجھ عوام کو ہی برداشت کرنا پڑا۔ سیلاب آئے، زلزلہ کی آفت ہو یا گرمی کی حدت عوام ہی لقمہ اجل بنتے رہے۔ غریب کی جھونپڑی ہی دریا بردہوتی رہی۔

## عوام دو وقت کی روٹی کو ترسنے لگے

اس ملک کو اس قدر اور ایسے ایسے ٹھنڈے طریقے سے لوٹا گیا جس کو بیان کرتے ہی دل خون لئے آنسو روتا ہے۔ لوٹنے والے اس با اثر طبقے نے جو ہتھیار مافیہ میں تبدیل ہو چکا ہے، گھریلو روپے کے لہجوں کا مالک ہے اور چند ہزار خواہ مخواہ نیٹے والوں نے کروڑوں روپے کے اثاثے کس طرح سے ہٹائے۔ سیاست میں وارد ہونے والے فٹ پوٹنجیوں نے سیاست کو کاروبار بنا کر کس طرح سے اپنی جھولیوں میں بھر لیا اور ٹیکس چور کاروباری طبقے نے ٹیکس چوری کر کے کس کس طریقے سے کروڑوں کے اثاثے ہٹائے۔ سیاست دانوں، جرنیلوں، سرکاری افسروں، ججوں اور کاروباری طبقے نے نہ صرف اس ملک میں اربوں کے اثاثے ہٹائے اپنی اولادوں کو کروڑوں کے کاروبار شروع کرا دیئے اور جی بھر کے لوٹ مار کی گئی۔ اوست بیرون ملک فرانسفر کر دی اور ان کو کوئی چوچھنے والا نہیں۔

دوسری طرف ملک کے 80 فیصد عوام کا نا طبقہ اس طریق سے غارت کیا گیا کہ ان کے لئے دو وقت کی روٹی



پاکستان کی کوئی مستند، غیر جانبدار اور جامع تاریخ لکھے تو ہمیں اپنی کارگزاری کا پتہ چلے گا اور ہم کو تباہیوں کا ازالہ کر کے ٹھیک پاکستان کے لئے غور و فکر اور تک و دوں کریں۔

## یوم پاکستان کے تقاضے

(نائب ادا رہے کا مضمون نگار کے نقطہ نظر سے متفق ہو، ضروری نہیں)

### ☆ سید ریاض الحسن سکواڈرن لیڈر (ر)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں  
کو میرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جانے کی  
(علامہ اقبال)

ہم پاکستان کی پائیم جو بڑی مسئلہ کے قریب ہیں  
لیکن اس ملک کو حقیقی معنوں میں پاکستان بنانے سے روز  
بروز دور ہو رہے ہیں۔ ابھی تک ہم نظریہ پاکستان، تحریک  
پاکستان، تشکیل پاکستان، تعمیر پاکستان، تاریخ پاکستان اور  
تعمیل پاکستان کے متعلق واضح تصور اور غیر مبہم خیالات  
نہیں رکھتے۔ جہاں تک نظریہ پاکستان کا تعلق ہے ابھی  
تک کچھ لوگ یہ اطلاق کہتے ہیں کہ حصول پاکستان کے  
سلسلہ میں اسلام کا نام محض عوام کو اکسارنے کے لئے  
استعمال کیا گیا ورنہ بانیان پاکستان اس مقصد کے لئے  
محض نہ تھے، ورنہ ملک کا وزیر قانون ایف ایف اندر ہڈیر  
خارجہ ایک مرزا ہی نہ بنایا جاتا جس کی وجہ سے ملک کو کافی  
مرہ۔ تک مسلم دنیا میں ناقابل اعتبار گرد آتا ہے۔ قرار داد  
مقاصد پاس کریں گی لیکن اس کے مطابق عرصہ دراز تک

آئین نہ بنایا گیا۔ حالانکہ پوہری محمد علی پستہ تیس۔  
موجود تھے اور وہ پاکستان کی پہلی سائنس دان تھیں۔ ان کا تعلق  
کر سکتے تھے۔

اسے بنا آزاد و آزاد خاک شد  
بعد میں ملک کے لئے چار آئین بنائے گئے لیکن  
قرار داد مقاصد کو آئین کا باقاعدہ حصہ نہیں بنایا گیا۔ محض  
ایک چھپ کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ معاہدہ ایک فوجی  
حکمران کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے قرار داد مقاصد کو  
آئین کا حصہ بنا دیا۔ اس پر پی ڈی ایم نے بھی شک شک ہیں  
کہ یہ قرار داد ان کے سراپا پر تبار کی طرف سے لگایا گیا ہے  
اور اس وقت ان کی آزادی اذکار کا قہر قہر کر رہی ہے۔  
آئینوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر قرار داد کا باوجود محض  
پارہ نہ دیتی پسند اور روشن خیال فہم کر رہے اس کے بعد  
رہے ہیں لیکن جو لوگ مرزا جان مرزا جان۔ ملک میں وہ  
خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں کہ لوگ مغربی جمہوریت نظم  
میں اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں۔

READING  
Section



یہاں جاہل، فحش، شرابیوں، دالہ اور اسلامی تعلیمات سے  
بے بہرہ لوگ، عہد بروز و ذرا عظیم تو بن سکتے ہیں لیکن کسی  
خدا کی خدمت کے حائل کا افنی کیا کسی وجہ سے حاصل کرنا اور  
مستور نہیں تو محال ہے اور یہاں ہر مایہ داران جمہوری طریقہ  
کار میں اعتماد اور حائل لازم و ملزوم ہیں اور منقرض علی آقا  
تو ہے۔

نہ ہر قوم بندگان کی اس تقسیم پر شوقیں ہیں کہ  
 ہمارے لئے علم اور جہل اسکے لئے مال ہے۔

پھر دولت اور اقتدار کا چونی و امن کا ساتھ ہے۔  
 پاکستان میں اس قسم کے ماحول کی خصوصی اہمیت ہے۔ جن  
 نے بددعا سازوں کو دولت کی ذرا کمی ہو وہ اپنی شایانہ  
 دیاہوں اور زمانہ ساز اہمیت کے مل بولے پر دولت و اقتدار  
 پر بددعا عمل کر لیتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی علوم کی مہارت  
 نھنے والوں کا مقام ہے ایک مفتی محمود گو ایک سالی سے بھی  
 کلمہ عرصہ کے لئے صوبائی سطح کا اقتدار ملا۔ انہوں نے  
 مٹانی کا نہ کیا لیکن جلد ہی وہ مستعفی ہوئے پر مجبور ہو دیئے  
 گئے۔ ان کی اولاد (پوری کی پوری) آج تک ہر حکومت  
 میں شامل یعنی آج بھی ہے اور "مولا ناز بڑا" کے نام سے  
 شہرت یافتہ ہے۔

نظر یہ پاکستان کا جہم نے ہی حشر کیا ہے کہ کبھی  
اسلامی مشنریزم کا علمبرنگا کرتے ہیں اور ابھی اسلامی مضمہ ویت  
کے سن گاتے ہیں۔ بعض اوقات جمہ اسلامی مشنریزم  
اسلامی سیکولرزم کے بھی دلدلہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اسلام  
حکومت کا نام دیتے ہوئے جدید جہلاء کے پر جیتے ہیں۔  
اسلام کے خلاف بولنے سے تو یہ خوفزدہ رہتے ہیں لیکن علم  
نویز اہل علم کہ یہ لوگ اسلام کے خلاف دل کی بھڑائی  
رکالتے ہیں۔ بیشک علماء میں بھی خامیاں ہیں لیکن ان نام  
لہا و مالہ ان ازم کے حامیوں سے وہ بر میدان مل جاتا  
وجہ بہتر ہیں۔ جہاں سے سیاستدان جس قسم کی زبان بازی  
ایک دوسرے کے خلاف کرتے ہیں ان سے تو کیا علم

شہر مبارک ہے اور کس طریقہ سے یہ لوگ دولت کوٹتے ہیں  
اس سے اصل ڈاکو بھی عیش عیش کر اٹھتے ہیں۔ غوام کی فلارج  
و بہبود کے نام پر جعلی این جی اوز کے ذریعے دنیا بھر سے  
پتھرے، زکوٰۃ و خیرات اور صدقات منورہ لے لیتے ہیں اور  
بدنام ملہاؤ کو کرتے ہیں۔

پھر ہم کو رستہ نے اس بات کا واضح اشارہ دیا ہے کہ  
جہشت گردوں کو ایسی آبی اور سے اپنی معاونت میں سے نہیں  
اٹھارے وزیر داخلہ صاحب فرماتے ہیں کہ قومی انکسشن  
پلان کے سلسلہ میں زیر عملہ آمد کا اشارہ مناسب نہیں  
کیونکہ اس پلان کے خلاف اکثر این ٹی اور بہت بھائی  
ہیں اور ان کے سرکردہ زیادہ تر ایستادن ہیں۔ اس قسم  
کے سیاہ بازوں کے گرد عدالتیں حلقہ تک کر رہی ہیں لیکن  
سیاستدانوں کو قائلو کرنا عداوتوں کے اس کی بات نہیں ان کا  
صحیح محاسبہ عسکری قیادت ہی کر رہی ہے۔ اگر یہاں اسلامی  
نظام حکومت رائج ہوتا تو اکثر سیاستدان مٹنے لگتے۔  
ہوتے اور پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک بنتا۔

شب گریزاں ہوئی آخر جلوہ نور شید سے  
 یہ چھپی معصومہ ہو گئی غم آلود سے  
 جہاں تک تحریک پاکستان کا تعلق ہے چھوٹی وہ  
 نے چھپائی وہ اور بڑی وہ جہاں آئینہ عالمی ہو چھپائی  
 ان اور اس چھل کا فی حد تک وہ مہربانی سے غور کرتی ہے  
 چھپائی پاکستان کا زیادہ فی بد و جاگیر اور نوکری شادی سے رہتی  
 تھا۔ رہے ہیں۔ یہاں تھا مہمومت فرگیوں کا چھل۔ رہا ہے اور  
 لڑوینہ وہ ان کی نگاہی ہوئی آگ میں آگ چھپائی رہے ہیں۔ یہ  
 ہے کہ اور وہ پاکستان کے پاس ہوئے کہ ہاتھ ہی سلگ  
 گئی تھی اور وہ ہر روز چھپائی ہے۔ قلم اضمحنا پاکستان  
 چھپائی ہو گیا۔ یہ قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ چھپائی ہو گیا  
 قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ ان گنت لوگ تہہ و بہہ ہوئے، افواج  
 پاکستان، قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ قلم اضمحنا  
 پاکستان ہے۔ قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ قلم اضمحنا پاکستان ہے۔ قلم اضمحنا



تحریک میں غریب والدین کے نوجوان طلبہ کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں کیونکہ امراء اور حکمرانوں کے بچے تو ملک کے اعلیٰ اداروں یا غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں سیاست اور مار دھاڑ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ ان نام نہاد جمہوری لیڈروں سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ جب برطانوی پارلیمنٹ نے برصغیر کی آزادی اور تقسیم کا مل پاس کر لیا تھا تو پھر بڑے شہروں میں طالبات کے جلوس نکالنے اور سول سیکرٹریٹ پر آزادی کے دن سے قبل مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے اور پولیس سے ٹکرانے کی کیا ضرورت تھی اور اس طرح نوجوان طالبات کو ذلیل کرنے اور کئی کو معذور کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ یہ سیاسی لیڈروں کی انتہائی کمزور اور مکارانہ چال تھی کہ لوگوں کی توجہ ان کی نااہلی اور لوٹ مار کی طرف مبذول نہ ہو۔ تحریک پاکستان کو بھورنگ بنانے میں بالآخر لیڈروں کی چال بازی اور خود غرضی کا بہت زیادہ دخل تھا۔

بدلے یہ معاملہ چند دن میں بطریق احسن طے ہو سکتا تھا۔ ملک کی یہ دگرگوں حالت اس لئے ہوئی کہ سازشی ٹولے کو صرف اپنے مفادات عزیز تھے۔ یہ لوگ ابھی تک ان مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ اقتدار کے مزے بھی لوٹ رہے ہیں اور بے انتہا دولت بھی سمیٹ رہے ہیں اس فرنگی نظام جمہوریت میں ایسے ظیروں اور وڈیروں سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

تحریک پاکستان کے دوران سیاسی لیڈروں نے طلبہ کو احتجاجی تحریکوں کا ہرادل دستہ قرار دیا اور ان کو برملا کہا گیا کہ تعلیم کو چھوڑ دو اور تحریک میں سرگرم حصہ لو۔ طلبہ کے نظم و نسق کو اس حد تک تباہ کیا گیا کہ ابھی تک اس مادر پدر آزادی کا ازالہ نہیں کیا جاسکا۔ اس لاقانونیت کی ابتدا علی گڑھ سے ہوئی اور پورے ملک کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں پھیل گئی۔ اسی کی متابعت میں اب ہر سیاسی جماعت نے طلبہ ونگ رکھے ہوئے ہیں اور ہر سیاسی

R.T.M NO 373738



Moulded Furniture

RELAXO

پزل چیمہ

لوناٹک (میرٹھ)

پلاسٹک فرنیچر

کلامیکس آباد جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

فون: 055-3857636

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COMONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



برصغیر کی زبانوں سے واقف نہیں تھے لہذا عوامی مسائل کو حل کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ وہ تو دہلی میں بیٹھ کر قانونی معاملات طے کرتے رہے۔ جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے اپنی سہولتوں کو مقدم جانا اسی وجہ سے یہ لوگ آج تک حکومت اور عیش کر رہے ہیں۔

اگر مسلم لیگ برصغیر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہر وٹھریز راہنماؤں کو اپنے ساتھ رکھتی تو پاکستان اس حالت میں تشکیل نہ پاتا بلکہ پورا پنجاب اور بنگال اس کا حصہ ہوتا۔ شیر شاہ سوری والی جرنیلی شاہراہ جو پشاور سے کلکتہ تک دراز تھی اس کے ارد گرد کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوتا اس کی حدود دہلی تک پھیلی ہوئی تھیں تو مختلف قسم کے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے اور اس وقت برصغیر میں پھیلے ہوئے ستر کروڑ مسلمان ایک عظیم الشان پاکستان کا حصہ ہوتے اور چند ہی سالوں میں یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا۔

عام طور پر یہ مشہور کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے دور میں مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پسماندہ تھے لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس دور میں علامہ مشرقی جیسے نابغہ روزگار شخص تھے جنہوں نے جدید و قدیم علوم میں ورلڈ ریکارڈ قائم کئے۔ علامہ اقبال بھی جدید و قدیم علوم کے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، نواب بہادر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بلند پایہ مقرر موجود تھے جن کے مقابلہ میں غیر مسلم بہت کم درجہ کے حامل تھے۔ مولانا آزاد امام الہند کے لقب سے مشہور تھے۔ مولانا مدنی استاد العلماء کہلاتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت کہلاتے تھے۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیری جید قسم کے عالم تھے۔ اس طرح کے بے شمار علماء جو دیوبند، بریلی، ندوہ اور کئی دوسرے اداروں کے فارغ التحصیل اہل علم، ادیب اور فاضل تھے جو پورے برصغیر میں بہت مشہور اور ہر وٹھریز تھے۔ ان میں سے اکثر مسلم لیگ کے بھرپور تعاون کر رہے تھے لیکن

تفکیک پاکستان کے سلسلہ میں جس لا پرواہی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب ایک دفعہ یہ اصول طے پا گیا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کا حصہ ہوں گے تو پھر پنجاب اور بنگال کو کیوں تقسیم کیا گیا؟ صوبہ سرحد اور خلیفہ میں ریفرنڈم کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آزادی سے پہلے پورے پنجاب، پورے بنگال، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی مگر مسلمانوں کے زیر تسلط علاقوں کو بھی متنازعہ بنادیا گیا اس طرح قتل و غارت اور لوٹ مار کے دروا کر دیئے اور بے شمار لوگوں نے قربانیاں دیں اور لیڈروں نے خوب ہاتھ رنگے۔

سرحدوں کے تعین کے لئے مسلم لیگ نے ایک قادیانی کو نامزد کیا جس کی ہمدردیاں اپنے مرکز قادیاں کے ساتھ تھیں جسے بھارت کا حصہ بنانا اس کے لئے زیادہ مفید تھا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر تک راستہ مل گیا اور وہ اس کے زیادہ حصہ پر قابض ہو گیا۔ کشمیر کا مسئلہ ایسا حساس تنازعہ بن گیا جس کے لئے کئی جنگیں ہو چکی ہیں اور مذاکرات تسلسل سے جاری ہیں لیکن یہ مسئلہ مستقبل قریب میں حل ہونا نظر نہیں آتا۔ یہ سب شاخسانہ قادیانی، ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ اگر سردار عبدالرب نشتر اور چوہدری محمد علی جیسے قلعہ اور قافلہ راہنماؤں کی خدمات حاصل کی جاتیں تو پاک و ہند کے مسائل بہتر انداز میں ہو جاتے۔

ایسی کون سی مجبوری تھی کہ ایسا پاکستان تفکیک کرنے پر رضا مندی کا اظہار کیا گیا جس کا دھڑ خلیج بنگال میں تھا۔ ایک ٹانگ کراچی سے طورخم تک دراز تھی گھٹنا بلوچستان کی طرف اور دوسری ٹانگ تھی ہی نہیں۔ ان سارے معاملات میں قائد اعظم بے بس تھے کیونکہ وہ ایسی بیماری میں مبتلا تھے کہ ان کے لئے ایسے الجھے ہوئے مسائل حل کرنا مشکل تھا۔ وہ زیادہ تر دہلی، بمبئی اور کراچی تک محدود رہے۔ وہ پنجاب اور بنگال کے جذباتی مسائل سے لاتعلق رہے۔ وہ



انتہائی غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے تو یہ اعلان کیا گیا کہ پاکستان ایک سیکولر ملک ہوگا جس میں مسلم اور غیر مسلم سیاسی طور پر برابر ہوں گے۔ حالانکہ ایک انتہائی مملکت میں صرف مسلمان ہی اہم اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں۔ یہاں ابتدائی سے ایک ہندو کو وزیر قانون اور ایک قادیانی کو وزیر خارجہ بنا کر اسلامی نظام حکومت کے دعوؤں پر پانی پھیر دیا گیا۔ قائد اعظم کو سربراہ مملکت اور صدر پارلیمنٹ بنا کر جدید جمہوری نظام کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ قائد رحمۃ اللہ موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کے آرام اور علاج کا مناسب بندوبست کرنے کی بجائے ان پر دہریہ ذمہ داری ڈال دی گئی۔ وہ آرام و سکون کی خاطر زیارت تشریف لے گئے تو ان کے بیڈ پر میسوں فائلز کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ حالانکہ فائلوں کا کام وزیر اعظم کو کرنا چاہئے تھا۔

محترم قائد کی وفات کے بعد وزیر اعظم جناب قائد ملت نے تمام اختیارات خود سنبھال لئے حتیٰ کہ مسلم لیگ کی صدارت پر بھی فائز ہو گئے۔ حالانکہ قائد اعظم نے ایسے اقدام کو سخت ناپسند کیا تھا لیکن قائد ملت نے قائد اعظم کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے نہ صرف کلی اختیارات سنبھال لئے بلکہ ان کے ساتھیوں کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کے لئے سازشیں بھی شروع کر دیں۔ ملک کے مسائل کو حل کرنے اور اسے تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی بجائے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر دھونس، دھاندلی اور جھرو لو جیسے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ جلد ہی خود بھی سازش کا شکار ہوئے اور شہید ملت قرار پائے۔ ان کے بعد تو ملکی تعمیر و ترقی خواب و خیال ہو گئی۔ ملک کو وہ خود ہی امریکہ کے پاس گروی رکھ گئے تھے۔ ان کے جانشینوں نے تو ملک و ملت کو بالکل ہی امریکہ کا غلام بنا دیا۔ اب پاکستان میں حکومتیں بنانا اگر امریکہ نے نوکر شاہی کے ذریعے اپنے ذمہ لے لیا۔ سیاستدانوں نے مرنی حکومت کی فرمانبرداری

مسلم لیگ پر قابض جاگیردار، سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے اراکین کے لئے یہ ناقابل برداشت تھے کیونکہ ان کی وجہ سے اس قبضہ گرد پ کا مستقبل تاریک ہو جاتا جن کے چہرہ کار آج بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے مالک بنے ہوئے ہیں اور اسلام کا نام لے کر ملک میں لوٹ چار ہے ہیں۔ ان خود غرض اور اقتدار کے بھوکے افراد نے جمعیت علماء کے راہنماؤں پر طرح طرح کے الزامات لگا کر ان کو مسلم لیگ سے بدظن کروایا اور کانگریس نے ان سے تعاون کر کے ان کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ انگریز، ہندو اور مسلمان سرمایہ داروں کا یہی مشن تھا کہ مسلمان تقسیم ہو جائیں اور ان کی سیاسی غلامی سے نکل کر دینی غلامی کے اسیر رہیں۔ ان کی چال کامیاب رہی اور مسلمان گوروں کی غلامی سے نکل کر کالے انگریزوں کے غلام بن گئے جس سے نجات کافی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جمعیت پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے راہنماؤں نے مسلم لیگ سے چلبلی کے لئے پچاس ہزار روپیہ طلب کیا تھا جو مسلم لیگ اپنی کمپری اور غریب جاگیرداروں کی وجہ سے ادا نہ کر سکی اور علماء کانگریس کی طرف چلے گئے حالانکہ اتنی رقم تو قائد اعظم اپنی جیب سے ادا کر سکتے تھے اور علماء تو لاکھوں روپے چند دنوں میں عوام سے اکٹھے کر سکتے تھے انہیں کیا ضرورت تھی کہ مسکین جاگیرداروں کو پریشان کرتے۔

بہر حال اس قسم کے حالات تھے جن میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لایا۔ سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کا تھا جن کے لئے کسی نے کوئی منصوبہ بندی نہ کی۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کو روکنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا جس کی بناء پر بے شمار لوگ عرصہ دراز تک بے سرو سامانی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے اور شاطر سیاستدانوں نے ان کا خوب استحصال کیا اور لوٹ مار کے ریکارڈ قائم کئے۔

تعمیر و ترقی پاکستان کے سلسلہ میں ذمہ داروں نے



ثابت ہوئے۔ کامیاب سیاستدانوں نے امریکہ کی ایماء پر باہمی تعاون کی بجائے محاذ آرائی شروع کر دی۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور انڈیا نے مداخلت کر کے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر دیا جس نے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کی۔ انوار پاکستان کو ذات آ میر شکست ہوئی اور ایک لاکھ کے قریب پاکستانی جنگی قیدی بنادئے گئے۔ قائد اعظم جیسی بڑا سر شخصیت مغربی پاکستان کو نیا پاکستان قرار دے کر اس کے شہنشاہ بن بیٹھے۔ اس دن سے لے کر آج تک پاکستان کو امن، خوشحالی اور ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس تقریباً نصف صدی کے دوران نو جنرل الیکشن ہو چکے ہیں اور مارشل لاء بھی لگ چکا ہے۔ ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہر میدان میں دنیا سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ملک میں امن و سکون ہو تو مستند ماہرین پیدا ہوں جو حکمرانوں کی چاٹوتی کی بجائے کوئی کارنامہ سرانجام دیں۔ ملکی تاریخ کا سب سے لاگ جائزہ لیں، حکمرانوں اور عوام کے کرتوتوں کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں اور ملک و ملت کی بے لوث خدمت کے لئے کوئی لائحہ عمل اور اصلاحی اصول بنائیں لیکن بڑا بدخیز فریضہ، لالچ اور لالچہ دہی کا کہ کوئی مرد میدان نظر نہیں آتا جس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھو وہی لنگ مارتا ہے

اس گلستان کی بہادری کو ایک نالہ کافی تھا  
ہر شاخ پر آؤ بیٹھا ہے نجا گلستاں کیا ہو گا؟  
پاکستان کی کوئی استعداد غیر جانبدارانہ اور جامع تاریخ  
نہیں تو ہمیں اپنی کارگزاری کا پتہ چلے گا ہم کو تازیوں کا  
ازالہ کر کے تشکیل پانچان کے لئے غور و فکر ہو۔ تیک و دو  
کریں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ

وائے ناکافی نتائج کارواں جاتا رہا

کو دس تے دس سے احساس ریاں جاتا رہا

\*\*\*

اور ایک دوسرے کی کردار کشی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ملک میں جلسے جلوس اور گھیراؤ جلاؤ کا دورہ دورہ شروع ہو گیا۔ گیارہ سال میں سات وزرائے اعظم مسلط کئے گئے کئی سیاستدان ہیر و سے زبرد اور کئی زبرد سے ہیر و ہو گئے لیکن ایک امریکی گماشتہ وزارت خارجہ پہ قائم رہا۔ پاکستان اندرون اور بیرون ملک بہت بدنام ہوا لیکن اس امریکی ایجنٹ نے امریکہ کا پلہ اور ملک کی جان نہیں چھوڑی تا آنکہ قدرت کو اس مملکت پر رحم آ گیا ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ سیاستدانوں کو مختلف بدعنوانیوں کی بناء پر نااہل قرار دیا گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں پہلے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد ازاں صدر مملکت کے عہدے پر براجمان ہو گئے۔ ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ ہر شعبے میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ مہنگائی اور بے روزگاری پر قابو پا لیا گیا۔ ملازمین کی تنخواہوں میں معتد بہ اضافہ کیا گیا۔ چوروں، ڈاکوؤں اور بد معاشوں کا قلع قمع کیا گیا۔ قادیانی وزیر خارجہ سے نجات ملی لیکن امریکہ کا اثر و رسوخ کم نہ ہوسکا۔ محمد علی بوگرا نے بطور وزیر خارجہ چین سے تعلقات استوار کئے، مشرق وسطیٰ کے ممالک سے روابط بہتر ہونے جو سابقہ وزیر خارجہ کی وجہ سے انتہائی مخدوش ہو گئے تھے لیکن امریکہ کو پاکستان کی ترقی اور خارجہ تعلقات میں انقلابی تبدیلی پسند نہ آئی۔

صدر مملکت نے "فرینڈز ٹاٹ ماسٹرز" نامی کتاب لکھ کر امریکہ کو برا فروخت کر دیا۔ پاکستان کے نااہل اور کرپٹ سیاستدان بھی سات سال بعد بحال ہو چکے تھے۔ امریکی ایجنسیوں اور پاکستانی سیاستدانوں نے مل کر ملک میں وہ ادھم مچایا کہ ایک عشرہ پر محیط ترقی غریب ہو گئی۔ ملک میں وہ افراط فری پیدا کی گئی کہ صدر مملکت نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور ایک عیاش قسم کے جنرل آغا محمد یحییٰ خاں کو اقتدار سونپ کر خود گوشہ نشین ہو گیا۔ نئے جنرل حاکم نے سب سیاستدانوں کو کھلی چھٹی دے دی۔ ملک میں پہلے

REMARKS

Section



محترم ابدال بیلا کی کتاب ”پاکستان کہانی“ ہماری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو ہمیں ایک ورثے کے طور پر اپنی اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ قوم سے کفار نے پاکستان کی کیا اور کیسی قیمت وصول کی تھی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت کی ایک جھلک ہے۔

## چوک پر اگ داس



تو نے اپنی مادر زاد برہنہ بہنوں کی چٹخیں نہیں سنیں..... امرتسر یہاں سے اتنی دُور تو نہیں!

### ☆ ڈاکٹر ابدال بیلا

بھاگنے دوڑنے اور چلانے کی عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ شور سن کے میں بھی ہوٹل کے اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ہوٹل شہر سے باہر تھا۔ آگے کی سڑک بھی دیکھتے تین طرف کھیت تھے۔ کھیتوں کی طرف ہوٹل کے پچھواڑے میں ملحقہ دیوار کے ساتھ مالی کا کچا گھر تھا۔ دھواں اسی گھر سے اٹھ رہا تھا اور لوگ بھی ادھر جا رہے تھے، میں بھی چلا گیا۔ ایک پگڈنڈی سے کھیتوں کے بیچ سے ادھر جاتی تھی، اسی پر سب چلے جا

READING  
Section



رہے تھے۔

مالی کے گھر کی بیرونی دیوار کے اوپر ٹھوڑیاں رکھے لوگوں کا ہجوم اندر نکلے جا رہا تھا، کچھ لوگ دروازے میں کھڑے تھے، میں راستہ بناتا ہوا اندر چلا گیا، مالی کی رہائش کے دو کمروں میں ہٹ کے کھلے کچے صحن میں پرالی کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اسی ڈھیر میں آگ بھڑک رہی تھی، اکا دکا آدمی بے دلی سے لمبی لمبی سوٹیاں لئے پرالی کے اچھلتے شعلوں پر مار رہے تھے۔ شعلے اور سر اٹھا رہے تھے۔

ایک آدمی چار قدم ہٹ کے پینڈ پمپ کے نیچے ہالٹی کر کے نکلا گیز رہا تھا۔ ہالٹی بھر جاتی تو وہ قدم قدم چلتا، آگ سے دو قدم دور کھڑا ہو کے پانی اچھال دیتا۔ کچھ پانی آگ پر گرتا، ہالٹی راہ میں گارا کر دیتا۔

اتنے میں آگ سے پرے، گھر کے دروازے کے پاس پہل سی پکی، ایک شور اٹھا، بڑے صاحب آ گئے، بڑے صاحب..... دروازے اور راہ میں بظلوں میں ہاتھ دیئے کھڑے لوگ راہ دینے اور بڑے صاحب کو دیکھنے اور سلام کرنے کے لئے راستے سے ہٹ کے کھڑے ہو گئے اور ایک دم سے پرسپل صاحب اندر آ گئے۔

لوگ انہیں ہاتھ اٹھا اٹھا کے سلام کرنے لگے۔

وہ ایک دم سے بولے۔ مالی کدھر ہے؟

سب نے مالی کے گھر کے کمروں کی طرف دیکھا،

ادھر دونوں کمروں پر تالہ پڑا تھا۔

”کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ پرسپل صاحب نے

پوچھا۔

”نہ جی، اللہ نے بچالیا۔“ کوئی ایک بولا۔

کئی اوروں نے ہاں جی، ہاں جی کہا۔

پرسپل صاحب چلتے چلتے آگ کے قریب گئے اور

غور سے پرالی کے ایک طرف آگ کے شعلوں میں

گھوم رہے تھے۔ لپے ایک کچے ڈرے کی طرف

اشارہ کر کے بولے، یہ کیا ہے؟

ایک لمحے کے لئے سب خاموشی سے ادھر تکتے

لگے، خاموشی میں آگ کے شعلوں کی آواز کے علاوہ پھڑ

پر پھڑ پھڑانے کی ایک عجیب آواز آئی۔

اس میں مرغیاں تو نہیں؟ پرسپل صاحب چیخ کے

بولے۔

ہاں جی، ہاں!

اوہو کہتے ہوئے پرسپل صاحب خود ہی آگ پر

لپک پڑے، کھولو، کھولو، ڈرے کا دروازہ کھولو، ہٹاؤ سامنے

سے آگ، اور پر سے بھی..... جلدی کرو!

ڈرے کے آگے لوہے کی سلاخیں اور جالی تھی۔

ٹین کے چھوٹے سے بے دروازے پر تالہ لگا تھا۔ یہ توڑ

دو، جالی توڑو!

دروازہ بھی،

سب توڑ دو،

ٹکا لو مرغیوں کو!

تو بہ تو بہ!

کچھ لوگوں نے بھاگ کے سامنے سے آگ سے

بھری پرالی ہٹائی تو جالی کے اندر پر پھڑ پھڑاتی، دیواروں

کو گھریں مارتی، اچھلتی تڑپتی مرغیاں نظر آ گئیں۔

استغفار..... تو بہ تو بہ!

یہ تو چوک پراگ داس بنا دیا تم نے.....

ٹکا لو مرغیوں کو!

پرسپل صاحب نے چلاتے ہوئے خود ایک طرف

بڑی کدال لے کر لپک پڑے اور بے شمار ہاتھ بھی ادھر

لپکے۔ پلک جھپکنے میں ڈرے کی جالی ٹوٹ گئی اور جھلسی

ہوئی جلی جلی سی، سکیپاتی پر پھیلائے، چونچیں کھولے

ہوئے مرغیاں باہر آ گئیں۔ پرسپل صاحب تڑپ کے

جھکے، بازو پھیلائے اور ایک دو مرغیاں اٹھا کے گود میں

لے لیں۔ انہیں سینے سے بچھنچ لیا جیسے وہ مرغیاں نہیں



انسان کے بچے ہوں، ان کے اپنے بچے ہوں۔

پانی لاؤ،

ابھی آگ سے دور لے جاؤ۔

خود بھی وہ گود میں پکڑی مرغیوں کو اٹھائے اٹھائے

بھاگتے آگ سے دور چلے گئے۔

مرغیوں پر پانی ڈالا!

پلایا۔

یہ ہوا کیسے؟

یہ تو چوک پراگ داس ہو گیا۔

پتہ نہیں کسی اور نے پرنسپل صاحب کی بات نوٹ کی

یا نہیں۔

مجھے بڑا اچھا ہوا،

یہ چوک پراگ داس کیا ہوا؟

یہ کون سا چوک ہے؟

کدھر کا ہے!

میں نے ایک دن پرنسپل صاحب سے پوچھ لیا۔

عام کالجوں میں پرنسپل سے ملنا دشوار ہوتا ہوگا،

ہمارے کالج میں یہ مشکل نہیں تھا۔ ہمارے کالج کی ایک

ہی تو کلاس تھی..... ہماری کلاس!

کالج بنے چند مہینے ہوئے تھے۔

ہماری پہلی کلاس تھی۔

میڈیکل کالج کی پوائنٹنگ کلاس!

کالج کی اپنی بلڈنگ تو کئی سال بعد ایک نئی جگہ

بڑی شان سے بنی تھی۔ اس وقت وہ عمارتالی ہوئی کھیتوں

میں بنی ایک عمارت تھی، بلڈنگ کے کچھ کمرے کالج

انتظامیہ کے دفتر تھے، ایک بڑا سا شیڈ نما کمرہ، ہمارا ڈائی

سیکشن ہال تھا۔ باقی بلڈنگ کے برآمدے اور کمرے ہمارا

ہوشل تھا۔

ہوشل میں شور اٹھتا تو پرنسپل صاحب دفتر سے اٹھ

کے سوئی بٹھاتے ادھر آ جاتے۔ دفتر میں وہ شاف کو

ڈانٹتے تو ہوشل سے لڑکے نکل کے ان کے دفتر کی

درزوں سے جھانکنے لگتے۔ مجھے تو ان کے دفتر میں تاک

جھانک کی باقاعدہ اجازت ملی ہوئی تھی۔

وہ یوں ہوا کہ ایک دن وہ حسب عادت قیص

اتارے، ایک بنیان اور سفید آل پہنے ہوئے، پسینے میں

شرابور کلاس میں اور ہیڈ دیو پر پرو جیکٹر چلا کے بیٹھے ہمیں

دماغ کی پیچیدہ انٹرنی پڑھا رہے تھے۔ ان کی تو انسان کی

ہر جگہ سے پیچیدہ ہے۔ اس دن دماغ کی باری تھی۔ پتہ

نہیں کتنے گھنٹے بیت گئے۔

ان کے لیکچر کے صرف شروع ہونے کا وقت ہوتا

تھا ختم ہونے کا نہیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔

کلاس میں چند گھنٹے کے چٹھے تھے اور سٹوڈنٹ

پورے۔

سب پسینے سے بھیکے ہوئے تھے۔ پرنسپل صاحب کو

پڑھانے کا جنون تھا۔ پڑھا ہوا انہوں نے اتنا تھا کہ

شروع وہ بات ٹخنوں سے کرتے اور بات ہوتی ہوتی دماغ

تک پہنچ جاتی۔

بریں انٹرنی ان کے لئے فورٹ فیری ٹیل تھی۔

چار چار، پانچ پانچ گھنٹے مسلسل ان کا لیکچر جاری رہتا۔ ان

کی گفتگو کے اندر زمانے بھر کی باتیں آ جاتیں، ایٹم سے

لے کر اٹاک از جی تک کی باتیں۔ بات بات میں ان کی

دیرین اور وزڈم بھری ہوتی۔ اس دن بھی ساڑھے تین

گھنٹے گزر چکے تھے اور ابھی پرو جیکٹر پر دکھانے والی ان کی

اپنے ہاتھ سے نیا ٹرانسپیرنسیوں سے ایک فائل فولڈر بھرا

پڑا تھا۔

پڑھاتے پڑھاتے بوسلور میں نے پینتالیس

سال انٹرنی پڑھتے پڑھاتے، خود ڈائیکشن کر کے انسانی

جسم کی ایسی ایسی انوکھی پرتیں ڈھونڈی ہیں جو کسی کتاب

میں نہیں۔ ان کی اپنے ہاتھ سے ڈایا گرامز بنائی ہیں۔



باتیں کرنے کے وہ میز پر جھکے ہوئے کھلے کھلے کاغذوں کے پلندوں پر کچھ لکھتے رہتے، کچھ لکھا کاٹتے، درست کرتے رہتے، کبھی لکیریں مار مار کے نئے کالج کیمپس کا ڈیزائن بنانے میں محو ہوتے، کبھی بن کے آئے کسی ڈیزائن کی مین میخ نکالنے میں مصروف ہوتے۔ میں چپکے سے دروازہ کھول کے اندر آ جاتا۔ ان کی مصروفیت دیکھ کے صرف ہاتھ اٹھا کے سلام کرتا، منہ سے کچھ نہ بولتا، پانچ دس منٹ بعد انہیں میری آمد کا احساس ہوتا تو پھر اسی طرح ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دے دیتے مگر میز سے نظریں نہ اٹھاتے۔ بیٹھے اسی طرح اندھا دھند کام کرتے رہتے۔

دفتر میں تو وہ ادور آل بھی اتار دیتے تھے۔ بس ایک بنیان..... کبھی کبھی جون جولائی کی تہتی دو پہروں میں بنیان بھی اتر جاتی۔

ان کے سر، ماتھے، کمر اور سینے سے پسینہ نکلتا رہتا۔ بس ایک سفید تولیہ ان کے میز اور کرسی کے بیچ کہیں پڑا ہوتا تھا۔ لکھتے پڑھتے وہ وہی تولیہ اٹھا اٹھا کے اپنی گردن، چہرہ، سر اور کمر پونچھتے رہتے۔ سارا شاف حیران تھا کہ پرنسپل صاحب نے اپنے دفتر میں آرکائیویشن کیوں نہیں لگادیا۔

پیسوں کی کمی نہیں تھی، کلاس میں ہمیں پڑھانے کے لئے انہوں نے اپنے وقت کی جدید ترین ٹریننگ ایڈز اکٹھی کی ہوئی تھیں۔

ادور ہیڈ، سلائیڈ، سوشن کچر، پتہ نہیں کتنی طرح کے پروجیکٹرز تھے، کمپیوٹر میکانائٹ، پتہ نہیں کیا کیا اکٹھا کیا ہوا تھا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کسی بھی میڈیکل کالج میں اس قسم کی خرافات ابھی نہیں پہنچی تھیں، سب مزے سے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں میں اسے ہی لگا کے بیٹھے تھے۔

اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، بہتر سال سے اوپر ہوں۔ یہ اثاثہ میں کسی کتاب میں منتقل کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نہ رہوں میرا سیکھا علم پھر بھی سکھاتا رہے۔ راہ دکھاتا رہے۔

تم میں سے کوئی اچھا آرٹسٹ ہے جو اچھی تصویریں بنالیتا ہو؟

پوری کلاس نے ایک دم سے نعرہ لگا دیا۔ بیلا، بیلا! پرنسپل صاحب نے سر اٹھا کے کلاس کی طرف دیکھا۔

اور بولے

اف بیلا از ویلا

ہی بخذ کم نو فی اکیلا

کلاس قہقہے لگانے لگی۔

وہ یوں ہی ہنسا ہنسا کے پانچ پانچ کھنٹے بٹھائے رکھتے تھے۔

اگلے دن میں ان کے دفتر پہنچ گیا۔

انہوں نے اپنے تین چار بڑے فائل فولڈر مجھے تھمائے اور جیب سے نکال کے کچھیں روپے میری ہتھیلی پر رکھے۔ بولے بازار سے اپنی پسند کی پنسلیں اور مارکر لے آؤ۔ کاغذ جسہیں ہیڈ کلرک دے دے گا۔ بس کام شروع کر دو۔

کام شروع ہو گیا۔

میں تصویریں، ڈائیاگرام بنانا کے ان کے دفتر آتا جاتا رہتا۔ اکثر وہ شاف کے ساتھ باتوں میں الجھے ہوتے۔ میں چپکے سے آ کر ایک کونے میں دبک کے کھڑا ہو جاتا۔ وہ مجھے دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دے دیتے۔ میں سٹ کے بیٹھ جاتا، ان کی شاف سے کالج امور پر باتیں جاری رہتیں۔

دفتر میں اکیلے ہوتے تو بھی اسی قسم کی صورت حال ہوتی۔ فین مصروف تھا کہ بجائے شاف کے لوگوں سے



ایک بڑا پلندہ فائکوں کا جاتے ہوئے پرسپل صاحب باندھ کے ساتھ گھر لے جاتے۔ کلرکوں کو رات گھر سے ان سے ڈکٹیشن لینے جانا پڑتا، صبح آتے ہی یہ ڈی ایف اے دیکھنے بیٹھ جاتے۔

کلرک ہم سنوڈنٹس کو بھڑکاتے۔ تم لوگ کچھ کرو..... کوئی یونین بناؤ..... ایکشن کراؤ..... اپنے لیڈر سامنے لاؤ..... اس طرح اندھا دھند کام کرنے کے لئے تو زندگی نہیں بنی۔

مگر مجال ہے، جتنی دیر پرسپل صاحب رہے، کالج میں یونین نہیں بنی، ایکشن نہیں ہوئے اس لئے نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ فساد ہوا۔ مجبوراً سب کو پڑھنا پڑتا۔ میری مجبوری اور تھی۔

مجھے تو انہوں نے اپنی کتاب کے لئے باندھا ہوا تھا۔ پچیس روپے دے کر مجھے بھی اپنے ساتھ گڈے کے آگے جوت لیا تھا۔

ہمارے لئے علم کا طوفان تھا اور گرمی کا موسم! نہ کالج کی بلڈنگ تھی کوئی برابر نہ ہوسٹل کوئی سرکار تھا مگر پرسپل صاحب کی ترجیحات الگ تھیں۔ ہوسٹل میں بلا ناغہ چکر لگاتے۔

ہاں بھی، کھانا ملا؟ ٹھیک تھا؟ پڑھائی کی؟..... کوئی ایسی چیز تو نہیں جس کی سمجھ نہ آتی ہو؟

اب پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کے لیکچر سننے کے بعد کسی سنوڈنٹ میں اتنا حوصلہ تھوڑی رہ جاتا ہے کہ وہ مزید ہوسٹل میں بکھنے بیٹھ جائے۔

سب پرسپل صاحب سے پریشان تھے۔ شاف کا عملہ اور وجوہات سے دگھی تھا۔ آخر وہ لوگ بھی گھر بچوں والے تھے۔ ادھر کالج ایڈمنسٹریشن کے دفتر صبح کھلتے تو شام پانچ بجے تک نان سٹاپ کھلے رہتے۔

# ایمان

20۔ اے سال انڈسٹریل اسٹیمت، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



نے مرغیوں کے ڈربے پر تالا کیوں لگایا تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا اندر مرغیاں ہیں۔

مرغیوں کی ہی وجہ سے تو لگایا تھا۔ میں پتہ نہیں کیوں بول پڑا۔

انہوں نے پہیوں پر گھومتی اپنی کرسی کھائی، میری طرف پلٹ کے اپنی عینک کے اوپر سے میری آنکھوں سے گھور کے بولے۔

انہوں نے بھی گھردوں میں بند لوگوں کو مرغیوں کی طرح بند کر دیا تھا۔ پھر آگ لگادی تھی۔

کہاں؟ میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا چشمہ کھینچ کے ہاتھ سے اتارا اور چونک کے بولے، تو چوک پراگ داس کو نہیں جانتا؟

اس باران کی خشکیوں نظروں کو دیکھ کے میں دل ہی دل میں سکرایا، چلو، خود ہی بات اس چوک تک آگئی۔

سرا یہ چوک ہے کدھر؟

تجھے اتنا بھی پتہ نہیں؟ انہوں نے میز سے اپنے دونوں ہاتھ ہٹائے اور کندھے اپنے دونوں میرے دباتے ہاتھوں کے نیچے سے اس طرح ادھر ادھر ہلائے جیسے کہہ رہے ہوں، ہٹ جا، تجھے میرے کندھے دبانے کا کوئی حق نہیں، اتنا بے علم!

میں نے پہلے ہی اس چوک پر کافی سوچ رکھا تھا۔ بس اتنی سمجھ آتی تھی کہ نام سے اندازہ ہوتا ہے یہ پڑوسی ملک کا کوئی چوک ہے۔ اس وقت اسی خیال سے بول پڑا، سرا، میں تو یہاں پیدا ہوا ہوں، جن جن شہروں میں رہا ہوں، وہاں اس نام کا کوئی چوک نہیں سنا۔

انہوں نے شیشا کے اپنا چشمہ اتار کر میز کے چکنے شفاف شیشے پر ٹھک سے رکھا اور اونچی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگے،

تو جس مرضی شہر میں رہا ہوں، جہاں مرضی پیدا ہوا ہوں،

میں ان کے دفتر میں ان کی باتیں سنتا رہتا۔ انہیں کام کر سکتے دیکھتا رہتا۔

کبھی کبھار وہ کسی بہت بڑے گھیلے کی نشاندہی کرتے ہوئے کسی ظلم کی بات کرتے ہوئے اسے چوک پراگ داس سے تشبیہ دباتے تھے۔ کوئی بہت انہونی، نیز می چیز ہو جاتی تو کہتے، تم لوگوں نے پھر مجھے چوک میں لا کے کھڑا کر دیا..... چوک پراگ داس میں..... مجھے تو خیر کیا اس چوک کی سمجھ آئی تھی، جن سے وہ باتیں کرتے وہ بھی چوک پراگ داس کی حقیقت سے ناواقف تھے۔

بس دکھا دے کی فرماں برداری دکھانے کے لئے ہر کوئی چوک پراگ داس کا نام سن کے یوں سر ہلا دیتا جیسے وہ بھی اسی چوک کا رہنے والا ہو، کئی بات کی حقیقت جانتا ہو۔

مگر اس دن ڈربے میں بند مرغیوں کے چاروں طرف آگ دیکھ کے انہوں نے چوک پراگ داس، چوک پراگ داس کے اتنے نعرے لگائے کہ میں نے فیصلہ کر لیا، ان سے اس چوک کی حقیقت پوچھ کے رہنا ہے۔

یہ چوک ہے کہاں؟ وہاں ہوا کیا تھا؟

آخر یہ چوک پر نسل صاحب کے حافظے میں یوں کلب کے کیوں رہ گیا ہے؟

ایک دن ان کے دفتر میں موقع مل گیا۔ وہ میری کسی ڈائیا گرام کی ڈرائنگ دیکھ کے خوش ہوئے، میں ان کی کرسی کے پیچھے کھڑا ان کے کندھے دبار ہاتھ۔ وہ میز پر میری نئی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

مالی کے گھر آگ لگنے کے واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے میں نے بات چوک پراگ داس تک لانے کے لئے پلے پلے کی بات چھیڑی۔

یوں ہی میں گھر سے کو میں معاف نہیں کروں گا، اس



والوں کو دے دی تھی۔  
انہوں نے آگ لگا دی۔  
ڈیڑھ سو لوگ تھے اندر۔

پتہ نہیں کتنی عورتیں، لڑکیاں، بچے، بوڑھے، مرد،  
سب ان مرغیوں کی طرح پھڑ پھڑاتے ٹکریں مارتے مر  
گئے۔

پانچ بوریاں ان کی ہڈیوں کی میرے پاس پولیس  
اٹھا کے ہسپتال لائی تھی۔ بچپن جلی لاشوں کی شناخت نہیں  
ہو سکی تھی۔

تو اس چوک کو نہیں جانتا اور یہاں میرے پیچھے  
کھڑا ہے۔

انہوں نے پھر عینک اتار دی۔

ماتھے سے پسینہ پونچھا اور میری طرف کرسی گھما  
کے کہنے لگے۔

سارے محلے والوں نے مولوی یوسف سے کہا،  
مولوی صاحب، ادھر خطرہ ہے۔ ہندوؤں سکھوں نے  
ادھر حملے کا پلان بنا لیا ہے۔ آپ سب کو یہاں سے  
جانے دیں۔

لوگ لاریاں لے کر آ گئے۔

بہت سے لوگ گھروں سے نکل نکل کے لاریوں  
میں بیٹھ گئے، گھر در، سب بھرے اسی طرح چھوڑ دیئے۔  
ان کی جانیں بچ گئیں۔ یہ یوسف از گیا۔ کہنے لگا، ہم تو  
کانگریس کے حمایتی ہیں۔ ہمیں انہوں نے کیا کہنا ہے۔

لے دیکھ، اللہ کا نظام، سارے مر گئے، جل گئے،  
اس کے اپنے گھر کے سارے جی چڑھ کر اس کے  
سامنے دم توڑ گئے۔ یہ بچ گیا۔ جسم جلا، زخم آئے مگر جان  
بچ گئی۔ یہاں آنے تک برسوں سینے پر ہاتھ مار مار کے  
روتا تھا، ہائے، میں نے کیوں کانگریس کی حمایت کی تھی، نہ  
ان کا حمایتی ہوتا نہ ان پر بھروسہ کرتا۔

بھروسہ تو ان دنوں ان پر کسی کو نہیں تھا۔ بس یہ کچھ

اس ملک میں آنے والے تمام راستے، ساری سڑکیں، سبھی  
راہیں اس چوک سے ہو کر آتی ہیں..... تو چوک پر آگ  
داس کو نہیں جانتا!

انہوں نے پھر کرسی گھما کے میرا چہرہ دیکھا، اسی  
چوک کی تو سب نشانیاں ہیں یہاں، وہ پھر بولے۔ پھر  
ایک دم سے میز پر جھک کے سامنے پڑے کاغذوں کے  
پلندے سے ایک کورا کاغذ نکال کے سامنے سیدھا کیا، میز  
کے کونے پر پڑے اپنے چشمے کو اٹھا کے پسینے سے بھرے  
اپنے چہرے پر پھنسا یا اور کاغذ پر فری ہینڈ سے تیزی کے  
ساتھ قلم سے دو کراس قریب قریب بنا کے درمیان میں قلم  
کی نب ٹھونک ٹھونک کے بولے۔

یہ ہے، چوک پر آگ داس،

دیکھ ادھر!

میں ان کے دائیں کندھے کے اوپر سے گردن لمبی  
کر کے ان کے سامنے بچے کاغذ پر چار سڑکوں کے بیچ ان  
کے قلم کی نب سے بنے ایک نقطے کو دیکھنے لگا۔

انہوں نے پھر انہی ٹکیروں کے ایک طرف ایک  
دائرہ بنایا، بولے، یہ تھا چوک نشانیاں۔

پھر قلم گھما کے اس کے سامنے چوک سے پار قلم کو  
دائرہ میں گھماتے ہوئے بولے، ادھر تھی اونچی مسجد۔  
اونچی مسجد؟

میں ان کے دائیں کان کے قریب سے بولا۔  
انہوں نے جھنجھٹا کے سر بائیں طرف کیا اور بولے۔ ہاں،  
اسی مسجد کا مولوی بے وقوف تھا ہمارے مالی کی طرح۔  
ساری اسی کی بے وقوفی تھی۔ اس کی بے وقوفی میں معاف  
نہیں کر سکتا۔

اس نے کیا کیا تھا سر؟ اس بار میں نے ان کے کان  
سے ذرا سا ہٹ کے بات کی۔

اس نے مالی کی طرح سارے محلے کے لوگوں کو  
مسجد میں بند کر کے، دروازے کی چابی پرالی کے ڈھیر



ہوا مسلمان کا گھر ایک ننگی ہوئی سبے زبان بندھی بکری کا جسم اور نیچے گندی تالیوں میں بکھرا ہوا جلا گھر کا سامان، انہی کوزے کرکٹ کی طرح بکھری بکھری ہوئی چیزوں سے بڑے نظامی کو قرآن پاک گرا پڑا نظر آیا تھا۔ حید نظامی اسے اٹھا کے وہیں گلی میں لیٹ گئے، روتے روتے منہ سجالیا، پتہ نہیں کیسے لوگ انہیں سمجھا بجھا کے لاہور واپس لے آئے۔

ان کی تو وہاں سے ہٹنے کی کوئی حالت نہ تھی۔  
لوگوں نے بھی بہت سمجھایا مولوی یوسف کو مگر وہ اڑ گیا۔

لاہریاں چلی گئیں۔  
رات کو اس کے اہنسا واسے یار آ گئے۔ پہلے چالاکی سے بولے، مولوی جی، ہمیں ہمارے ساتھی ڈانٹ رہے ہیں کہ تم لوگ چوک پراگ داس والوں کو بچارہ ہو، کہتے ہیں وہ کہ ادھر مسلمانوں نے اپنے ساتھ اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔۔۔۔۔ ہے یہ کوئی یقین کرنے والی بات، مگر ہماری وہ سنتے نہیں، یہ آدمی ددان کے ہیں، آپ انہیں ہمارے ساتھ چل کر سارے گھر، مسجد کے کونے کھد رے دکھا دیں، ان کا منہ بند کریں۔

لے مولوی اس چکر میں آ گیا۔

اپنا مولوی اس چکر میں آ گیا۔

اپنے لوگوں کو تو وہ پہلے اندر بند کر چکا تھا۔

اب یہ دشمنوں کو چابیاں دینے والی بات تھی۔

دے دی چابیاں، تلاشی دلا دی۔

انہوں نے نسلی سے اندر کا سارا نقشہ دیکھ لیا،

کدھر کدھر کھڑکی ہے،

کدھر کدھر دروازہ ہے،

کہاں کتنے مرد ہیں،

کدھر کدھر عورتیں چھپی ہیں۔

بس وہ گئے۔

لوگ تھے، کچھ احرار سیے کچھ یونٹس اور کچھ مولوی۔ ان سے اللہ نے وزن چھین لیا تھا۔۔۔۔۔ اب تک چھینا ہوا ہے۔  
نہی لوگ اڑ گئے۔

پتہ نہیں کیوں اڑ جاتے ہیں یہ لوگ بات بات پر۔  
پرنسپل صاحب تو لیے سے اپنا سر رگڑتے ہوئے بولے،  
لوگوں نے بہتری منتیں کیں، ان سے کہا سرکار، ساتھ کا منڈہ دیکھو۔ کٹڑہ جمل سنگھ میں مسلمانوں کا ایک گھر بھی سالم نہیں بچا۔ سارے انہوں نے جلا دیئے۔

کچھ تو مولوی یوسف کو لے کر شہا بے قالدے کی دکان سے ملحق گھر دکھانے بھی لے گئے، یہ دیکھ کر مولوی، سارا گھر جلا ہوا تھا، گھر کے اندر جلی لاشوں کی بدبو بھری تھی اور چوبارے کی دیوار سے ایک زنجیر سے نیچے سڑک پر ایک جلی ہوئی بکری کا بدن لٹک رہا تھا۔ وہ بے چاری سبے زبان بکری اندر کہیں بندھی ہوگی، آگ لگی تو ادھر ادھر جان بچانے کو تڑپتی بھاگی ہوگی۔ اسی تڑپ میں جلے بدن کے ساتھ بکری نے کہیں دیوار کے اوپر سے چھلانگ لگائی۔ زنجیر چھوٹی تھی، سڑک پر گرنے سے پہلے، سڑک سے اوپر ہی جھوٹتی ہوئی چل کے مر گئی۔

مولوی یوسف نے جلی بکری زنجیر سے بندھی دیکھ لی، پھر بھی نیچے اس چوبارے کی دیوار پر کانگرس کے کسی اشتہار پر مہاتما گاندھی کی تصویر پر انگلی رکھ کے بولا، یہ دیکھیں یہ اندھا کی بات کرتے ہیں،

عدم تشدد کا درس دیتے ہیں۔

بھی تو سوچنے کی بات ہے، یوسف جی!

بہتر ہے اس وقت سوچنے والے تھے!

دور دور سے لوگ آ آ کر وہ نقشہ دیکھ کے گئے۔

یہ دیکھ،

انہوں نے میز پر پڑے ایک اخبار پر ہاتھ مارا،

یہ اخبار والا بھی ادھر گیا تھا۔

وہ بچے چارہ تو پھوٹ کے رو پڑا تھا۔ ایک اوپر جلا



گھروں سے بچی ہوئی عورتوں کو وہ پکڑ کے لے گئے۔  
 قریب ہی، ادھر دیکھ، انہوں نے کاغذ پر ایک بڑا  
 سا بیضوی نشان بنایا۔

ادھر،

زیادہ فاصلہ نہیں تھا،  
 یہاں تھا جلیا نوالہ باغ  
 اور یہ تھی ان کی سرائے گردرام داس۔  
 یہاں یہ دیکھ!

انہوں نے کاغذ پر قلم کی نب قلم اٹھا اٹھا کئے، بری  
 اور پھر اسی کاغذ کو ہاتھ سے چمڑ کر کے اور منھی میں لے  
 کر اس طرح پیسنے سے بھینچ لیا جیسے اس دن ہوٹل کے  
 بچھواڑے میں مانی کے گھر چلی ہوئی تو پتی پھولے ہوئے  
 پروں والی سہمی مرغیوں کو، انہوں نے اٹھا کئے سینے سے لگا  
 لیا تھا۔ پھر اسی کاغذ کے بل پھر سے کھولتے ہوئے، قلم کی  
 نب کے نشان پر انگلی رکھ کے ہوئے، یہاں لے گئے، وہ  
 ان سب عورتوں کو!

اس سرائے گردرام داس میں، اور اسی رات صبح  
 ہونے سے پہلے انہوں نے ان تمام عورتوں کے سارے  
 کپڑے اتار کے باہر زبردست کر کے چلی ہوئی ٹوٹے  
 پروں والی مرغیوں کا غول بنا کے ان کا جلوس نکالا تھا۔  
 ٹوٹے اس جلوس میں شامل اپنی بہنوں کی بھی چٹخیں  
 نہیں تھیں۔

ان کی آوازیں بھی نہیں سنائی دیں۔  
 پرنسپل پروفیسر طوسی صاحب نے زور زور سے اسپنڈ  
 مر پر تویہ رٹا اور مجھے عجیب سے دکھ کی انتہائی شدت کے  
 ساتھ اپنی ٹینک کے اوپر سے جھانک کے دیکھتے ہوئے  
 بولے،

یہ آوازیں تو تیرے کانوں میں پہنچی چاہئیں۔

اس ترسہ یہاں سے اتنی دور تو نہیں!

رات گہری ہوئی تو وہ جو تلاشی لینے آئے تھے وہ  
 حملہ آوروں کا ہراول دستہ تھے۔

ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تیل اور پٹرول  
 کے کنستریں تھیں۔

ایک ہجوم آگیا۔

اوپر مسجد کا گھیرا ڈال لیا۔

ہجوم میں بندوقیں بھی تھیں۔ سب پوری تیاری سے  
 آئے تھے۔ نیزیے، لٹم، گلہاڑیاں، چھریاں، ٹانھیاں  
 سب ان کے پاس تھیں۔

انہوں نے ایک ایک کر کے پہلے سارے باہر نکلنے  
 کے راستے بند کئے، پھر چاروں طرف تیل چھڑک دیا،  
 مسجد کے اندر پٹرول کی بھری بوتھیں پھینکیں اور پھر ہر جگہ  
 مارجس دکھادی۔

سب جل گیا۔

میں میں گھر دوران بے گناہ لوگوں کی چٹخیں سنائی  
 دیتی تھیں۔

ٹوٹے نہیں سنی وہ چٹخیں!

وہ پھر مجھے ٹینک کے اوپر سے گھورنے لگے۔  
 سر، میں تو پاکستان بننے کے آٹھ دس سال بعد پیدا  
 ہوا ہوں، مجھے تو...

ٹوٹے آٹھ دس سال بعد کی بات کرتا ہے، ایسی چٹخیں تو  
 آٹھ دس صدیاں تک ہوا میں موجود رہتی ہیں۔ ٹوٹے اور  
 تیری نسل کے لوگوں نے کان بند کئے ہوئے ہیں۔  
 میں شرمندہ ہو کے سر کھجانے لگا۔

وہ پھر میری طرف بٹنے، بولے، ادھر دیکھ۔ انہوں  
 نے پھر میز پر پڑے کاغذ پر چٹخی ہوئی لکیروں کے چوک  
 کے ارد گرد دائرے لگائے اور کہنے لگے، ادھر ادھر سے،  
 ان سارے گھروں میں موجود جوان، بوڑھے، بچوں کو  
 انہوں نے ایک ایک کر کے مار دیا اور ان سارے گھروں  
 کی دیواروں کے پھر ایک اور دائرہ لگایا۔ سب





جس ہستی سے میں نے محبت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ  
دنیا کی ہر چیز اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے اگر میں اس کے  
اوصاف حمیدہ گنونا چاہوں تو اعشاری نظام جواب دے جائے۔

☆ خادم حسین مجاہد

آہنگ محسوسات کو محبت کہتے ہیں یہ دل میں موجود ایک  
روشنی ہے۔ وہ پھول ہے جو ارضی بہار کا محتاج نہیں۔  
برٹنڈرسل کے بقول محبت انسان کے اندر ایک شریف  
جذبے کا نام ہے جسے اگر نکال دیا جائے تو انسان اور  
حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ بیلوئے فٹس کا کہنا  
ہے کہ شیریں ترین لطف اور تلخ ترین غم کا نام محبت ہے۔  
ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے کہ محبت مکڑی کا جالا ہے جو جسم  
سے ایک بار لپٹ جائے تو چھانے کے باوجود تھوڑا بہت  
چپکا رہ جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی رائے میں محبت دنیا کا  
قدیم ترین خطرناک اور لاعلاج مرض ہے اور مزے کی  
بات یہ ہے کہ یہ واحد مرض ہے جو مریض کو بے حد پسند  
ہوتا ہے اور وہ اس کا علاج کرانا بھی پسند نہیں کرتا۔

ہم سانس لینے کے لئے رُکے تو نوٹ کیا کہ  
دوست ہمدن گوش نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لہذا ہم  
نے سر ہلاتے ہوئے دوبارہ سلام لیا۔

ایک مہربان اکثر ہمارے داخلی معاملات  
میں ٹانگ اڑاتے رہتے تھے۔ طریقہ  
واردات کچھ یوں تھا کہ خارجی مسائل پر بات کرتے  
کرتے اچانک داخلی مسائل میں داخل ہو جاتے اور جب  
باہر نکلتے تو ہمارے کچھ راز ان کے ہاتھ میں ہوتے جو وہ  
تمام حلقہ احباب میں فوری طور پر نشر کر دیتے۔ ہم بڑے  
دنوں سے انہیں سبق سکھانے کے بارے میں سوچ رہے  
تھے کہ ایک دن ہماری مراد برآ کی وہ تشریف لائے اور  
معصوم بچوں کی طرح پوچھنے لگے۔ ”یار! یہ تو بتاؤ کہ محبت  
کیا ہے؟“

ہمارا ماتھا فوراً ٹھنکا کہ اس نامعقول دور میں جب  
کہ بچہ بچہ اس موضوع پر ماسٹر ہے یہ پوچھ رہے ہیں کہ  
محبت کیا ہے۔ موضوع میرا من پسند بھی تھا اور اگلی کھلی  
کسر نکالنے کا موقع لہذا ہم فوراً شروع ہو گئے۔

مطابق محبت اور محبوب کے ہم



نہر بے کراں ہے۔ اس کی لذتوں سے فیض یاب ہونے والے زبان اور لہجوں کے پابند نہیں ہوتے۔ زندگی کے پُر شور سمندر میں ناچتی لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر منفی اور مثبت کی جھٹ پوری کر دیتی ہیں آنکھیں آنکھوں کو پیغام دیتی ہیں اور دل کے راستے سفر کرتی یہ موجیں جسم کے انگ انگ میں پھیل جاتی ہیں تب انبساط کی ایسی جل ترنگ من میں بچ اٹھتی ہے کہ روح اس کی گنگناہٹ سے وجد میں آ کر رقص کناں ہو جاتی ہے بھریت کا ادراک تبھی ہوتا ہے۔

”میں سمجھ گیا۔“ آخر میرے کرم فرما کا پیمانہ مہر لہریز ہو گیا۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ محبت آخر ہوتی کیسے ہے؟ کیا اسے جڑ سے ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں؟“

”محبت ایک غیر اختیاری جذبہ ہے اور یہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن کچھ جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں محبت کے پودے کا پھوٹنا کافی

ٹھاروں کے خیال میں محبت شریعت ہے، ریشم ہے، خیابان، ہے، ابال ہے، لوری ہے، پھکی ہے، کھلی آنکھوں کی نیند ہے، نشہ ہنگامہ اور طنطنہ ہے۔ یہ بڑی شری، بڑی نازک اور بڑی حاسد ہوتی ہے تنہائی مانگتی ہے، ورد آنسو اور رسوائیاں دیا کرتی ہے۔ ایک ہوزری واسلے سنے کیا خوب تعریف کی ہے کہ محبت بغیر آستین کی ایسی بنیان ہے جس میں سراسر اکثر بازوؤں والی جگہ جاگھٹا اور یہ بھی من لومیری جان کہ محبت وہ چیز ہے جس کے سامنے سارے علوم فصاحتیں، مذہب اور فلسفہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ ایک لافانی جذبہ ہے۔“

ہم نے دوست کی طرف دیکھا وہ یوں سر ہلار ہے تھے جیسے دل پر لکھ رہے ہوں۔ ہم نے سلسلہ کلام پھر جوڑا۔

کیپٹن اشفاق حسین کہتے ہیں کہ محبت گرامر کی کسی کتاب کا نام نہیں ہے، یہ ردیف قافیے کی قیود سے آزاد

RTM NO 373738

**ایکسپریس** (جسٹ)

• واشنگ مشین • ڈرائیو • رووم انرگولر • گیزر • پیلاسٹک فرنیچر

ہر دل چاہے

7110415

SCANNED BY AMIR

055-3857636: فون: کلائمکس آباد جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

ISO 9001

LOADING Section



”کیا آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“  
انہوں نے ایک دم عادت کے مطابق ہماری پرائیویسی (Privacy) میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔

”ہاں“ ہم نے دوست کی بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔ ”اور جس ہستی سے میں نے محبت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے اگر میں اس کے اوصاف حمیدہ گنونا چاہوں تو اعشاری نظام جواب دے جائے۔“

”کیا واقعی؟“ دوست نے مصنوعی حیرت سے کہا اور پھر مزید پیش قدمی کی کوشش کی۔ ”اچھا تو آپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں؟“

”ابھی تک کوئی ایسا سکیل نہیں بنا جس پر ہماری محبت کی پیمائش کی جاسکے۔ ریاضی تو تم پڑھتے ہی ہو یوں سمجھ لو کہ زیرو سے انفینٹی (Infinity) تک۔“ ہم نے جواب دیا۔

”بھئی، وہ کون سی خوش نصیب ہستی ہے جسے آپ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اس کی پیمائش کمپیوٹر بھی نہیں کر سکتا۔“ دوست نے کھنکھانے لگاتے ہوئے بالآخر ہم سے وہ سوال پوچھ ہی لیا کہ جس کی خاطر انہوں نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا اور اتنی دیر سے ہمارے بڑے مغز خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔

”میری محبوب ہستی..... ماں ہے۔“ ہم نے رک رک پر جملہ پورا کیا، بالفاظ دیگر ان کے خیالات اور تصورات پر بجلی گرائی۔

اس کے بعد ان کی کیا حالت ہوئی اور انہوں نے دل ہی دل میں ہمیں کتنی گالیاں دیں، یہ تو ہمیں معلوم لیکن پھر کبھی انہوں نے ہمارے داخلی تو کیا خارجی معاملات میں بھی مداخلت نہیں کی۔

❦

مشکل ہوتا ہے جیسے سخت پتھر ملی زمین جس پر سبب چھٹی کی زہریلی دوا چھڑکی جا چکی ہے۔ ہم نے کچھ دیر توقف کر کے سوال کے دوسرے حصے پر غور کیا اور پھر گویا ہوئے۔

”محبت کے پودے کو تم جڑ سے اکھیڑنا چاہو تو یہ تقریباً ناممکن ہے البتہ معروضیات کے کھرپے یا دوری کی درانتی سے اس حد تک اور اتنی صفائی سے ضرور کاٹا جاسکتا ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے سے کچھ نظر نہ آئے لیکن تنہائی کی خوردبین سے دیکھنے پر اس کی جڑیں ضرور نظر آئیں گی اور جوں ہی قربت کی کمی میسر آئی یہ پھوٹ پڑیں گی بشرطیکہ بے حسی کی زہریلی دوا اپنا کام نہ کر چکی ہو۔“

”عام طور پر کیسی محبتیں دیکھنے کو ملتی ہیں؟“ دوست نے غیر محسوس طریقے سے بات کو موڑنے کی کوشش کی۔

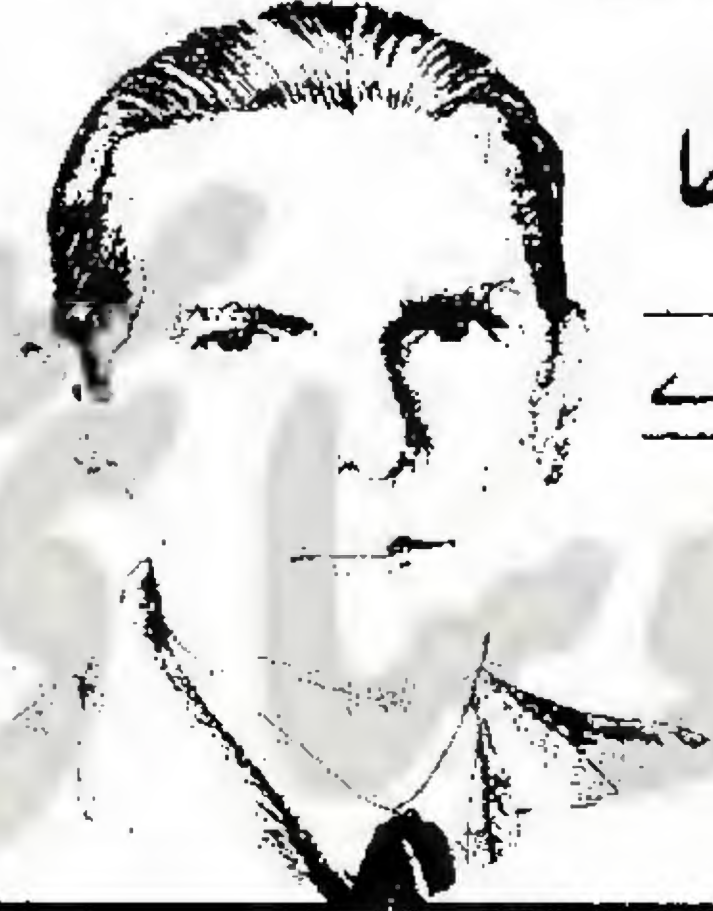
”کیٹین اشفاق حسین نے محبت کی کئی اقسام پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں محبتیں جیسی بھی ہوں رنگ لانی ہیں۔ کچھ محبتیں تو وہ ہوتی ہیں جن کا اظہار بھی نہیں ہو پاتا آدمی اندر ہی اندر دھیمی آگ پر رکھے دودھ کی طرح اونٹنا رہتا ہے اور وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی خودی کا لعاب اپنے گرد لپیٹتا رہتا ہے کسی سے کچھ کہتا نہ سنتا ہے۔ لپکتے شعلوں کی طرح کہ ان میں جتنا ہونے والے خود بھی جلتے ہیں اور تزیب رہنے والے بھی تپش محسوس کرتے ہیں اور کچھ اظہار کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ کچھ محبتوں میں ندی کی لہروں کی سی روانی ہوتی ہے اور کچھ میں میدانی دریاؤں کی سی طغیانی، کچھ نوئے والے تاروں کی طرح ہوتی ہیں آٹا فانا چمک کر فنا ہو جانے والی محبتیں اور کچھ قطبی ستاروں کی سی پائیدار مستقل راہ دکھانے والی محبتیں۔ کچھ محبتیں آبشاروں کی طرح ہوتی ہیں کہ جب ٹھنڈا رہتی ہیں تو شور مچاتی دندناتی ہوئی اور کچھ پر بتوں کے دامن سے پھوٹنے والے جھرنوں کی طرح ٹھنڈی میٹھی شفاف محبتیں۔“ ہم نے جنٹل مین الحمد للہ کے دو

www.paksociety.com

Section



میں آج تک اپنے قاعدہ سے پر قائد اعظم کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوں اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور ایک عظیم اعزاز سمجھتا ہوں۔



## میں نے پاکستان بننے دیکھا

جناب کے بچو گڑے اور پاکستان کے شتو گڑے

کچھ یادیں کچھ باتیں

☆ میاں محمد ابراہیم طاہر

آزادی سے ایک سال پہلے مجھے اپنے سکول کے ایک مسلمان استاد کی زبانی معلوم ہوا کہ بابا جناح (ان دنوں قائد اعظم کو زیادہ تر مسلمان بابا جناح کے نام سے یاد کیا کرتے تھے) جالندھر تشریف لارہے ہیں گھر آ کر میں نے اپنے والد صاحب سے مندرجہ شروع کر دی کہ میں بابا جناح کو دیکھنے کے لئے جالندھر جانا چاہتا ہوں۔ والدہ مرحومہ نے میرے شوق جناح کے دیدار کو دیکھ کر والد محترم کو آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے بابا جناح کی ایک جھلک دکھانے کے لئے جالندھر لے جائیں۔

حضرت قائد اعظم کی جالندھر آمد سے ایک روز پہلے والد صاحب اور میں جالندھر پہنچ گئے اور رات اپنی پھوپھی جو جالندھر کے محلہ عالی میں بیانی ہوئی تھیں، کے گھر گزاری صبح ٹرین کی آمد سے پہلے ہم جالندھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ میں نے سبز قمیص اور سفید نیکر پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں سبز بلالی پرچم تھام رکھا تھا۔ جوں جوں

پاکستان کے وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ قیام میں کچھ تھلہ کے جلو خانہ سکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرا چھوٹا بھائی محمد اسماعیل اور ایک ماموں زاد کزن بھی میرے ہم جماعت تھے۔ ہم نے آٹھ دس لڑکوں پر مشتمل ایک ”بچہ مسلم لیگ“ بنا رکھی تھی، میں اس گروپ کا سرخ تھا۔ ہم نے محلے کے ایک مسلمان درزی کی مدد سے پاکستان کا جھنڈا بنوا لیا۔ سکول سے چھٹی کے بعد سب لڑکے اکٹھے ہو کر پاکستان کے حق میں جلوس نکالتے۔ ”لے کر رہیں گے پاکستان“ اور ”بن کے رہے گا پاکستان“ کے نعرے لگاتے۔ ہمارے گروپ نے پاکستان کیپ رچم کی ہمرنگ قمیصیں اور سفید نیکریں بھی سلوائی تھیں۔ ہمارا گروپ اپنے اس ”پاکستانی لباس“ کی وجہ سے پورے سکول میں نمایاں اور منفرد تھا۔ ہمارا ریاضی کا ایک ہندو ٹیچر کرم چند تو باقاعدہ ہمیں ”جناح کے بچو گڑے“ اور پاکستان کے شتو گڑے کے القابات سے نوازا رہتا۔



ٹرین کی آمد کا وقت قریب آتا گیا شیشین پر مسلمانوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا اور قائد اعظم زندہ باد پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اسٹن میں ٹرین شیشین پر آ کر رکی والد صاحب نے مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ حسن اتفاق دیکھیں قائد اعظم کا ڈیڑھ عین ہمارے سامنے آ کر رکا جو نئی قائد اعظم ڈبے کے دروازے پر تشریف لائے استقبالی ہجوم نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ حضرت قائد اعظم نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے ہاتھ بلند کر کے ہجوم کے نعروں کا جواب دیا پھر چند لمحوں بعد ہجوم کو خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ فرمایا۔ ان کا اشارہ پاتے ہی عوام کے ٹھانڈے مارتے ہوئے ہجوم پر ایک دم سکوت طاری ہو گیا مگر میں اپنے والد صاحب کے کاندھوں پر سوار پر جوش انداز سے نعرے بازی میں مصروف رہا۔ اسی دوران حضرت قائد اعظم کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے والد کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ہجوم نے والد صاحب کو دروازے تک پہنچنے کے لئے راستہ دے دیا جیسے اسی میرے والد صاحب دروازے کے قریب پہنچے قائد اعظم نے ہاتھ برا کر تبسم فرماتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھپایا اور انگریزی میں میرے پاکستانی سہز بلالی پر چمک والے لباس کی تعریف کی۔ میں آج تک اپنے کاندھے پر قائد اعظم کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوں اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور ایک عظیم اعزاز سمجھتا ہوں۔

پھر قیام پاکستان کے اعلان کا مرحلہ آتا ہے ماہ اگست کے آخر میں ریاستی سکھ حکومت کی طرف سے کپورتھلہ کی ایک مسلم آبادی والی تحصیل سلطان پور اور گرد و نواح کے دیہات میں اعلان کیا گیا کہ ایک بہت بڑا قافلہ ہندو ملٹری کی حفاظت میں پاکستان جائے گا۔ اس لئے تمام مسلمان پاکستان جانے کے لئے قافلے میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ کئی ہزار سادہ لوح مسلمان اپنے ماں و باپ کے ساتھ قافلے میں شامل ہو گئے۔ جب یہ قافلہ

کپورتھلہ کے نواح سے گزر رہا تھا تو ہزاروں سکھوں نے اس پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ قافلے سے جانیں بچا کر شہر کپورتھلہ کی طرف بھاگنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کی حفاظت پر ماسور ریاستی ملٹری نے انہیں بھون ڈالا۔ تمام دن قتل و غارتگری کا بازار گرم رہا کپورتھلہ کے مسلمان اپنے مکانات کی چھتوں پر کھڑے بے بسی اور بیچاریگی سے اپنے مسلمان بھائی بہنوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر ان کی کوئی مدد اس لئے نہ کر سکے کہ قافلے کی حفاظت پر ماسور ٹینک اپنی مشین گنوں سے شہر کی طرف مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔

قافلے کے قتل عام کے بعد ریاستی انتظامیہ نے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتل عام کے لئے ایک اور سکیم تیار کی شہر میں اعلان کیا گیا کہ ایک کیمپل ٹرین مسلمانوں کو سولہ ٹرینوں کی حفاظت میں پاکستان جائے گی۔ شہر کے بیشتر مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی یہ ایک گھناؤنی سازش تھی جس کے بارے میں شہر کے مسلمانوں کو بروقت خبر ہو گئی۔ اس کے باوجود بہت سے گھرانے خصوصاً وہ سادہ لوح مسلمان جو گرد و نواح کے دیہات سے آ کر شہر میں پناہ گزین تھے اس ٹرین میں بغیر ٹکٹ کے 82 چھڑوں پر مشتمل تھی اسوار ہو گئے۔ یہ ٹرین 9 ستمبر کو شہر اور ریاست کی حدود سے باہر جا کر تھانہ گدی گئی۔ آج ہمارے حکمران ہمارے ہندو اور سکھوں سے پیار و محبت کی چٹائیں بٹھار رہے ہیں اور وزیر اعظم نواز شریف متعصب ہندو وزیر اعظم فریندر مودی کو آموں کا تھنہ بھیج رہے ہیں انہیں جن لوگوں سے اس قوم کی درندگی، وحشت اور بربریت کے مظاہرے کو 1947ء میں دیکھا ہے، وہ کسی صورت ان پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ ہندو کبھی بھی مسلمان کا متر نہیں ہو سکتا۔





تاریخی ناول

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

## مغلیہ میگزین

رفیق ڈوگر قسط: 12



SCANNED BY AMR

READING





## شہنشاہ کی برہنہ لاش

جموں کے راجا رنجیت دیو نے شہر سے پانچ میل باہر نکل کر مغلانی بیگم کا استقبال کیا۔ بیگم کی سواری پر نظر پڑتے ہی راجا اپنی سواری سے اتر آیا۔ ان کے امراء، وزراء اور درباری بھی پیدل چلتے ہوئے بیگم کی سواری تک پہنچے اور انہیں سلام کیا اور پھر ان کی اجازت سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور بڑی شان سے بیگم کو شہر میں لائے۔ بیگم کے قافلہ میں دو صد سے زائد خدام اور ملازمین قدیم تھے۔ قافلہ جموں شہر میں داخل ہوا تو لوگ بیگم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ جلوں ایک شاندار حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ بیگم کی آمد کی اطلاع ملنے پر راجا نے ان کے قیام کے لئے یہ حویلی خالی کر دی اور ان کے مستقل قیام کے لئے ان کے شایان شان ایک نئی حویلی کی تعمیر شروع کرادی تھی۔ تعمیر کی نگرانی کو تو ال شہر خود کر رہے تھے۔ راجا رنجیت دیو کچھ دیر کے لئے بیگم کے حضور حاضر رہے، اپنے حکام اور خدام کو بیگم کی مہمان نوازی کے لئے احکامات جاری کئے اور ان کے ملازمین کے وظیفے مقرر کر کے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو بیگم نے انہیں تین بیش قیمت ہیرے اور خلعت عطا کر کے رخصت کیا۔

راجا ہفتہ میں دو بار بیگم کے حضور حاضری دیتے تھے۔ جب نئی حویلی تعمیر ہو گئی تو بیگم اور ان کے وابستگان کو وہاں منتقل کر دیا اور ان کے اخراجات کے لئے ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنے کی اجازت چاہی۔ بیگم نے راجا سے مستقل وظیفہ قبول کرنے سے معذرت کر دی، اپنی رعایا کے راجا سے وظیفہ قبول کرنا وہ اپنے مرتبہ اور شان کے منافی سمجھتی تھیں۔ راجا رنجیت دیو ان کے خاندان اور ان کی صوبیداری کے وقت ان کی ماتحت

ہوتا تھا اس لئے ان کی رعایا تھا۔

آدینہ بیگ نے جس حکمرانی کے لئے عمر بھر جدوجہد کی تھی اس پر وہ صرف پانچ ماہ فائز رہ سکا اور چند روز بیمار رہ کر بٹالہ میں انتقال کر گیا۔ ان پانچ ماہ میں اس نے سکھوں کی شورش دبانے میں جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، دربار شہنشاہیت سے ان کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ظفر جنگ کا خطاب عطا کیا گیا تھا اور انہیں مغل شہنشاہ کے ماتحت ایک خود مختار حکمران تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی اچانک موت پر مسلمانان پنجاب نے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور سکھوں نے خوشیاں منا لیں۔ آدینہ بیگ نے جنگوں اور پہاڑوں میں سکھوں کا تعاقب کر کے انہیں تہ تیغ کرنا شروع کر دیا تھا۔

آدینہ بیگ کی اچانک موت پر مغلانی بیگم نے خوشی محسوس کی تھی لیکن چند روز کے بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بٹالہ میں بھی نہیں رہ سکے گی۔ پنجاب کا حکمران اب خواجہ مرزا خان تھا اور وہ انہیں اپنی حکمرانی کی حدود میں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ شاہجہان آباد میں ان کے داماد عماد الملک خود مختار وزیراعظم تھے مگر دربار اور شہر کے امراء بیگم کے شدید مخالف تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت اس نے ان امراء پر جو سختیاں کروائی تھیں وہ خود اسے بھی یاد تھیں۔ اسے یقین تھا کہ احمد شاہ ابدالی ایک بار پھر ہندوستان آئے گا اور خواجہ مرزا خان کے علاوہ عماد الملک کو بھی اس کے غضب کا نشانہ بننا ہوگا اس لئے وہ کسی ایسے حکمران کے ہاں قیام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے ابدالی ناراض ہو۔ ان سارے پہلوؤں پر غور کر کے اس نے بٹالہ سے جموں منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے دوا بہ اور جموں کشمیر عطا ہونے کے بعد بیگم نے جموں کی حکمرانی کے لئے اسی رنجیت دیو کو سند حکمرانی ارسال کی تھی اور اب بھی اسے



اپنی رعایا سمجھتی تھی۔

شاہجہان آباد سرہند اور لاہور کے حکمرانوں کے معتب اور مفرد مغل اور ترک امراء اور شرفاء کی بہت بڑی تعداد جنوں میں پناہ گزین تھی اور وہاں ان کی ایک الگ بستی مغلوں کے نام سے آباد ہو چکی تھی۔ بیگم ادران کے خاندان کی رعایا کے یہ پناہ گزین امراء ان کی ڈیوڑھی پر حاضری کے لئے آنے لگے۔ راجا رنجیت دیو کی مانند وہ بھی بیگم پر احمد شاہ ابدالی کی عنایات سے واقف تھے اور بیگم کے وسیلہ سے احمد شاہ ابدالی کی فوج اور دربار میں کوئی ملازمت اور مقام حاصل کرنے کی خواہشات پالنے لیتے تھے۔ رنجیت دیو بھی بیگم کی فطرت اور صلاحیتوں سے آگاہ تھا، اسے خوف تھا کہ بیگم احمد شاہ ابدالی سے اس کی شکایت نہ کر دے اس لئے وہ سارے ہی بیگم کو خوش کرنے اور اس سے بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

بیگم نے بھی ان کے ساتھ حاکمانہ سلوک جاری رکھا جو بھی کوئی نذرانہ پیش کرتا وہ اسے تحائف اور انعامات عطا کر کے رخصت کرتی۔ اس طرح جلد ہی ان کی دولت اور سخاوت کے چرچے پہاڑی ریاستوں سے ہوتے ہوئے سری نگر تک پہنچ گئے۔

چیت کا مہینہ شروع ہو چکا تھا لیکن شمال میں حالہ کی چوٹیوں پر ابھی تک برف قابض تھی۔ جس رات باؤ شمال چلتی دن سرد ہو جاتا اور بیگم کے لئے سردی ناقابل برداشت ہو جاتی۔ ایسی ہی ایک سرد صبح دو ایک بجی کے ساہنے بیٹھی دیوان حافظ کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ وقار بیگم نے حاضری کی اجازت طلب کی، بیگم نے نگاہ اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ اس کے چہرے پر جم گئی، اس کے پھول سے چہرے سے تازگی کی بہار رخصت ہوئی دکھائی دی۔ مغلاں بیگم کے اندر ماں جاگ اٹھی ان کے کپڑے ہو کر بیٹی کو سینے سے لگا کر

پیشانی پر بوسہ دیا اور پاس بٹھا لیا۔ وہ خاموش تھی۔ ”جان مادر! آپ کے چہرے پر موسم کی تبدیلی کا آثار نہ پا کر ہمیں خوشی نہیں ہوئی۔“ بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”مادر مکرم! حضور کی خوشی ہماری زندگی ہے، ہمیں افسوس ہے کہ باؤ شمال کا اثر ہم چھپا نہ سکے۔“ وقار بیگم نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”باؤ شمال اور اس کے اثرات سب عارضی ہیں، بہت جلد کشمیر کا حسن نکھر آئے گا اور آپ خوش ہو جائیں گی۔“ بیگم بیٹی کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

”مادر محترم! گستاخی کی معافی ہو تو کچھ عرض کریں؟“ بیٹی نے پوچھا۔

”ہم تو زندہ ہی آپ کے احکامات سننے کے لئے رہ رہے ہیں۔ فرمائیں، ہماری سماعت بے تاب ہے؟“ اس نے بیٹی کا سر گود میں لے لیا۔

”ہمیں کشمیر ہرگز پسند نہیں۔“ وقار بیگم نے اٹھ بیٹھی میں اٹھتے شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے بہشت بردارے زمین دیکھے بغیر ہی مسترد کر دی۔ یہاں تو اس کی صرف ہوا آتی ہے، کشمیر تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ان سفید سر چوٹیوں کے دوسری طرف جہاں زعفران کے پھول آپ کے قدم چومنے کے لئے بے تاب ہیں۔“ بیگم نے اسے خوش کرنے کو کہا۔

”ہم اپنے میں پھولوں کو روندنے کی خاطر پتھروں سے پاؤں زخمی کرنے کا حوصلہ نہیں پاتے۔“ وقار بیگم نے جواب دیا۔

”ہم اپنے پاؤں پتھروں سے زخمی کریں گے تاکہ آپ پھولوں پر چل سکیں۔“ بیگم بیٹی کے جواب پر حیران سی رہ گئی۔

”ہم یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ حضور حضور



”ہم نے حسن ماندہ کے وکیل کی درخواست بھی مسترد نہیں کی۔“

”ہم سنتے ہیں طہماس خان حضور سے یہ درخواست قبول کر لینے کی استدعا کر چکا ہے۔“

”آپ نے درست سنا۔“ بیگم نے جواب دیا۔

”طہماس خان لالچی اور خود غرض خادم ہے، اس کی بات اور درخواست پر سوچ کر فیصلہ کرنا لازم ہے۔“

”دختر عزیز! اس کی بات سننا لازم ہے، باہر گئے

حالات اور رابطہ کے ذرائع محدود ہو چکے ہیں۔“ بیگم نے

اپنی مجبوری بیان کی۔

”ہم سنتے ہیں کوتوال شہر سے اس کے مراسم بڑھ

رہے ہیں، ہو سکتا رنجیت دیو حضور کو جموں سے کہیں اور

بھینچنے کے لئے اس کو استعمال کر رہا ہو۔“ وقار بیگم نے

خدا شدہ ظاہر کیا۔

”جموں سے کہیں اور جانے کا فیصلہ ہمیں خود کرنا

ہے، کسی کی سازش ہمیں اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔“

بیگم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

جموں کے راجا رنجیت دیو نے بیگم کے گرد مخبروں کا

جال پھیلا دیا تھا مگر احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے امکان

کے پیش نظر وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا جس

سے احمد شاہ ابدالی ناراض ہوں۔ سری نگر کے حاکم سکھ

جیون رام کو خوف تھا کہ بیگم کشمیر پر حکمرانی کا دعویٰ نہ کر

دیں۔ اس نے بیگم کے پاس ایک وفد بھیجا تھا اور تحائف

اور لگان کا وعدہ کر کے درخواست کی تھی کہ بیگم سری نگر کا

سفر اختیار نہ کریں۔ سکھ جیون رام کا وفد ابھی جموں میں

مقیم تھا کہ سری نگر سے حسن ماندہ کا وکیل اس درخواست

کے ساتھ حاضر ہوا کہ بیگم سری نگر کا سفر اختیار کریں۔

وکیل نے بتایا کہ حسن ماندہ نے بارہ ہزار فوج جمع کر رکھی

ہے اور وہ سکھ جیون رام کو حاکمیت سے ہٹا کر بیگم کو حاکم

کشمیر بنانا چاہتے ہیں، انہیں صرف بیگم کی سرپرستی کی

ماندہ کے وکیل کی درخواست قبول کرنے سے پہلے سری

نگر کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیں۔“ وقار بیگم نے

سراٹھائے بغیر کہا۔

بیگم مسکرائی۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ ہماری دختر عزیز

بھی حالات کے بارے میں سوچنے لگی ہے۔“

”حضور کا کرم ہے کہ اس ناچیز کو اس قابل بنایا گیا

کہ وہ بھی اپنی رائے دے سکے۔“ وقار بیگم میں اعتماد آ

گیا۔

”جب سکھ جیون رام کا پیامبر ہمارے حضور پیش

ہوا تو ہم نے اس وقت بھی اپنی دختر عزیز سے رائے

طلب کی تھی۔ اب آپ کے سوا ہمیں یہاں مشورہ دینیئے

والا کوئی نہیں، آپ سے مشورہ یوں بھی لازم ہے کہ اب

آپ نے ہمارا بوجھ بٹانا ہے۔“

”ہم سکھ جیون رام کے پیامبر کے خلوص پر یقین

کرنے کے خلاف تھے۔“

”ہمیں سکھ جیون کے لگان کی ضرورت نہیں، اسے

ہماری سرپرستی کی ضرورت ہے اس لئے یقین کرنے میں

کوئی نقصان نہیں۔“

”سکھ جیون رام شاہ قندھار کا باغی ہے۔ حضور

ایک باغی کی سرپرستی کر کے بادشاہ معظم کو ناراض کریں

گی۔“ وقار بیگم نے ماں کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ کشمیر

کے راجا نے بھی ہوا کا رخ دیکھ کر قندھار سے آنکھیں

پھیر لی ہیں۔“

”ہم اسے بادشاہ معظم کی اطاعت پر مجبور کر دیں

گے، اب ان کی اطاعت اور خوشنودی کے بغیر اس خطہ

میں کوئی حکمران نہیں رہ سکے گا۔“ بیگم نے آنے والے

حالات کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا مطلب ہے حضور نے حسن ماندہ کے

وکیل کی درخواست مسترد کر دی ہے، ہمیں اس سے خوشی

ہوگی۔“

READING  
Section



کا بے حد احترام ہے مگر بعض وجوہ کی بناء پر ہم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

”میرے آقا کے پاس فوج بھی ہے، وہ کئی ماہ سے سکھ جیون رام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہیں صرف حضور کی شفقت اور سربراہی کی ضرورت ہے۔“

”ہم ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں وقت آنے پر ہم ان کے ساتھ ہوں گے۔“ بیگم اسے کوئی واضح جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

بیگم کے جواب سے وکیل کوئی مطلب اخذ نہ کر سکا اس نے بیگم سے متعدد طاقتوں کی تحیں اور درخواست کی تھی کہ بیگم اس کے ہمراہ سری نگر کا سفر اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس نے کہا تھا کہ ان کے جانے سے حسن ماندہ سکھ جیون رام کو بھگا دیں گے اور وادی کے لوگ بیگم کی حکمرانی قبول کر لیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی طرف سے انہیں کشمیر عنایت کرنے کے بعد سے وہ اب تک انہیں ہی اپنی اصل حکمران سمجھتے ہیں۔

بیگم نہ تو انکار کرتا چاہتی تھی اور نہ ہی اس کے ہمراہ جاسکتی تھی۔ وہ سری نگر کے امراء اور حسن ماندہ کی قوت پر وہ بھروسہ نہیں کر سکتی تھی اور جموں میں رہ کر حالات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

حسن ماندہ کے وکیل نے رخصتی سلام کیا اور نہایت مایوسی ک عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیگم نے ایشیہ شمس کی طرف رخ کر کے پھر سے دیوان حافظ کی ورق گردانی شروع کر دی۔

اگلے روز بیگم نے اپنے دور حکومت کے بخشی غازی بیگ خاں کو طلب کیا وہ بھی ان دنوں جموں میں پناہ گزین تھا۔ بیگم اس سے پنجاب اور کشمیر کے حالات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتی رہی۔ غازی بیگ جموں میں عافیت کی زندگی گزار رہا تھا اور ہر قسم کی سیاست اور سازش سے الگ رہنا چاہتا تھا۔

ضرورت ہے۔ کیونکہ احمد شاہ ابدالی نے کشمیر انہیں عنایت فرمایا تھا بیگم اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی اور وقار بیگم اس کے فیصلہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میاں خوش فہم نے حسن ماندہ کے وکیل کی آمد کی اطلاع دی تو وقار بیگم سلام کر کے کمرے سے باہر چلی گئی بیگم گاڑتکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے وکیل کی اس وقت آمد پسند نہیں آئی۔

وکیل میاں خوش فہم کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا اور کورنش بجالا کر مودب کھڑا ہو گیا۔

بیگم نے آداب کا جواب دے کر اس کی طرف دیکھا، وہ سر جھکا کر اپنے قدموں پر نظریں جمائے آگے بڑھا اور سونے کی اشرفی نذرانہ پیش کی۔

بیگم نے نذرانہ قبول کر کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”حضور عالیہ کا خادم جلد سری نگر پہنچنا چاہتا ہے اس کے آقا اور سری نگر کے امراء حضور کی آمد کے منتظر ہیں۔“ وکیل نے بات شروع کی۔

”ہماری طرف سے اپنے آقا کو آگاہ کر دیں کہ ہماری دعا میں ان کے ساتھ ہیں۔“ بیگم نے جواب دیا۔

”کشمیر کے عوام حضور کی قدم بوسی کے لئے بے تاب ہیں۔“ وکیل نے عرض کیا۔

”ہم کشمیر کے عوام کی خوشحالی کے لئے دعا گو ہیں اور ان کی فلاح کے کسی کام سے اجتناب نہیں بردشیں گے۔“ بیگم نے جواب دیا۔

”میرے آقا کی درخواست سری نگر کے امراء اور عوام کی طرف سے ہے اور وہ سب امید کرتے ہیں کہ حضور اسے شرف قبولت بخشیں گے۔“

ہمارے دل میں ان کے جذبات اور خواہشات



بھیج دیا تاکہ وہ گلگھڑوں کی شورش دبا کر افغان فوج کے بے قاعدہ دستوں کو لاہور کی طرف بڑھنے سے روکے رکھیں۔

مرہٹہ فوجیں ایک ہی ماہ میں پشاور تک پہنچ گئیں۔ ایک ماہ کی بات چیت کے بعد عماد الملک نے مرہٹہ سرداروں کو خلعت پیش کئے اور آٹھ لاکھ روپیہ دے کر اس طوفان کا رخ پنجاب کی طرف موڑ دیا مگر واڑہ کے مقام پر آدینہ بیگ کی بیوہ بھی مرہٹہ لشکر گاہ میں پہنچ گئی اور مرہٹہ سالار کو اشرافیوں کے توڑنے اور ہیروں کی تعلیاں پیش کر کے خوش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اپنے داماد خواجہ مرزا خان کو لاہور کی حکومت پر برقرار رکھنے کی درخواست لے کر آئی تھی۔ مرہٹہ سالار نے اشرافیاں اور ہیروں کے شکریہ کے ساتھ قبول کر چکے تھے مگر خواجہ مرزا خان کو حکومت پر برقرار رکھنے کا وعدہ نہیں کیا۔ عماد الملک نے مرہٹوں کو پنجاب سکھوں کی سرنگی دہانے اور افغانوں کے حملہ کے خوف سے روپیہ دیا تھا اور پنجاب کے لئے اپنی مرضی کا حاکم مقرر کرنے کا ان کا حق تسلیم کر لیا تھا۔

شاہجہان آباد سے روانگی سے پہلے ہی مرہٹہ فوجوں کے کماندار جنگوجی نے پشاور تک پہنچی اپنی افواج اور سرداروں اور لاہور پہنچ جانے کے احکامات بھیج دیئے۔

\*\*\*

مرہٹہ سپاہی ایک سرخ و سفید شخص کو سیاہ گدھے پر سوار کر کے لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں گھماتے پھر رہے تھے۔ ہر سر سے یہ جلوس گزرتا تھا لوگ آگے بڑھ کر گدھا سوار کے سر میں خاک ڈالتے تھے۔ اس کے سر منہ اور داڑھی پر غلامت کی لیب ہو گئی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور پاؤں سے جوتے نہیں گر گئے تھے۔ یہ شخص خواجہ سعید تھا خواجہ مرزا خان کا بھائی جو کل تک اہل

سکھوں کی برہمتی ہوئی شورش کے بارے میں تو بتایا مگر سکھ جیون رام اور اس کے امراء کے ہاتھی تازہ کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ بیگم جائزہ لینا چاہتی تھی کہ کسی مہم میں وہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں اس کی بات چیت سے اس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی مہم جوئی کے لئے تیار نہیں۔

\*\*\*

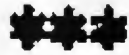
خواجہ مرزا خان کی شکست کی خبر سے بیگم کو بہت مسرت ہوئی تھی۔ آدینہ بیگ کی موت کے پندرہ روز کے اندر اندر افغان دستوں نے گلگھڑوں کی مدد سے خواجہ مرزا خان اور سکھوں کی مشترکہ فوجوں کو گجرات کے قریب دوہار شکست دے کر مار بھگایا تھا لیکن احمد شاہ ابدالی کی اجازت کے بغیر انہوں نے دریا پار کر کے ان کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ افغانوں اور گلگھڑوں کے حملہ کے خوف سے خواجہ مرزا خان اور سکھ ایک بار پھر متحد ہو گئے تھے۔ اس اتحاد کا زیادہ فائدہ سکھوں کو ہوا تھا۔ شمالی پنجاب میں عماد ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور خواجہ مرزا خان کا اقتدار اور اختیار لاہور شہر کی فسیل تک محدود ہو گیا تھا۔ خواجہ مرزا خان نے بیگم کو لاہور سے نکالا تھا، وہ خواجہ کے نکالے جانے کی دعائیں مانگنے لگی۔

بیگم کو اس خبر سے مسرت ہوئی تو دوسری طرف ان کے داماد عماد الملک وزیر اعظم ہندوستان کے لئے یہ ایک بڑی خبر تھی۔ آدینہ بیگ کی موت کے بعد وہ پنجاب کے لئے اپنا صوبیدار مقرر کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دکن سے مرہٹہ سالار فوجوں کے ساتھ شاہجہان آباد پہنچ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ آدینہ بیگ ان کا ہاتھوار تھا اس لئے پنجاب کا نیا حاکم وہ مقرر کریں گے۔ ابھی یہ جھڑا جاری تھا کہ افغانوں کے ہاتھوں سکھوں اور خواجہ مرزا خان کی شکست کی خبر موصول ہوئی۔ مرہٹہ سالار نے عماد الملک سے پوچھا بغیر اپنی فوج کا ایک حصہ پنجاب

READING  
Section



ملک سجاد نے علماء کرام کو شاہجہان آباد کے حالات اور احمد شاہ ابدالی کے نام شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء کے خطوط کے بارے میں بتایا تو ایک عالم نے پوچھا۔ ”ہندوستان کی مسلم ملت کب تک بیرونی مجاہدین کے جذبہ جہاد کی بدولت زندہ رہ سکے گی؟“ اس کا ملک سجاد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔



جنوں شہر سے باہر مظانی بیگم کے سپاہیوں کے ڈیرے پر رات اپنا قبضہ مستحکم کر چکی تھی۔ ڈیرہ کے درمیان میں نصب خیمہ کے پاس اونٹنیوں پر شمع روشن تھی اور دور سے آنے والوں کو بیگم کی لشکر گاہ اور خیمہ کا پتہ دے رہی تھی۔ طہماس خان ابھی تک اپنے خیمہ میں جاگ رہا تھا، وہ دن بھر سری نگر پر چڑھائی کے لئے سوار پیادہ نقیب اور پہرہ نویس بھرتی کرتا رہا تھا۔ بیگم کی طرف سے سری نگر پر چڑھائی کی خبر سننے ہی لوگ جوق در جوق بھرتی کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے اور حسن ماندہ کا وکیل اور طہماس خان کئی روز سے فوج بھرتی کرنے رہے تھے اور غلامین کے کوائف اور فہرستیں مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف بیگم کے فوج بھرتی کرنے اور سری نگر پر چڑھائی کے منصوبہ کا چرچا تھا اور گرد کے چھوٹے چھوٹے راہبے اور حکمران ابھی سے بیگم کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے لگے تھے مگر رنجیت دہو کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر بیگم کشمیر پر قابض ہو گئی اور احمد شاہ ابدالی کی جاری کردہ پرانی سند حکمرانی مان لی گئی تو اسے بھی اس کی حکمرانی قبول کرنا پڑے گی۔ بیگم کی طرف سے سری نگر کے سفر کا ارادہ ظاہر نہ کرنے پر حسن ماندہ کا وکیل واپس چلا گیا تھا مگر حسن ماندہ اس کے بعد بھی بیگم کے پاس درخواستیں بھیجتا رہا کہ بیگم سری نگر پہنچ کر سکھ جیون رام کو نکالنے کی مہم کی سرپرستی کریں اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بیگم نے بہت دیکھ

لاہور کی موت و حیات کا مالک سمجھا جاتا تھا اور جس کے نام کی دہشت سے لوگ کانپنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ ملک سجاد نے دور سے خواجہ سعید کا جلوس آتے دیکھا اور ایک چھوٹی سی گلی میں مڑ گیا۔

مرہٹوں نے لاہور میں داخل ہوتے ہی خواجہ مرزا خان کو قلعہ کے ایک تاریک تہ خانہ میں بند کر دیا تھا اور خواجہ سعید کو گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس بازاروں میں گھمانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اہل شہر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے مرہٹہ سالار نے خواجہ سعید کے مظالم کے بارے میں جان کر اسے یہ سزا دی تھی اہل شہر اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے۔

مرہٹہ سالار نے لاہور کے بعد ملتان کے لئے بھی اپنا ناظم مقرر کر دیا تھا جس سے پنجاب پر مرہٹوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

لاہور کے علماء ایک بار پھر کوچہ ڈوگراں کے قریب مینویں مسجد میں جمع ہو رہے تھے اور ملک سجاد ان کی مشاورت میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔

جلوس دیکھ کر خواجہ مرزا خان اور خواجہ سعید خان کی زندگیوں کے کئی مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے مگر ان کی اس قدر ذلت اور رسوائی ہے اس کا دل بوجھل ہو گیا شاہجہان آباد سے واپسی کے سفر میں اسے بتایا گیا تھا کہ سکھوں نے آدینہ بیک کی قبر کھود کر اس کا نام نشان مٹا دیا ہے۔ ”کیا یہ ہے آدینہ بیک کی زندگی بھر کی کمائی؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

”ملت کے ساتھ جو بھی غداری کرتا ہے اس کا بھی انجام ہوتا ہے۔“ ایک شریک مشاورت نے آدینہ بیک کی قبر اور خواجہ سعید کے جلوس کے بارے میں سن کر کہا۔

”میر منو تو ملت کا محسن تھا، اسے کس کے گناہوں کی سزا ملی؟“ ایک اور شریک مشاورت نے سوال اٹھایا۔

READER'S  
Section



میں منتقل ہو گئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، تمام لشکری اپنے اپنے خیموں میں سو چکے تھے کہ پہریدار گھوڑے کے قدموں کی آواز سن کر ہوشیار ہو گئے۔ آواز مستول سے لٹکتی شمع کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے نیزے اور تلواریں سنبھال لیں۔ گھوڑے سوار سیدھا چلتا ہوا شمع کے نیچے آ کر رک گیا۔

”حکمرانی ابھی ملی نہیں اور سائل ابھی سے آتا شروع ہو گئے۔“ ایک پہریدار نے دوسرے سے کہا۔  
”یہ مغلانی بیگم کی شمع ہے اور بیگم جہاں بھی ہو حکمران ہوتی ہے۔ سائل اور حاجتمند ان کے دروازے پر جمع رہتے ہیں۔“ دوسرے نے شمع کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر بیگم تو حویلی میں ہے اتنی رات گئے کوئی مصیبت کا مارا راستہ بھول گیا ہوگا۔“  
”بیگم سے بڑا مصیبت کا مارا اور کون ہو سکتا ہے جو راستہ بھول کر جنوں پہنچی اور اب آگے سری نگر جا رہی ہے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے شمع کی طرف چلے گئے۔  
لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی سوار نے گھوڑے کا رخ ان کی طرف کر دیا۔

اس نے سر پر دستار اور جسم پر ہتھیار سجا رکھے تھے اور چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا جیسے کسی واردات کے لئے آیا ہو۔

”رک جائیں۔“ پہریداروں نے حکم دیا۔  
ٹھہراس خان پہریدار کی آواز سن کر جلدی سے خیمے سے باہر آ گیا۔

سوار نے اسے دیکھتے ہی نقاب الٹ دی۔  
ٹھہراس خان نے آگ بڑھ کر رکاب تھام لی۔

”مغزور! اس وقت آپ۔۔۔ کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟“

کہ پنجاب پر مرہٹوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ان کے خلاف فوج کشی اور پنجاب پر قبضہ کا کرنی اسکا نہیں تو اس نے حسن ماندہ کی درخواست قبول کر لی۔ حسن ماندہ نے سری نگر کے امراء کے مشورہ پر لکھا تھا کہ بیگم خود سری نگر کے سفر کی زحمت پسند نہیں کریں تو ان کے وکیل کے ہمراہ اپنے کسی نمائندہ کو چند سواروں کے ساتھ سری نگر بھیج دیا تاکہ وہ کشمیر کے عوام کو بتا سکیں کہ بیگم نے سکھ جیون رام کو نکال کر کشمیر پر خود حکومت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے نمائندہ اور سواروں کو دیکھ کر وادی کے لوگ ان کی مہم میں شامل ہو جائیں گے۔

حسن ماندہ اور سری نگر کے امراء کی درخواست قبول کرنے کے بعد بیگم نے ایک بار پھر غازی بیگ خان کو طلب کیا اور اسے سری نگر میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے معذرت کر لی اور بتایا کہ اس کا ایک بھائی سکھ جیون رام کے دربار سے وابستہ ہے۔ اس لئے وہ سکھ جیون رام کے خلاف کسی مہم کی سربراہی اور بیگم کی طرف سے نمائندگی قبول نہیں کر سکتا۔ غازی بیگ خان کے انکار پر بیگم نے ابوتراب خان کو کشمیر میں اپنا نمائندہ مقرر کر دیا اس پر حسن ماندہ کے وکیل نے اعتراض کیا کہ ابوتراب خان کشمیری ہے اور کشمیر کے لوگ کسی کشمیر کو اپنا حکمران تسلیم نہیں کریں گے اس لئے کسی غیر کشمیری کو نمائندہ بنانا لازم ہے مجبوراً بیگم نے ٹھہراس خان کو نامزد کر دیا اور وہ جموں سے باہر خیمہ اور جھنڈا گاڑھ کر فوج بھرتی کرنے لگا۔

سب سے پہلے حسن ماندہ کے وکیل نے خود ٹھہراس خان کو نذر پیش کر کے بیگم کے نمائندہ کے طور پر تسلیم کیا اور پھر وہ دونوں لشکر اور سفر کی تیاریوں میں لگ گئے۔ لاہور سے بیگم کے ساتھ آنے والے ان کے ترک سوار بھی اپنے اپنے گھوڑوں اور تیر و تلوار کے ساتھ لشکر گاہ



"حکیم بھجوا دیا ہوتا۔"  
 "جلدی سے ہتھیار لگاؤ اور ہمارے ساتھ چلو۔"  
 سوار نے حکم دیا۔  
 طہماس خان نے گھوڑا منگوا لیا اور ہتھیار لگا کر سوار  
 کے ساتھ چل دیا۔  
 حسن ماندہ کا دکیل اور پہریدار سب حیران رہ  
 گئے۔

"اس بستی میں تو کوئی چھوٹا موٹا پیر بھی نہیں رہتا،  
 مغلانی بیگم کا پیر رہتا ہوتا تو سب ہی جانتے۔" نو جوان  
 نے اتنی ہی حیرانی سے جواب دیا۔  
 "اصل میں بیگم صاحبہ کے حضور ایک بزرگ پیش  
 ہوئے تھے اور بتایا تھا کہ وہ اسی بستی میں رہتے ہیں۔"  
 طہماس خان نے وضاحت کی۔  
 "بیگم کو لوٹ تو نہیں لے گیا وہ پیر؟" نو جوان نے  
 سیدھا سوال کیا۔

"بیگم صاحبہ سے ایک گھوڑا اور زر نقد لایا تھا وہ،  
 گھوڑے کو ذبح کر کے کچھ وظیفہ کرنا چاہتا تھا مگر ابھی تک  
 واپس نہیں گیا۔" طہماس خان نے اسے بتایا۔  
 "بیگم صاحبہ کے کرم سے اسے نجات مل گئی اور وہ  
 دو رات پہلے کرایہ مکان اور قرض ادا کر کے گھوڑے پر  
 سوار کہیں چلا گیا تھا۔" نو جوان نے جواب دیا۔  
 "وہ یہاں کا رہنے والا نہ تھا؟ کہاں گیا ہے کچھ  
 معلوم ہو سکتا ہے؟" طہماس خان نے ایک ہی سانس  
 میں دو سوال پوچھ ڈالے۔

"نہ وہ یہاں کا تھا نہ کسی کو علم ہے کہاں گیا۔ ایک  
 ماہ پہلے ادھر آیا تھا، مکان کرایہ پر لیا اور دیگر بستیوں میں  
 لوگوں کو دھوکہ دینے لگا اور دو روز پیشتر کہیں چلا گیا۔"  
 نو جوان نے تفصیل سے جواب دیا۔

وہ طہماس خان اور اس کے ساتھیوں کو اس مکان  
 کے مالک کے پاس لے گیا جس میں پیر کرم شاہ کی  
 رہائش ہوتی تھی۔ مالک نے بھی اس کے فرار کی تصدیق

کسی کو بیگم کے بھیس بدل کر رات کے اندھیرے  
 میں لشکرگاہ میں آنے اور طہماس خان کو ساتھ لے جانے  
 کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔  
 سورج کی ٹھٹھری ہوئی شعاعیں جموں کی ایک بستی  
 کی چھتوں سے صحنوں میں اترن کی کوشش کر رہی تھیں اور  
 طہماس خان ایک دستہ کے ساتھ بستی کی گلیوں میں پیر  
 کرم شاہ کے گھر کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا جس کسی سے  
 پوچھتا وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔

"حیران ہوں کہ بیگم صاحبہ کے پیر کو یہاں کوئی  
 جانتا ہی نہیں۔" اس نے تھک کر اپنے ساتھی سے کہا۔  
 "کیا معلوم لوگ بیگم صاحبہ کو بھی جانتے ہیں یا  
 نہیں۔" ساتھی نے جواب دیا۔

ایک نو جوان کو آتا دیکھ کر وہ رک گئے۔ "آپ  
 مغلانی بیگم کو جانتے ہیں؟" طہماس خان نے ساتھی کا  
 شک دور کرنے کو پوچھا۔

"مغلانی بیگم کو کون نہیں جانتا، اب تو وہ کشمیر فتح  
 کرنے جا رہی ہیں اور فوج بھرتی کرنے کو کمپ لگا رکھا  
 ہے۔" نو جوان نے انہیں گنبد دور سے آئے ہوئے  
 مسافر سمجھا۔

"اسی بستی میں رہتے ہو؟" طہماس خان نے  
 دوسرا سوال کیا۔

"جس سے پیدا ہوا ہوں یہیں پر رہ رہا ہوں۔"

نو جوان نے جواب دیا۔  
 READING  
 Section



ذیوزمی پر جمع سواروں نے بیگم کو رہائی دلائی اور بیگم کے وعدہ پر یقین کر کے سب الگ ہو کر بیٹھ گئے۔

بیگم نے مکان کی چھت پر چڑھ کر شور مچا دیا، اردگرد کے لوگ جمع ہو گئے، حملہ کرنے والے کچھ بھاگ گئے، کچھ کو لوگوں نے پکڑ لیا۔

پیر کے ہاتھوں لٹنے کے بعد اس توہین کا صدمہ بیگم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ کوتوال کے دستے مدد کو پہنچے تو بیگم نے ملازموں کو ان کے حوالے کر دیا۔ سواروں کو بغاوت پر آمادہ کرنے اور انہیں قتل کرانے کی کوشش کے الزام میں بیگم نے طہماس خان کو بھی گرفتار کر دیا۔

کوتوال نے ان سب کے بازو پشت پر باندھ کر انہیں اندھے کنویں میں لٹکا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ خود سوار ہو کر کوتوال کے پاس گئیں اور اپنے ملازمین کو اندھے کنویں میں سے نکلوانا۔

فوج کی بھرتی کے مرحلہ میں ہی اس بغاوت کی وجہ سے تمام لکر منتشر ہو گیا۔

حسن ماندہ کا وکیل ایک بار پھر ناکام واپس لوٹ گیا۔

اور بیگم کا کشمیر فتح کرنے کا منصوبہ ادھور رہ گیا۔

اس ناکامی سے بیگم کی شہرت کو بہت نقصان پہنچا

لیکن جموں میں مقیم ترک اور مغل امراء اب بھی ان کے

حضور حاضری دیتے تھے کیونکہ احمد شاہ ابدالی کی ایک بار

پھر ہندوستان پر فوج کی کشی کی تیاریوں کی خبریں آنے

لگی تھیں۔ جموں کا راجا رنجیت دیو بھی حالات کے تیور

دیکھ کر پھر سے بیگم کو خوش رکھنے کی کوششوں میں لگ گیا۔

بیگم خاموشی سے حالات کا اندازہ کرنے لگی۔ اب

اس کے لئے سب سے اہم مسئلہ وقار بیگم کی شادی کا تھا۔

ان حالات میں ان کی مالی اور سیاسی حالت اس قابل

نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے خاندان کے مقام و مرتبہ کے

کردی اور ہندیا کہ بستی والوں کو اس نے اپنا نام ملاں کا ملی بتا رکھا تھا اور باہر لوگوں کو مختلف نام بتایا کرتا تھا۔

حویلی پہنچ کر طہماس خان نے بیگم کو پیر کرم شاہ کے فرار کی خبر سنائی تو وہ طیش میں آ گئی اور ان سب خدام کو طلب کر کے زد و کوب کر دیا جو پیر کرم شاہ کو ان کے پاس لائے تھے اور اس کی کرامات کا ذکر کر کے انہیں پیر سے فتح کا وظیفہ کرانے پر راضی کیا تھا۔

بیگم نے پیر کرم شاہ کو گھوڑا اور دو ہزار روپیہ نقد دیا تھا تاکہ وہ وظیفہ کے لئے خوشبو یا تخرید سکے اور وظیفہ پڑھنے والے شاگرد پیشہ کو معاوضہ ادا کر سکے۔

پیر کرم شاہ کے ہاتھوں بیگم کے لٹنے کی خبر لشکر گاہ میں پہنچی تو نئے بھرتی شدہ سواروں نے تنخواہوں کا مطالبہ شروع کر دیا اور کہا کہ جب تک انہیں پوری تنخواہ اور زاد سفر ادا نہ کیا جائے وہ سری نگر کی مہم میں شامل نہیں ہوں گے۔

شاہانہ زندگی و دصدا ملازمین کے اخراجات اور

تنخواہوں کی وجہ سے بیگم کی مالی حالت بہت خراب ہو

چکی تھی۔ ساری فوج کو فوری ادائیگی کے لئے اس کے

پاس رقم نہ تھی اور جموں کا کوئی سا ہو کار اسے قرض دینے

پر تیار نہ تھا۔ حسن ماندہ کا وکیل بھی اس صورت حال سے

پریشان ہو گیا۔ دو روز تک تنخواہ کی ادائیگی کا انتظار کرنے

کے بعد بیشتر سوار اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے مگر

کچھ ملازمین سواروں کے ساتھ بیگم کے حضور پیش ہوئے

اور فوری طور پر تمام بقایا جات کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔

بیگم کے انکار پر ایک سرور نے آگے بڑھ کر بیگم کو تھپڑ رسید

کیا، دوسرے نے چابک اور تیسرے نے بیگم کو زمین پر

لٹا کر گلے پر چھری رکھ دی۔

”آپ کا مطالبہ بجا ہے، ہم ابھی اپنے جواہرات

بچ کر تمہیں ادائیگی کر دیتے ہیں۔“ بیگم نے چھری کے

نچے سے جواب دیا۔

REMARK  
Section

SCANNED BY AMIR



مطابق بیٹی کے نکاح کا انتظام کر سکے۔

وزیراعظم ہندوستان عمادالملک نے اسے کئی مراسلے بھیجے کہ وہ شاہجہان آباد آ جائیں مگر وہ ایسا کوئی اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی جو احمد شاہ ابدالی کو پسند نہ ہو۔ جب بیٹی اور داماد کا اصرار بڑھ گیا تو اس نے دو صد سواروں کا قافلہ تیار کر کے دقار بیگم کو شاہجہان آباد بھیج دیا، وہ اب جموں میں اکیلی تھی۔ طہمان خان کو دقار بیگم کے قافلہ کے ساتھ شاہجہان آباد بھیج دیا تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے متعدد ملازمین برخاست کر چکی تھی اور دن بھر بیٹھی سوچتی رہتی تھی اور حالات کی ڈور اپنے ہاتھوں سے کھسکتی ہوئی محسوس کرنے لگی تھی۔

ہندوستان کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے خوف سے شاہجہان آباد کے علماء کے علاوہ جے پور اور مارواڑ کے راجپوت راجے بھی پریشان تھے۔ انہوں نے بھی احمد شاہ ابدالی کو مراسلے لکھے تھے اور اپنی طرف سے فرمانبرداری کا یقین دلا کر مرہٹوں اور عمادالملک کے خلاف فوج کشی کی درخواستیں بھیجی تھیں۔ جموں میں مقیم امراء کے ذریعے بیگم کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں مگر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مرہٹوں کا اتحادی عمادالملک اس کا داماد تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس بار وہ اسے ابدالی سے معافی نہیں دلا سکے گی۔ عمادالملک نے احمد شاہ ابدالی سے کئے تمام معاہدوں اور وعدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ مرہٹوں کو پنجاب پر قبضہ میں مدد دینے کا جرم بہت سنگین تھا جسے ابدالی معاف نہیں کر سکتا تھا۔

\*\*\*

شاہجہان آباد کے افق پر امید اور دکھ کے گہرے ہوتے ہوئے سائے مغلائی بیگم کے آنگن میں اتر آئے۔ پہلے برادری کے میدان میں جہان خان کے ہاتھوں عمادالملک اور مرہٹوں کی شکست کی خبر ملی۔ درروز

بعد شہنشاہ عالمگیر ثانی کی برہنہ لاش کوئلہ کے ویرانے میں پڑی پائی گئی۔ اس قتل کا شبہ بھی عمادالملک پر کیا جانے لگا۔ عمادالملک نے شہنشاہ کے دو بیٹوں کو قافلہ معالیٰ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ حکومت کے معاملات میں شہنشاہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مغلائی بیگم کی مدد سے وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے وقت اس نے احمد شاہ ابدالی سے نیک چلنی کے جو وعدے کئے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا تھا۔ اس کی خود سری اور خود مختاری دیکھ کر شہنشاہ عالمگیر ثانی نے خود احمد شاہ ابدالی کو خفیہ خطوط لکھ کر مدد کی درخواست کی تھی اور خدشہ ظاہر کیا تھا کہ عمادالملک انہیں اور ان کے بیٹوں کو قتل کر دے گا۔ ان کا ایک خدشہ پورا ہو گیا تو اہل قافلہ ان کے نظر بند بیٹوں کی زندگیاں کے بارے میں خوفزدہ ہو گئے۔ بیگم کے لئے یہ صورت احوال بہت پریشان کن تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے ورہ بولان کے راستے ہندوستان میں داخل ہونے کی خبر سننے ہی مغلائی بیگم جموں سے شاہجہان آباد پہنچ گئی تھیں۔ سامان اور خدام کی ترتیب سے فارغ ہوتے ہی وہ مغل دارالحکومت کی خبروں کے حصول میں لگ گئی۔ ان خبروں کے تجزیہ سے جو تصویر بنتی تھی وہ اس کے اور عمادالملک کے مستقبل کے بارے میں پریشان کن تھی۔ شاہجہان آباد کے علماء پہلے سے بھی زیادہ عمادالملک کے خلاف تھے اور اسے مسلمانوں کا دشمن اور مرہٹوں کا ایجنٹ سمجھتے تھے جس کی رضا اور مدد سے مرہٹوں نے عملاً مغلیہ سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا اور علماء کا خدشہ پورا کر دیا تھا وہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے مرہٹوں کی فوجیں لے آیا تھا۔ اس طرح اس نے وہ سارے الزامات درست ثابت کر دیئے تھے جو علماء اور شہنشاہ اس پر لگاتے رہے تھے۔ مغلائی بیگم کو اندازہ تھا کہ مرہٹے افغانوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ابدالی کی فوجوں کے ہندوستان میں



تھی۔ "عماد الملک کا اپنا انجام کیا ہوگا؟ کون جانے اس خاندان کے اقتدار کا سورج آخری منزل بھی مکمل کرنے والا ہے۔ عماد الملک سراپوں کا تعاقب کر رہا ہے۔"

کنیز نے شہباز خان کی حاضری کی درخواست پیش کی تو وہ کلیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ شہباز خان نے فرشی سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم نے کہا تھا کہ ہم شہنشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" بیگم نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"حضور شاہجہان آباد کی ایک گلی کی افواہ دوسری گلی میں پھیلی افواہ سے مختلف ہے۔ ایک بازار والوں نے زبانی کلائی جو قاتل پکڑے ہوتے ہیں وہ دوسرے بازار والوں سے مختلف ہوتے ہیں۔"

"ہم گلیوں اور بازاروں کی افواہوں اور قاتلوں کے بارے میں نہیں اصل قاتلوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" بیگم نے اسے بات مکمل کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔

"شاہجہان آباد اور قلعہ معلیٰ میں کوئی بھی ان قاتلوں کی تلاش اور پہچان میں دلچسپی نہیں رکھا، امراء اور عمال سب اپنی اپنی جانوں کی فکر میں ہیں۔" شہباز خان نے جواب دیا۔

"جس شہر میں ملک کے شہنشاہ کی لاش ویرانے میں پڑی رہے اور کوئی نہ جانے کس کی لاش ہے، قاتل کون ہے، دشمنی کیا تھی۔ جس ملک کے مرحوم وزیراعظم کا بیٹا جو خود بھی وزیراعظم رہ چکا تھا، قتل کر دیا جائے، وہاں کوئی بھی محفوظ نہیں۔" مغدانی بیگم نے ایسے کہا جیسے وہ شہباز خان کی بات کا جواب نہیں اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ "جب بھی ہم تمہاری بے بسی دیکھتے ہیں ہمیں سرفراز خان یاد آتے ہیں۔" اس نے شہباز خان کی طرف دیکھا۔

داخل ہونے کی خبر سنتے ہی پشاور، لاہور اور ملتان پر قابض مرہٹہ سالار اور عمال بھاگ کر شاہجہان آباد واپس آ چکے تھے۔ بیگم نے عماد الملک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ دے اور ابدالی سے ایک بار پھر معافی کی درخواست کر کے اس کے ساتھ مل جائے مگر اس نے بیگم کے مشورہ پر عمل کرنے کی بجائے اپنے بیوی بچے سورج مل کے ہاں بھیج دیئے اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر ابدالی کی فوجوں سے لڑنے چل پڑا تھا۔

اسے مرہٹوں کی قوت پر بہت اعتماد تھا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی کو قتل کس نے کیا؟ شاہجہان آباد میں قسم قسم کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ قتل جس نے بھی کیا مجرم عماد الملک کو ٹھہرایا جائے گا۔ بیگم نے سنا تو تاسف سے کہا۔

شاہجہان آباد پہنچتے ہی بیگم نے عماد الملک اور اس کے ماموں خان خانان انتظام الدولہ میں مفاہمت کی کوشش بھی کی تھی مگر اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی تھی۔ شہنشاہ کے قتل کے اگلے روز انتظام الدولہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔

مگر عماد الملک خود ابھی تک شاہجہان آباد نہیں پہنچا تھا۔

مغدانی بیگم نے وہ ساری رات جاگ کر گزار دی۔ صبح مشرق میں طلوع ہوتا ہوا سورج اسے مغرب میں غروب ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "اس اندھیرے میں ہمیں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔" وہ کمرے میں بڑبڑاتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔

کنیز نے پردہ ہٹا کر دیکھا وہ واپس جانے کو تھی کہ بیگم نے دیکھ لیا۔ "شہباز خان کو حاضر کریں۔" کنیز آداب بجالا کر باہر نکل گئی۔

"انتظام الدولہ کا قتل بھی عماد الملک کے نام لکھا جائے گا۔" اس کی خودکلامی پس پردہ کنیز بھی سن رہی



سے باہر نکل گیا۔  
 بیگم اسے جانا دیکھ کر مسکراتے کی کوشش کر رہی تھی  
 مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

\*\*\*

ملک سجاول اور ان کے ساتھیوں نے اپنے  
 گھوڑوں کا رخ مقبرہ ہمایوں کی طرف موڑا تو شاہجہان  
 آباد کے آسمانوں پر ایک دوسرے کا آفتاب کرتے امید  
 اور ناامیدی کے بادلوں کے پیچھے چھپا سورج گھونکتا  
 اٹھا کر ہلکا سا مسکرایا۔ ان کے گھوڑے تھکے تھکے دکھائی  
 دیتے تھے جیسے کہیں بہت دور سے آئے ہوں۔ سورج  
 دھونے بھی اپنی رتھ کے گھوڑے کھول دیتے۔ وہ بیرونی  
 پہریداروں کی ویران ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں سے اتر  
 آئے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی گھوڑوں کی لگا میں  
 ہاتھوں میں تھام لیں سو ریاں دیں باندھ کر وہ پیدل چلے  
 گئے۔ مقبرہ کے وسیع و عریض احاطہ کی قلعہ نما دیواروں  
 میں مقیم خامشی شاید ان کے اعصاب پر اثر انداز ہونے  
 لگی تھی۔ وہ سر جھکانے خاموش چلے جا رہے تھے۔ سڑک  
 کے دونوں طرف لائنوں میں دور تک پھیلی سوکھی گھاس  
 نے اپنا سر ہلا کر حیرانی کا اظہار کیا۔ مزار کے سامنے وہ  
 رک گئے۔ دونوں جانب دور تک محرابوں اور دروازوں  
 کے پیچھے ابھی سے اندھیرا گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ انہی  
 محرابوں میں سے کسی میں برہنہ شہنشاہ کو کفن پہنا کر سپرد  
 کر دیا گیا تھا۔ وہ کسی محراب کے سامنے فوج کشیں اور  
 کسی قبر پر چادر چڑھائیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ  
 اندر سے ایک خادم برآمد ہوا۔ دن کے خاتمہ اور رات  
 کے آغاز پر اسے آدھوں کو مزار کے سامنے دیکھ کر وہ کچھ  
 حیران سا دکھائی دیتا تھا۔

"شہنشاہ عالمگیر مغفور کس محراب میں آرام فرما  
 ہیں؟" خادم کے کچھ بولنے سے پیچھے ہی انہوں نے  
 پوچھا۔

"حضور کے خادم کو اپنی ٹاہلیوں پر افسوس ہے۔"  
 شہباز خان نے شرمندگی سے جواب دیا۔  
 "ٹھہراس خاں کو ڈھونڈ کر پیش کر دو۔" بیگم نے حکم  
 دیا۔

"حضور کا خادم میاں محبت کے ذریعے سے بھی  
 معلوم کر چکا ہے۔ ٹھہراس خاں کا کچھ بڑا نہیں چل  
 رہا۔"

"ہمارے سامنے اس حرام خورد کا نام نہ لو۔ ہم نمک  
 حرام میاں محبت اور اس فاختہ کی چڑی اتروا کر اس میں  
 بھس بھر دیں گے۔" بیگم کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو  
 گئیں۔ شہباز خان سر جھکانے خاموش کھڑا رہا۔

"ہماری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ، ہم  
 سمجھتے ہیں تم کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہتے۔" بیگم غصہ  
 سے چلائی۔

شہباز خان وہیں سجدہ میں گر گیا۔  
 "تم پاکیزہ فرش اپنی تنخوس پیشانی سے پید کرنے  
 سے باز نہ آئے۔ تو ہمیں جلاؤ کو بلانا پڑ گا۔" وہ مزید غصہ  
 سے چلائی۔

شہباز بلند آواز میں رونے لگا، وہ گھٹنوں کے بل  
 پٹتا ہوا آگے بڑھا اور بیگم کے قدموں میں سر رکھ کر  
 معافی کی درخواست کرنے لگا۔

بیگم خاموش رہی، شہباز خان کو اپنے  
 قدموں پر پڑا دیکھ کر اس کا غصہ بھٹکا ہوا شروع ہو گیا۔  
 حضور کے قدموں میں جان دینا غلام کی زندگی  
 کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ وہ آہیں بھر رہا تھا۔

بیگم کے مونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہم ایک  
 ہی بار معاف کیا کرتے ہیں۔ ٹھہراس ماں کو ڈھونڈ کر  
 پیش کرو، ہم انہیں رکھتے ہیں تم پھر سے معافی کی  
 درخواست کرنے سے بچنے کی کوشش کرو گے۔"

شہباز حیران اٹھا اور اس کے قدموں چتا ہوا کمرے

READING  
Section



”جس طرح کچھ لوگ مغل سلطنت کے بکھرے اجزاء کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ دوسرا بھی نے کہا۔

ملک سجاد نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش چلتا رہا۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے متصل مسجد میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ باہر آئے تو محفل سماع کے لئے چٹائیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ کھلے میدان میں شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ عقیدت مند اور درویش جمع تھے جو چٹائی بچھ جاتی وہ اس پر قابض ہو جاتے اور آنکھیں بند کر کے دُحیفہ پڑھنا شروع کر دیتے۔

بستی نظام الدین کی گلیاں اور بازار ویران تھے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر دروازے بند کر چکے تھے۔ اندھیری گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ بستی سے باہر آ گئے اور گھوڑوں کا رخ مدرسہ رحیمیہ کی طرف موڑ دیا۔

شہنشاہ ہندوستان کی برہنہ لاش چھ پہر جنا کی ریت پر پڑی رہی تو مہدی علی خاں کشمیری نے اٹھوا کر ہمالیوں کے مقبرہ میں دفن کر دیا۔ شہنشاہ کا کوئی بیٹا اس کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کر سکا تھا اور نہ ہی امرائے دربار اس کے جنازے کو کندھا دے سکے تھے۔ شہنشاہ کے دو بیٹے اور داماد عماد الملک کی حراست میں تھے اور تیسرا بیٹا اس سے جان بچا کر جنگ بھاگ گیا تھا۔ شاہجہان آباد کے امراء اور شرفاء اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانیں بچاتے پھر رہے تھے۔ شہر میں کسی کے پاس نہ مقتول شہنشاہ کے لئے آنسو بہانے کے لئے وقت تھا نہ شہنشاہ شہجہان ثانی کی تخت نشینی پر خوش ہونے کی فرصت تھی۔ ہر گھر اور آنگن میں دکھ اور ناامیدی کے سائے دراز ہو رہیتھے۔ احمد شاہ ابدالی کو شہنشاہ کی موت کی خبر پہنچی تو اس نے ملک سجاد کو اس کی قبر کے

اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس طرف چلنے لگا۔ محراب میں اندھیرا تھا اس نے موم جلی جلائی، اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سب قبر تک پہنچے۔ سنہری دھاگوں سے بنی چادر قبر پر چڑھا کر سب نے فاتحہ پڑھی اور اسی طرح خاموش چلتے ہوئے باہر آ گئے۔

سورج دیوتا اپنی خواب گاہ میں قدم رکھ چکا تھا۔ ملک سجاد نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور مقبرہ کی میڑھیاں چڑھنے لگا، اس کے ساتھی بھی پیچھے چل دیئے۔ چھت کی محراب میں بنے شہنشاہ ہندوستان ہمالیوں کی قبر کے تعویذ کے سرہانے سوکھے پھول بکھرے تھے۔ ملک نے آگے بڑھ کر پھولوں کی پتیاں اٹھائیں۔ وہ دیر تک انہیں غور سے دیکھتا رہا اور پھر وہیں رکھ کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ باہر آ کر اس نے گہرے ہوتے اندھیرے میں چاروں طرف پھیلے شاہجہان آباد کا سرسری نگاہ سے جائزہ لیا اور میڑھیاں اترنے لگا۔ مقبرہ کا خادم کچھ فاصلہ پر ان کے پیچھے آ رہا تھا۔

”سردار! آپ نے پھول کی پتیاں جمع کیں اور پھر وہیں رکھ دیں۔“ خادم نے نیچے پہنچ کر کہا۔ ”عرش آشیانی کے مزار سے تو پھول کی ایک پتی گھر لے جانا بھی باعث برکت ہے۔ حضور اجازت دیں تو چند پتیاں پیش کروں؟“

”نہیں، شکریہ!“ ملک سجاد نے کہا اور ڈیوڑھی کی طرف چل دیئے۔

خادم سر جھکائے کھڑا دیکھتا رہا۔

”سردار ہلکا سا ہوا کا جھونکا ان سوکھی پتیوں کو پھر سے بکھیر دے گا۔“ ملک سجاد کے ایک ساتھی نے چلتے چلتے کہا۔

”ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کرتے رہنا چاہئے۔“ ملک سجاد نے جواب دیا۔

READING  
Section



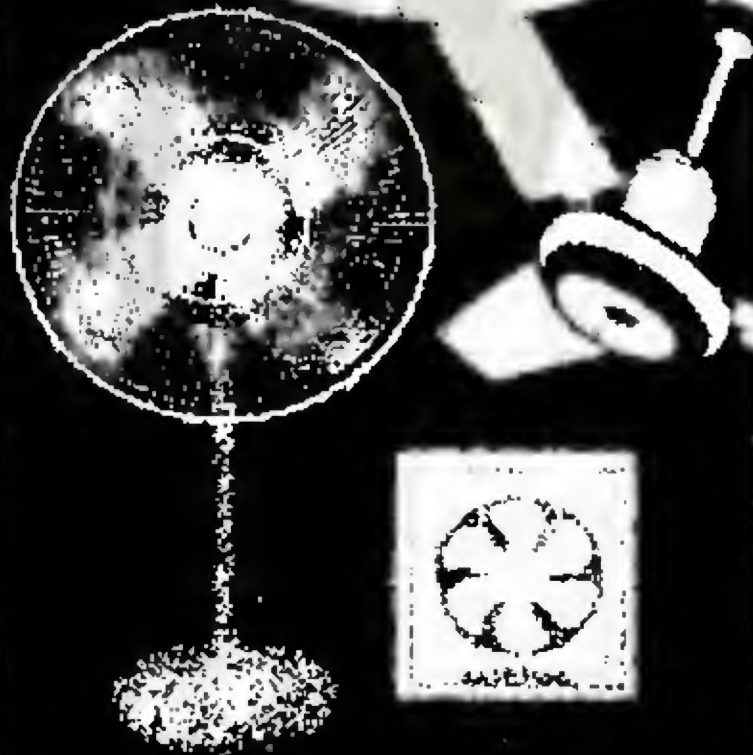
پاکستان میں چکھے

بنانے کے بانی



ESTD. 1936

ایس اے چکھے



ایس اے - الیکٹرونکس انڈسٹریز - تجارت

3533478, 3535045, 3515327 - 53

نے پھول اور چادروں سے رشا جہان آباد بھیجا تھا۔ شہنشاہ عالمگیر بانی اس کا سہمی بھی تھا اور مظلوم بھی۔

ملک سجاوٹ شہنشاہ ہندلی بے بسی اور موت کے ان واقعات کے بارے جتنا زیادہ سوچتا تھا، اتنا ہی مغلیہ سلطنت کے مستقبل کے بارے میں زیادہ مایوس ہو جاتا تھا۔

کسی افغان یا روہیلہ سردار کو چادروں کے ساتھ بھیجنا ممکن نہ تھا کیونکہ شہر سے باہر میرہٹو جیسے خیمہ زن تھیں۔ شہر کے اندر کسی کی حکومت نہ تھی، سننے شہنشاہ کی حکومت قلعہ معلیٰ کی دیواروں کے اندر خوجہ سراؤں تک ہی محدود تھی۔ قلعہ دار عدا الملک نے مقرر کیا تھا، وہ بھی اس کی رعایا نہیں کہا جاسکتا تھا۔

\*\*\*

”ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم اور تمہارے ساتھی شہنشاہ کے قتل کی سازش میں کیوں شامل ہوئے؟“ مختلانی بیگم نے طہماس خان سے پوچھا جو سر جھکانے ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ بیگم بہت ناراض معلوم ہوتی تھی۔

”حضور عالی کا کوئی خادم اس سازش میں شامل نہیں تھا۔“ طہماس خان نے سراٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”کیا یہ درست نہیں کہ تم سب اس روز کونڈ میں موجود تھے اور شہنشاہ کے قتل کے بعد تم خوجہ سراؤں میں خاں کے ہمراہ قلعہ معلیٰ گئے تھے اور وہاں ٹی اہلالت کی تخت نشینی کی تقریب میں شریک ہوئے تھے؟“ بیگم نے اپنے تجربوں کی فرازم کردہ تفاسیل اسے بتا دیں تاکہ وہ انکار نہ کر سکے۔

طہماس خان نے اندازہ کیا کہ بیگم کو دھوکہ دینا ممکن نہیں اس کا سر مزید جھٹک گیا تھا اور آواز حلق میں پھنس پھنس کر جاتی تھی۔ ان نے انکار کی بجائے اقرار کر دیا۔ ”جی ہاں، حضور کے کسی غلام نے شہنشاہ بند



شاہو پہنچنے کا حکم دیا گیا اور بتایا گیا کہ شہنشاہ معظم قندھار سے آئے ایک بزرگ کے حضور حاضری دیئے کوئلہ گئے ہیں۔ ہم وہاں پہنچے تو ہمیں راستہ کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ بسبب شہنشاہ معظم بزرگ سے مل کر برآمد ہوں تو تم نے انہیں سلام کرنا ہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک سوار کوئلہ سے باہر آیا اور خواجہ سرا کو ایک طرف لے جا کر اس سے کوئی بات کی خواجہ سرا فوراً ہمیں ساتھ لے کر قلعہ معلیٰ روانہ ہو گئے۔ "طہماس خان سے اس صبح اپنے وہاں موجود ہونے کی تفصیل بتادی۔"

"شہنشاہ معظم نے قتل کا تمہیں سب علم ہوا؟" جلیلم کے سوال سے طہماس خان نے محسوس کیا کہ ان کی ہار نصیبی تم ہوئے گی ہے۔

"قلعہ معلیٰ کے دروازے پر قلعہ دار بنے ہمیں قلعہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ عنبر علی خاں نے اسے ایک طرف لے جا کر کچلا بات کی تو اس نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا، ہم سواریاں وچیں چھوڑ کر خواجہ سرا کے ہمراہ دیوان خاص کے سامنے پہنچے تو عنبر علی خاں نے ہمیں دیوان خاص کے دروازے پر پہرہ کی ڈیوٹی پر لگا دیا اور خود دیگر خواجہ سراؤں کے ہمراہ کل شاہی کی طرف پتہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہزادہ نجی اہلست کے ہمراہ کل برآمد ہوئے تو قلعہ دار شاہی سے شہنشاہ نے برآمد ہونے کا نفاذ بلند ہوا۔ سب آداب کے لئے جھک گئے اور شہزادہ کو جلوس کی صورت میں تخت شہنشاہی تک لے گئے اور تاج پہنا کر شہنشاہ عالمگیر ثانی کے کوئلہ کے ایک محل کی بیڑھیوں سے گر کر اچانک وفات پا جانے کا بتا کر کئی اہلست کے تخت نشین ہونے کا اعلان کر دیا کیا تب ہمیں معلوم ہوا کہ شہنشاہ معظم رخصت فرما گئے ہیں۔"

"اس کے بعد تم نے کیا کیا؟" جلیلم نے پوچھا۔

بڑھائی۔

"اب کے قتل اور منصوبہ سازی میں حصہ نہیں لیا انہوں نے جو کیا حضور نواب عماد الملک کے حکم پر کیا۔"

جلیلم کو شبہ تھا اس قتل میں عماد الملک شامل ہوں گے اور اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا شبہ دور ہو جائے۔ طہماس خان سے عماد الملک کے حکم کا سن کر ان کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "ہم جانتا چاہیں گے کہ نواب عماد الملک نے کیا حکم دیا تھا۔"

"حضور نواب عماد الملک نے حضور کے غلاموں کو حکم دیا تھا کہ وہ نیکل نشین خواجہ سرا عنبر علی خاں کے ساتھ جائیں اور بدوہ حکم دیں اس کی تعمیل کریں۔" طہماس خان نے جواب دیا۔

"نیک حرام! تم ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے، ہم جانتے ہیں کہ نواب عماد الملک ان روز شاہجہان آباد میں نہیں تھے۔ حکم کا پارہ چڑھ گیا۔"

"حضور عالیہ جلیلم! عہدہ جلیلم کے حکم پر ہم نواب صاحب کے لشکر میں حاضر تھے۔" طہماس خان نے اعتماد سے جواب دیا۔

"ہم سمجھتے ہیں نواب عماد الملک اس روز مراد آباد میں تھے۔" جلیلم کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے طہماس خان کے جواب پسند نہیں۔

"حضور! کا فرمانا درست۔" طہماس خان نے تسلیم کیا۔

"شہنشاہ معظم شاہجہان آباد میں قتل کئے گئے اور تمہیں مراد آباد پہنچنے کا حکم دیا گیا؟" وہ تفتیش سے اسے تھکا کا چاہتی تھی۔

"حضور! یہ غلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مراد آباد نواب حضور کی لشکر گاہ حاضر ہوا تو نواب حضور نے ہمیں خواجہ سرا عنبر علی خاں کے ہمراہ شاہجہان آباد کے لئے روانہ کر دیا۔ ہم ساری رات سفر کرتے رہے اور صبح شاہجہان آباد پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی ہمیں کوئلہ فیروز



مہر اہمیت تحت ہو گئی۔

”حضور کا یہ غلام بھوت بول کر مزید گنہگار نہیں ہونا چاہتا۔ خلد آشیانی اس غلام پر بہت مہربان رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اے امراء اور مہما جہوں میں خلد آشیانی مہدی علی خاں کشمیری پر سب سے زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ خلد آشیانی درویشوں اور بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ مہدی علی خاں نے خیر دی کہ افغان لشکر کے امراء ایک درویش قندھار سے شاہجہان آباد آئے ہیں اور کوئلہ کے بھنے رات میں چلے گئے۔ یہ ہیں اور بادشاہ قندھار ان درویش سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ مہدی علی خاں کشمیری نے خلد آشیانی کو ان درویش کے حضور حاضر ہو کر اپنے دراپنے بیٹوں کے لئے دعا کروانے کا مشورہ دیا تو خلد آشیانی آمادہ سفر ہو گئے اور اپنے داماد مرزا ہار اور چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر درویش کے حضور حاضر ہوئے۔ کہنے لگے قلعہ علی سے برآمد ہوئے۔ کوئلہ کے بھنے رات کے ایک گھنٹے میں ایک خست مکان کے سامنے پردہ لٹک رہا تھا۔ نور دروازہ سے گئے۔ سامنے چھ درویش مسکاتی کی حالت میں بیٹھے درویش رہے۔

شہنشاہ معظم نے سواری سے زمین پر قدم فرمایا تو مہدی علی خاں نے جھک کر حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ نور حضور سے اپنی تلوار ان کے سپرد کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ سائل درویش کے حضور تہوار سے کرپیش نہیں ہو سکتا۔ مہدی علی خاں نے پردہ اٹھایا شہنشاہ معظم اندر تشریف لے گئے۔ مہدی علی خاں نے مکان کا دروازہ مفتوح کر کے پردہ گرا دیا۔ مرزا ہار کا شہ گرا اور تلوار اس کے دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازے کے پاس درویش نے اسے روک دیا۔ درویشوں نے ان کو روکنا چاہا تو مرزا اسے دو تین گز دھکیں گرا دیا اور ان کی تلوار اور ہتھیار پھینک کر مشعلیں کس دیں اور پہلے سے وہاں موجود درویشوں کی پیشانیوں پر

”خوبی سرا امراء اور درباریوں نے شہنشاہ کے حضور تہوار سے گزرتا شروع کیا تو قلعہ علی میں خوشی کے شادیارے لگنے لگے۔ نصف شب تک ہم وہاں رہے اور پھر اپنے گھروں کے لئے روانہ ہو گئے اور طلوع آفتاب کے بعد جب ہم خوبہ سرا مہر علی خاں کے حضور حاضر ہوئے تو پتہ چلا کہ نواب النظام الدولہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ یہ ہمیں حکم دیا گیا کہ اس کے ساتھ نواب عماد الملک کی لشکر گاہ جاؤ، اس مجبوری سے ہمیں شاہجہان آباد سے باہر ہونا پڑا اور حضور کی قدم پائی کے لئے حاضر نہ ہو سکے۔“

”نواب النظام الدولہ کے قتل کی سازش میں مہر علی خاں کا ہاتھ تھا۔“ بیگم نے سوال کیا۔

”حضور کا یہ تہوار اس بارے میں سمجھ نہیں جاتا۔“ المہاس خاں نے شاہجہان خان کی طرف دیکھتے ہوئے دست بستہ عرض کیا۔

”حضور دربار فرما رہے تو غلام ایک شخص کو پیش کر رہا ہے۔ اس نے شہنشاہ معظم کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور نواب النظام الدولہ کی اجازت پچاسے لائی کہ شمشیر کی تھی۔“ شاہجہان خان نے عرض کیا۔

”غلطی بیگم نے خیرائی ہے اس کی طرف دیکھو۔“ امراء کی حاضری سے خوش ہوا۔ بیگم نے حکم دیا۔

شاہجہان خان کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو پھوٹے قد کا ایک سیاہ غلام نوابان اس کے پیچھے سر ہٹاتے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے خاص انداز میں نکت کر سلام کیا اور آنکھیں اپنے پاؤں پر گاڑ کر دست بستہ کمر ہو گیا۔ بیگم نے محسوس کیا کہ وہ درباری نواب سے اچھی طرح واقف ہے۔ نو جوان خاموش کھڑا رہا، بیگم نے اسے شک سے پاؤں تک جائز دیا اور گروٹ دیکھ کر اسے کھانسی کا ام قیاد دیا چاہتے ہیں کہ تھوٹے کی



بحرم وہ ٹھہریں گئے۔ وہ نواب وہاں سے نکال کر گئے۔ اور چھپانے پر آمادہ ہو گئے مگر ان کے ایسا کرنے سے پہلے مہدی علی خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ نواب صاحب کو ہلاک کرنے کے بعد وہ اس خانسارہ کو بھی قتل کر دیتے زندگی کے دن باقی تھے، میں ہنگامہ میں وہاں سے نکل کر چھپ گیا۔ اس روز سے بچھڑا پھر رہا ہوں، کشمیر کے مغیر مجھے ہارواؤں تھے پھر رہے ہیں، نہیں معلوم کب تک زندہ رہوں گا۔ وہ آہیں بھرتے لگا۔

بیگم نے میاں خوش فہم کو حکم دیا۔ "اس نوجوان کو مردانہ میں لے جاؤ اور اس کی حفاظت کا اہتمام کرو، یہ ہمارے پاس رہے گا۔"

نوجوان کی آنکھوں سے اشک کے آنسو رواں ہو گئے۔ "حضور نے اس غلام کو خرید لیا ہے۔" اس نے فرشی سا دم کیا۔

ظہماس خان ابھی تک سامنے دست بستہ کھڑا تھا، اس کے چہرے پر رونق آ گئی، نوجوان نے جو کچھ بتایا بیگم اس پر مطمئن دکھائی دیتی تھی۔

میاں خوش فہم نوجوان کے ہمراہ کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑا تو بیگم نے روک لیا۔ "اس بد نصیب کی حفاظت کرو، اس ننگے لڑکے کو قید میں ڈال دو۔" اس نے ظہماس خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ظہماس خان کے پہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ بیگم کے قدموں میں گر کر معافی کی درخواست کرنے لگا۔ یہ تکم کس جرم میں دیا جا رہا ہے اسے کچھ معلوم نہ تھا اور وہ اپنا جرم پوچھنے کی گستاخی بھی نہیں کر سکتا تھا، صرف رحم کی درخواست کر سکتا تھا۔

بیگم نے اس کی درخواست پر کوئی وعیان نہیں دیا۔ میاں خوش فہم نے خدام کو بلایا اور وہ ظہماس خان کو گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔

\*\*\*

گڑھ کے قلعہ کی شاہی جیل کی طرف روانہ کر دیا۔ چند منٹ بعد مکان کے اندر پہلے سے موجود مہدی علی خاں کے آدمیوں نے شہنشاہ معظم کی لاش باہر پھینک دی۔

نوجوان کی باتیں سن کر بیگم کے چہرے پر دکھ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ "نواب انتظام الدولہ کو کس نے قتل کیا؟" بیگم نے اس سے پوچھا۔

"مہدی علی خاں کا شیریں نے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"چونکہ حضور کا یہ غلام اس ہلاکت میں شامل نہیں ہوا۔"

بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم ہلاکت میں شامل نہ ہوئے تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انہیں کس نے قتل کیا؟"

"شہنشاہ معظم اس غلام پر بہت شفقت فرماتے تھے جب انہوں نے درویش کے حضور حاضری کا فیصلہ کیا تو یہ غلام وہاں موجود تھا اور حضور کے جلموں کے ساتھ ٹولہ گیا تھا۔ خلد آشیانی کو اس مکان میں داخل ہوتے اور ان کی لاش باہر پھینکتے خود دیکھا تھا جب نواب حضور کے قتل کے ارادہ کا علم ہوا تو اس غلام نے نواب حضور کی جان بچانے کی کوشش کی مگر پیچھے نہ کر سکا۔" نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپائیں۔

بیگم غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی، جب وہ آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھا کر پھر اپنے قدموں کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ "نواب انتظام الدولہ حراست میں تھے، تم نے کیسے کوشش کی انہیں بچانے کی؟"

"رات گزرنے والی تھی، نواب مرحوم کے کمرے پر پہرہ دینے والے حضور کے اس غلام کے دوست اور ساتھی تھے۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا اور کہا کہ قتل کے

READING  
Section



اور بہار کے احمد خاں بگمش نے ابھی تک جہاد میں شامل ہونے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ مرہٹوں سے لڑا کر اس میں مصروف تھے اور مسلمانوں کے اجتماعی سناہ کی بجائے اپنے اپنے ذاتی مفادات کی شطرنج کی چالوں پر غور کر رہے تھے۔

مغلانی بیگم عماد الملک کو مرہٹوں سے الگ کر کے ابدالی کے کیمپ میں لانے کی خیمہ سفارت کاری میں مصروف تھی۔ "اگر عماد الملک بادشاہ معظم کے حضور حاضر ہوں تو مرہٹوں کا ہندوستان پر حکومت کا خواب منقش ہو جائے گا۔" بیگم نے ملک سجاد کو اپنا بازو اور سفیر بنانے کی خاطر اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ "عماد الملک کی حاضری کے بعد باقی مسلمان حکمران خود بخود بادشاہ کے حضور پیش ہو جائیں گے اور سب کی قوت میں کر مرہٹ قوت کو ختم کر دے گی۔"

"حضور کا خیال بہت مناسب ہے لیکن مرہٹوں کو عماد الملک نے بلایا ہے، وہ ان سے کیسے الگ ہو جائے گا۔" ملک سجاد نے جواب دیا۔

"اگر بادشاہ معظم اس کی خطا معاف فرمانے کا یقین دلا دیں تو وہ لازماً ان کی قدم پوسی کے لئے حاضر ہو جائے گا۔" بیگم نے ملک سجاد کو اپنی آرزو سے آگاہ کیا۔

"بادشاہ معظم نجیب الدولہ اور علمائے کرام کے مشورہ اور تائید کے بغیر عماد الملک کو معاف نہیں فرمائیں گے۔ شاہجہان آباد کے علماء اور روہیلہ سرور نواب الملک کو مسلم ملت کا مجرم سمجھتے ہیں۔" ملک سجاد نے کوئی لگی پٹی رکھے بغیر جواب دیا۔

"ہم اس سے اختلاف نہیں کرتے مگر عماد الملک کی خطائیں معاف کر دینے میں ہندوستان کی ساری مسلم ملت کا فائدہ ہے۔" بیگم نے وضاحت کی۔

"بادشاہ معظم نواب عماد الملک کو معاف کرنے بھی

مانگھ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، شمال کی سردی سے شاہجہان آباد کے میدانی علاقے میں درجہ حرارت بہت گر گیا تھا، احمد شاہ ابدالی کا لشکر دارا حکومت سے باہر لوٹی میں خیمہ زن تھا، نجیب الدولہ اور ان کے ساتھ روہیلہ سروروں کی فوجوں نے شاہی لشکر گاہ کے قریب ڈیرے جمائے تھے۔ دوسری طرف مرہٹ اور عماد الملک اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑے تھے اور قلعہ معلیٰ میں نئے شہنشاہ شاہجہان ثالثی اپنی شہنشاہیت کے چالیں روز کھیل کر چکے تھے۔ قلعہ کی فصیلوں کے اندر عماد الملک کے مقرر کردہ قلعہ دار کی حکومت تھی اور فصیلوں سے باہر شہر پر کوئی حکمران نہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے شاہجہان آباد کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملنے پر بھرت پور کے راجا سورج مل نے شہر کی حفاظت کے لئے جو فوج بھیجی تھی شاہ کے جتنا عبور کرنے کی فکر سمجھتے ہی وہ خاموشی سے واپس چلی گئی تھی۔

دونوں فوجوں کے درمیان برابری گھاٹ کے تین پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔

مغلانی بیگم شاہجہان آباد سے لوٹی منتقل ہو گئی تھی، اس کا ڈیرہ بادشاہ معظم کی خیمہ گاہ سے باہر شاہ دلی خاں کی لشکر گاہ کی طرف تھا۔ بادشاہ معظم کے دریا پار اترنے کے اگلے ہی روز وہ شاہی لشکر گاہ میں پہنچ گئی تھی، اس کی آمد کی اطلاع پا کر بادشاہ معظم نے اپنے فوجی سرداروں کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا تھا اور ان کے ڈیرے پر حفاظت اور خدمت کے لئے افغان خدام محافظ بھجوا دیئے تھے۔ شاہ دلی خاں بیگم کے حضور حاضری دے چکا تھا مگر وہ بادشاہ معظم کے حضور شرف باریابی سے ابھی محروم تھی۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کے تمام مسلم صوبیداروں اور علاقائی حکمرانوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اودھ کے شجاع الدولہ



نہیں۔" ملک سجادوں کے قاسم کو ہدایت کی۔ ان کے ساتھیوں نے گھنی جھڑیوں کے اوپر چھوٹی سی تریپاں ڈال کر اس کے آرام کے لئے جگہ بنائی اور تھیلے سے خشک پیرے نکال کر پیش کئے۔

"سرور ادا عا کر میں صبح تک بارش اور طوفان ایسے ہی رہیں۔" قاسم نے وراج ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھیوں نے اس کی آواز سنی مگر رات کے اندھیرے میں مسکراہٹ نہ دیکھ سکے اور خود گھنے جنگل میں غائب ہو گئے۔

احمد شاہ ابدانی نے موسم کی سردی اور رات کی سیاہی کے پردہ میں دریا کے اس پار فوجیں اتارنے کی تیاری کر کے ملک سجادوں کو جزیرہ پر قبضہ اور دریا کے دوسرے کنارے پر موجود مرہٹہ محافظوں پر شب خون مارنے والے دستہ کی گمان سوچ دی تھی۔ راوی اور ان کے کناروں پر جنگل سے ان کی آشنائی کی وجہ سے ان کے ساتھیوں کی نسبت سے اس کام کے لئے اور کوئی بہتر نہ تھا۔ افغان دریاؤں اور دریائی جنگلوں کے سفر اور مزاج سے آگاہ نہ تھے اس لئے انہیں سب سے آخر میں تہور کرنا تھا۔ ملک سجادوں کے دستہ کے بعد نجیب الدولہ کی ردہ بلہ فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ملک سجادوں گھنی جھڑیوں میں بیٹھا واقعی بارش اور طوفان کی عمر درازی کی بارخلوں و عانیس مانگ رہا تھا۔ دریا کے مغربی کنارے پر مرہٹہ فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ شاہجہان آباد کی طرف آگے بڑھ کر بھرت پور کے اجا کو سرا انیس دے سکتا تھا۔ مرہٹہ سردار آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے شاہ کے عقب میں رہ کر ان کے مزید فوجوں کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔

ملک سجادوں کے گرد اس کے مسلح ساتھی پیہرہ دستہ رہے تھے۔ بجلی چمکتی تو ان کے نیزوں اور تلواروں کی چمک میں آنکھیں چندھیانا شروع ہو جاتیں۔

آرٹا چنے ہیں، اب شاید آرٹا مانا پسند نہ فرمادیں۔ اس کی شبانہ و عاکسیر ٹائی اور غائب انتظام الدولہ کے قتل کا لاشم بھی ہے۔ شہزادہ غنی گوہر کے پیام رساں نے بادشاہ معظم کے حضور جو مراسلہ پیش کیا ہے اس میں شہزادہ نے نواب عماد الملک پر بہت سے الزاماتہ لگائے ہیں اور بادشاہ معظم سے درخواست کی ہے کہ عماد الملک پر اعتبار نہ کیا جائے۔"

"عماد الملک ہمارا فرزند ہے مگر ہمیں ملت کا مفاد اس کی جان سے عزیز تر ہے۔ ہم ملت کے اکابرین اور علمائے کرام کی رائے کے خلاف نہیں جاسکتے۔" بیگم نے جب دیکھا کہ ملک سجادوں اس کے لئے کسی سفارت کاری پر آمادہ نہیں تو اس نے پانسہ پلٹ دیا۔

"حضور کا اپنا مفاد ملت کے مفاد سے وابستہ ہے۔ نواب عماد الملک نسبتے اور حضور کے مفاد کو بھی نہ سمجھ سکا۔"

ملک سجادوں کے جواب پر بیگم اپنے اور اپنے داماد کے مستقبل کے بارے میں گہری فکر میں ڈوب گئی۔

\*\*\*

جمنائے رخ پانی میں قدم جمانے کی کوشش میں رات کی سیاہی بھی تنہا رہتی ہو گئی تھی۔ آسمان سے برسنے والی پانی کی دھاریں جمنائے پانی سے ہم وجود ہونے سے پرسکون پانی میں نہریں اٹھنے لگی تھیں۔ دریا کے دو دھاروں کے درمیان چھوٹے سے جزیرے پر اگے جنگلی درخت اور پودے نمٹتی ہوئے تھیں۔ پھیلروں سے دوسرے ہو ہو جاتے تھے۔ ملک سجادوں نے اپنا گھوڑا ایک مضبوط بھاری سے باندھ دیا، ملک قاسم اور اس کے ساتھی اپنا گھوڑوں کی رگ میں تھامے اس کے گرد کھڑے تھے۔ بارش کے پانی سے دوسرے پاؤں تک بھیگ چکے تھے۔

"اپنے اپنے گھوڑے باندھ کر جزیرے کی پوری لمبائی کا جائزہ لیں کہ دشمن کا کوئی دستہ تو کہیں چھپا ہوا

READING  
Section



ساتھیوں کو واپس بھیج دیا اور باقی سب کنارے کے آگے ریت میں موہ سپے بنانے میں مصروف ہو گئے۔

صبح صادق کا اجالا پھیلنے سے پہلے نجیب الدولہ نے ساری فوج جزیرے پر پہنچ چکی تھی اور ملک سنبھال اپنے دستہ کے ساتھ دریا کے اس پار جنگانی صورت حال کے لئے تیاری مکمل کر چکا تھا۔ افغان فوج کے توپچی دو توپیں مناسب فاصلہ پر نصب کر کے اپنی مصروفیت تھیں۔

بارش رک گئی، مریہ لشکر کے ساتھ آئے۔ برہمن صبح کا اجالا ہونے کے ساتھ ہاتھوں میں گڑیا لیا لئے بننا کے پانی میں نشان کے لئے لشکر گاہ دستہ برآمد ہوئے اور تھوڑی دور چل کر رک گئے۔ ان کے ساتھ آئے والے محافظوں نے دریا کے کنارے موجود سیاہیوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ "افغان... افغان!" چلائے۔ لشکر گاہ کی طرف دوڑ پڑے۔

اس کے ساتھ ہی مریہ لشکر گاہ میں طبل جٹ بننے لگا۔

نجیب الدولہ کے دوہیلہ سواروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔

احمد شاہ ابدانی بھی تہذیبی لحاظ سے بعد اپنے دستہ کے ساتھ جزیرے پر پہنچ گیا تھا۔ جب مریہ لشکر گاہ میں طبل جٹ بلند ہوا تو وہ جنگی چھار یوں پر تپا لیں۔ ان کے بنائے گئے خیمہ شاہی میں فوجی غماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا اور افغان اسے دریا میں کودنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

نجیب الدولہ کے چادہ دستے ابھی دریا میں ہی تھے کہ مریہ سوار اور پیادہ جنگی ترتیب کے ساتھ لشکر گاہ سے باہر نکل آئے۔ چھاپہ مار جنگ کی تربیت اور تجربہ کی بناء پر مریہ دستے بہت تھوڑے وقت میں ہتھیار لگا کر میدان اتر سکتے تھے۔

سورج نے ہنسا کنارے کی چھاپہ مار جنگ میں

سیاہ رات میں جنگی چیتے کی مانند گھنے جنگل اور جھانڑیوں میں راستہ بناتے دسبے قدموں ملک قاسم کے۔ تجھی جزیرے کے دوسرے کنارے پہنچ کر جھانڑیوں سے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے اور بجلی کے چمکنے کا انتظار کرنے لگے۔ ان کی اندھیرے پر جنگلوں سے آشنا آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں۔ آج وہ شکار کی نہیں دشمن کی تلاش میں تھے اور دریا عبور کرنے کے منصوبہ کی کامیابی کا دار و مدار ان کی کامیابی پر تھا۔

قاسم نے اپنے ساتھیوں کو چار چار کی ٹولیوں میں جزیرہ کے کنارے کا جائزہ لینے بھیج دیا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" اس نے انہیں رخصت کرتے وقت ہدایت کی۔

بجلی چمکتی تو دریا کے پانی کی سیاہ چادر کو آتشیں آری کی مانند چیرتی ہوئی گزر جاتی اور دریا پر دور تک روشنی پھیل جاتی لیکن دوسرے کنارے پر کسی کی موجودگی یا سرگرمی کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھیوں نے واپس آ کر جزیرے کے کھلے طور پر محفوظ ہونے کی خبر دی تو اس نے سب کو مبارک دینی اور کچھ ساتھیوں کو سہارا کو آگاہ کرنے بھیج کر باقی ساتھیوں کے ہمراہ بج بستی پانی کے سینے سے چمٹ گیا۔ دریا کی لہریں طوفانی نہیں برساتی تھیں، تھوڑی دیر میں وہ دوسرے کنارے ٹھنڈی ریت پر لیٹے اپنے ارد گرد کا جائزہ لے رہے تھے۔

گھاٹ کے محافظ مریہ سوار سہانی کی لشکر گاہ دریا سے تھوڑے فاصلہ پر تھی۔ بارش اور آندھی کے طوفان میں بھی اس کے خیمے کے سامنے اونچائی پر نقلی جمع کی روشنی لشکر گاہ کی نشاندہی کرنے کو کافی تھی۔ آسمانوں پر ڈیوٹی دینے والے فرشتوں نے گرج اور چمک سے ان کا کام آسان بنا دیا۔ دریا کے کنارہ سے لشکر گاہ تک انہیں کہیں کوئی محافظ دستہ دھالی نہ دیا تو اس نے اپنے دو



جی اپنے ریزرو دستوں کے ساتھ لڑائی کے میدان میں اترے تو مرہٹہ فوج پہلے ہی میدان سے بھاگنا شروع ہو چکی تھی۔ ملک سجاد کے ایک ساتھی کے وار سے جنگ بندی کا بازو ٹٹک گیا، اس کے محافظ اسے بھیج کر میدان جنگ سے نکال لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مرہٹہ سوار اور پیادہ جدھر کوراستہ ملا بھاگنا شروع ہو گئے۔

مسلمانوں نے چائیس میل تک بھاگتے ہوئے مرہٹہ پیادہ اور سواروں کا پیچھا کیا، میدان جنگ میں دور دور تک مرہٹوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جن میں داتا جی اور بہت سے دیگر مرہٹہ سرداروں کی لاشیں بھی تھیں۔

ملاوا ملک لڑائی میں مرہٹوں سے پیچھے تھا، بھاگتے وقت وہ اپنے غفل دستوں کے ساتھ سب سے آگے تھا مگر وہ سنا بھان آباد نہیں گیا اپنی فوج کے ہمراہ سوج مل جاٹ کے ہاں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔

عشاء کی نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کے خیمہ خاص میں سب سے پہلے نجیب الدولہ نے شاہ کو داتا جی کا سر پیش کیا۔ اس کے بعد ملک سجاد نے چھوٹے قد کا ایک سیاہ روٹو جوان بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ یہ بہت باہمت نوجوان ہے، شدید بارش سردی میں اور طوفان میں یہ اکیلا دریا پار کر کے عماد الملک کے لئے حضور مغلائی نیگم کا مراسلہ لے کر گیا تھا۔

نوجوان سر جھکائے کھڑا تھا۔

"مابدولت جانا چاہتے ہیں کہ نیگم صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے کیا پیغام بھیجا تھا۔" بادشاہ نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نوجوان نے قرشی سلام کیا اور آنکھیں اور سر جھکا کر جواب دیا۔ "خلل الہی کا غلام پیغام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ حضور نیگم صاحب نے مہر بند مراسلہ دیا تھا جو اس غلام نے حضور نواب صاحب کو پہنچا دیا۔ انہوں نے جو مراسلہ دیا وہ حضور کے پاس ہے۔" اس نے ملک

کی لڑائی افکارہ کرنے کو بادلوں کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو مرہٹہ سواروں کے خیمے اور برچھیاں ٹپکنے لگے۔ وہ قطاریں باندھے تیزی سے کنارہ دریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک سجاد کے ساتھی اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ افغان توپچی گولے برسائے گئے تھے مگر مرہٹہ سوار آگے بڑھتے رہے۔ نجیب الدولہ کی فہم میں وہ سیلہ سوار اور پیادہ دریا کے کنارے قدم جما کر دائیں اور بائیں سے دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تو ملک سجاد پر دباؤ کم ہوتا شروع ہو گیا۔ وہ مرہٹہ دستوں میں جا گھسے۔ مرہٹہ دستے پیچھے ہٹ رہے تھے کہ مرہٹہ فوجدار داتا جی اپنے لشکر کے ساتھ ساتھی کی مدد کو پہنچ گئے۔ ایک بار پھر لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا مرہٹوں کے تیار توڑ حملوں کی شدت سے روئیلہ سپاہی پیچھے ہٹنے لگے مگر پیچھے جتنا بہہ رہا تھا، جما کے دریا ان جزیرے پر گھرا احمد شاہ ابدالی لڑائی کا جائزہ لے رہا تھا اس کے توپچی جزیرے پر بھی توپیں نصب کر چکے تو مرہٹہ توپوں کا جواب توپیں دینے لگیں۔ مرہٹوں کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ گواہیں، خیمے، برچھیاں، بندوقیں اور توپیں چل رہی تھیں۔ مرہٹہ سالار، سردار اور سوار بہت بہادری سے لڑ رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے توپچیوں کو مرہٹہ فوج کے عقب میں گولے پھینکنے کا حکم دیا کیونکہ مرہٹہ اور مسلمان ایک دوسرے کی لائنوں کے اندر تک گھسن آئے تھے۔ بادشاہ کے حکم پر افغان دستے نجیب الدولہ کی مدد کے لئے آگے بڑھے تو پھر سے قطاریں درست ہونے لگیں۔ مرہٹہ سالار داتا جی لڑنے والوں میں سب سے آگے تھا، ایک افغان پیادے نے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر داغا تو گولی اس کی آنکھ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اپنے سالار کو گرتا دیکھ کر مرہٹوں نے اسے اٹھالے جانے کی کوشش کی مگر افغان نے اپنے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ سالار کی موت کے بعد مرہٹہ دستے ہٹنا شروع ہو گئے۔ جب مرہٹہ فوجدار جنگ



لئے معافی کی درخواست پیش کرنے کی بھی خواہش رکھتی ہیں۔“ ندیم خاص نے عرض کیا۔

”یہ درخواست گزار تان کا مادرانہ فرض ہے۔ یہ درخواست نہ سننا ہمارا عاوانہ فرض۔ لی وال ملک ہمارا تان مسلمانان ہند کا مجرم ہے، اسے ہم معاف نہیں کر سکتے۔“ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا۔

”مابدولت اس نوجوان کو انعام کے لائق سمجھتے ہیں۔“ بادشاہ معظم نے نوجوان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا۔

”حضور کے ارشاد مبارک کی تعمیل اس غلام پر فرض ہے۔“ ندیم خاص نے نوجوان کو خیمہ شاہی سے باہر لے جانے اور انعام سے نوازنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے ملک سجاد کو بتا دیا تھا کہ وہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کے اور انتظام الدولہ کے قتل کا یقینی شاہد ہے مگر اس نے بادشاہ معظم کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔

خادم نوجوان کو خیمہ شاہی سے باہر لے گیا۔

\*\*\*

شاہجہان آباد کی گلیاں اور بازار دیران تھے۔ دکانیں بند تھیں اور خوفزدہ لوگ اپنے اپنے گھر میں بند تھے۔ براری گھاٹ کی فتح کے بعد بہت سے افغان سوار شاہجہان آباد میں داخل ہو کر لوٹ مار میں مصروف ہو گئے تھے۔ شہنشاہ ہندوستان شاہجہان کافی قلعہ معلیٰ میں بند تھا۔ شہر میں نہ کوئی ناظم تھا، نہ نظم اور نہ حاکم۔ افغان سوار جس مکان اور حویلی کو چاہتے لوٹ بیٹھتے تھے۔ بادشاہ معظم ابھی شہر سے دور تھے انہوں نے شہر میں امن کے تحفظ کے لئے ساکنی باشی کو دستے بھیجنے کا حکم دیا تھا مگر شہر کا کوئی حاکم مقرر نہیں کیا تھا۔ امراء، شرفاء اور عام لوگ سب خوفزدہ تھے۔ افغان سوار اور پیادے نوجوان کی صورت میں شہر میں گھوم پھر رہے تھے اور جس گھر میں مال و متاع کا شبہ ہوتا تھا، اس میں ٹھس جاتے تھے۔

سجاول کی طرف اشارہ کیا۔

ذنب نے مہر بند لغافہ ندیم خاص کو پیش کر دیا۔

”حضور کے حکم کے بعد جب ہم رات جزیرہ پر اترے تو مرہند لشکر کی طرف سے یہ دریا عبور کر رہا تھا۔ قاسم نے پکڑ کر سلامی لی تو اس کی صدرنی کے نیچے سے یہ مراسلہ ملا۔“

بادشاہ نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔

”مابدولت اس کی ہمت اور وفاداری کی قدر کرتے ہیں۔“

نوجوان کے چہرے پر پھائی مردنی عائب ہونے لگی۔

ندیم خاص نے بادشاہ معظم کی اجازت سے مراسلہ چاک کر کے عرض نیگی باشی کی طرف بڑھا دیا۔

”مادر محرم کا ارشاد ہمارے لئے حکم شہنشاہی سے بڑھ کر ہے، ہم خدا سے بزرگ کے شکر گزار ہیں کہ ہمیں حضور کی شفقت اور دعائیں میسر ہیں۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ مضور کے ارشاد پر عمل نہیں کر سکتے۔ بادشاہ معظم کے ارادہ مبارک کا ہمیں علم نہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ تحت ہندوستان پر اپنے فرزند کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد نجیب الدولہ وزیراعظم ہندوستان ہوں گے۔ ہمارے لئے ایک ایسی راستہ ہے کہ ہم مرہنوں کی قوت کے ذریعے ہندوستان کی مغل شہنشاہیت کا تحفظ کریں۔ ہم حضور عالی کے شکر گزار ہیں اور حکم عدولی کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ حضور مادرانہ شفقت سے ہمیں معاف فرمادیں گے۔“ عرض نیگی باشی نے بند آواز میں مراسلہ پڑھ کر سنایا۔

بادشاہ کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ”مابدولت مغلانی بیگم کے مشورہ اور کوششوں پر خوش ہیں انہوں نے اپنے بد بخت اور بد فطرت فرزند کو وہی مشورہ دیا ہو گا بنو ایک ماں کو دینا چاہئے۔“

”بیگم صاحبہ بادشاہ معظم کے حضور نکاح الملک کے

READING  
Section



کر رکھی اور گل بنفشہ کو معاضری کے لئے ان کی حویلی میں آنے کی اجازت دینے سے سختی سے منع کر دکھا تھا مگر شاہی لشکر گاہ سے واپسی پر گل بنفشہ اور اس کے بچوں کو انہوں نے اپنی حویلی میں منگوا لیا تھا۔

”ہم نے جس پر احسان کیا اس نے انہیں دکھ دیا۔ اس نمک حرام پر سب سے زیادہ احسان کیا اس نے ہمیں سب سے زیادہ دکھ اور دھوکہ دیا اور فریب کاری سے اپنا جرم چھپایا۔ جنوں سے قافلہ کے ساتھ آئے واپس ہمارے خدام نے اسے بار بار بتایا کہ ہماری حویلی سے فرار ہونے والی کنیز اس قافلہ میں موجود ہے اور اس بد فطرت محبت کے پاس جا رہی ہے۔ ہمارے خدام نے اس کی تلاشی کا مشورہ دیا مگر اس نمک حرام نے کسی کا مشورہ نہ مانا اور اس فاحشہ کو اس کے عاشق خوجہ سرا کی حویلی پہنچا دیا، ہم اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔“

گل بنفشہ نے اپنا دوپٹہ اسٹار کر بیگم کے پاؤں میں رکھ دیا۔ ”حضور نے اپنی کنیز کا سر ڈھانپا تھا، حضور کی خوشی کے لئے کنیز باقی زندہ کی بجائے سر گزارے گی۔“

بیگم جھکی اور دوپٹہ اٹھا کر گل بنفشہ کے سر پر ڈال دیا۔ ”تم اپنے خاندان کی نیک مائی پر کسی کنیز کے بنگے سر کا داغ نہیں دیکھ سکتے۔“

گل بنفشہ نے سر پر وہ پندہ درست کیا اور بیگم کے قدموں میں گر گئی۔

بیگم نے طہماس خان کو قید سے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

\*\*\*

اہل شاہجہان آباد احمد شاہ ابدالی کے منتظر رہے کہ وہ کب قلعہ محلہ میں نزول فرما کر اپنے بیٹے کو ہندوستان کے تخت پر بٹھاتے ہیں۔ غلامے کرام نے ایک بار پھر ان سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان میں قیام فرمائیں اور نامزد مغل شہنشاہیت ختم کر دیں۔ اختصار اور سہولتوں

مغلانی بیگم نے ایک ہاتھی منگوا لیا، اپنا دستہ ساتھ لیا۔ وہ ہاتھی پر سوار شاہجہان آباد کی گلی گلی گھومنے لگی۔ وہ امراء اور شرفاء کے حرم اور بچوں کو ان کے گھروں اور حویلیوں سے نکال نکال کر اپنی اور اپنی خوشدامن سالار پوری بیگم کی حویلی میں جمع کر رہی تھی جن کی حفاظت کے لئے افغان دستے متعین کر دیئے گئے تھے۔ لڑائی کے دوسرے روز صبح ہی وہ شاہی لشکر گاہ سے شاہجہان آباد پہنچ گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ملازمین اور خدام کے بال بچوں کو ان کے گھروں سے نکال کر اپنی حویلی میں جمع کیا اور پھر امراء اور شرفاء کے اہل خانہ کو محفوظ مقامات پر پہنچاتے گئی۔ بیگم کی سواری دیکھ کر افغان پیادے اور نواز چھپ جاتے اور اہل شہر سکھ کی سانس لیتے۔ شہنشاہ ہندوستان کو بتایا گیا تو اس نے خصوصی ایچی کے ہاتھ بیگم کے لئے تعریفی سند ارسال کی۔

ایک شام شہر کے معاند سے واپس آئی تو گل بنفشہ قدموں میں گر گئی۔ ”حضور کے احسانات کے بوجھ سے کنیز کے لئے سر اٹھانا دشوار ہے۔ اس کے بچوں پر کرم کر کے انہیں بھی اپنے احسانات سے ہمیشہ کے لئے ندامت بنالیں۔“ اس کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں۔

”ہم نے اس پر احسان کیا، اس نے نمک حرامی کی ہماری کنیز کو چھپا کر جنوں سے شاہجہان آباد لایا اور اس بد فطرت خوجہ سرا کے گھر پہنچا دیا۔ ہم اس کا یہ جرم معاف نہیں کر سکتے۔“ بیگم نے غصہ سے کہا۔

”حضور کی یہ کنیز طہماس خان کی صفائی دینے کا جرم نہیں کر سکتی۔ اپنے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دینے کی درخواست لے کر آئی ہے۔ حضور نے اس کنیز کی کبھی کوئی درخواست مسترد نہیں کی۔ یہ درخواست قبول فرما کر اپنے کرم کی روایت جاری رکھیں۔“

طہماس خان کو قید کرنے کا حکم دے کر اس کے بیوی بچوں کی آجہ بھائی بیگم نے اپنے خوجہ سرا کے سپرد



گارنٹی شدہ

پائیدار

نویسورت

سب اچھا لگا مگر بات ان سے بنی

سیلنگ فین، پیڈسٹل فین، بریکٹ فین، ایگزاسٹ فین



U.I INDUSTRY

183-C, S.I.E. G.T. ROAD, GUJRAT PAKISTAN.

PH:+92 53 3535901-3535902 E-mail: starco@grt.wol.net.pk

www.cooperfans.com info@cooperfans.com

READING  
Section

SCANNED BY AMIR



لشکر گاہ میں ڈیرہ جمائے کا سامان تو تھا مگر کسی نرانی اور لشکر میں جانے اور وہاں پر ڈیرہ جمائے والا کوئی مرد باقی نہیں تھا۔ بوڑھی نواب شولا پوری بیگم عمر اور صدموں کے ہاتھوں اس قابل نہ تھیں کہ وہ کسی لشکر گاہ کا سفر کر سکیں۔

”مغلانی بیگم صاحبہ! بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے ساتھ مل کر جہاد کے لئے جائیں گی۔ قافلہ کی تیاری کی نگرانی کرنے والے خدام نے بتایا۔“ انہوں نے سوار بھرتی کر لئے ہیں اور ہم ان کے لئے شاہ کی لشکر گاہ میں ڈیرہ قائم کرنے جا رہے ہیں۔“

صوبیدار کو خوشی ہوئی کہ مرہٹوں کے خلاف بادشاہ معظم کے جہاد میں مغلانی بیگم کی شرکت سے شاہجہان آباد کے امراء بھی شریک جہاد ہوں گے اور ہندوستان کے جو مسلمان صوبیدار اور عالم ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ کس کا ساتھ دیں انہیں مرہٹوں کے خلاف جہاد میں شامل کرنا آسان ہو جائے گا۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی، ماگھ کی سردی عروج پر تھی، بیگم صاحبہ آرام فرما رہی تھیں، وہ واپس آ گیا۔

\*\*\*

مدرسہ رحیمہ کے طلباء اپنے چمڑوں سے باہر نکل آئے۔ نواب نجیب الدولہ اپنے روسیہ سرداروں کے ہمراہ ولی اللہ کے حضور حاضری کے لئے آئے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے تشنہ اور مسلم حکومت کے تحفظ کے لئے شاہ ولی اللہ کی درخواست پر جو مسلمان امراء میدان جہاد میں نکلے تھے ان میں نجیب الدولہ سب سے نمایاں تھے۔ مرہٹے انہیں پارے ہندوستان میں مرہٹہ حکومت کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور سارے مسلمان اور ہندو راجوں اور حکمرانوں کو ان کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مرہٹوں نے نجیب الدولہ کو ہندوستان سے نکال دیا۔

کی قوت کا خاتمہ کر کے مسلمانوں اور مسلم سلطنت کا تحفظ کریں مگر بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ شاہجہان آباد سے باہر نہیں رہے انہوں نے عماد الملک کے تخت تیموری پر بٹھائے شہنشاہ بحر و بر شاہجہان جانی کے مقام و احترام کے منافی کوئی اقدام نہیں کیا۔ شہر میں امن و امان اور نظم کے قیام کے لئے بادشاہ نے ایک شاہجہانی افغان امیر کو صوبیدار مقرر کر دیا اور شہر کے پاس سے گزر کر پانچ میل جنوب میں خضر آباد کے مقام پر جا کر خیمے گاڑ دیئے۔

صوبیدار یعقوب خان ساری رات شاہجہان آباد کی گلیوں اور بازاروں کا گشت کرتا رہا، اس نے شہر کے دروازوں پر مسلح دستے بٹھا دیئے تھے تاکہ کوئی افغان سپاہی شہر میں داخل نہ ہو۔ وہ دن کو لوگوں کی شکایت سنتا، ان کی بھائی کے اقدامات کرتا اور رات کو گلی گلی گھوم کر امن و حفاظت کے انتظامات کا جائزہ لیتا۔

ایک رات کے پچھلے پہر وہ اپنے دستہ کے ہمراہ نواب شولا پوری بیگم کی حویلی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ حویلی میں شمعیں روشن نظر آئیں۔ اس نے گھوڑے کی ناک میں کھینچ لیں۔ نواب انتظام الدولہ کے قتل کے بعد سے نواب شولا پوری بیگم اور ان کی حویلی شاہجہان آباد میں عبرت کدہ بن چکی تھی۔

”یہ شمعیں کس لئے روشن ہیں؟“ اس نے اپنے دستہ کے سوار کو مہلوم کرنے کا حکم دیا۔

اس نے واپس آ کر بتایا کہ بیگم صاحبہ کے خدام ہاتھیوں اور اونٹوں پر سامان لا رہے ہیں۔

یعقوب خان نے اپنے سپاہی حویلی کے دروازہ پر متعین کر دیئے اور خود حویلی میں چلا گیا خدام صوبیدار کو اپنے درمیان میں دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے انہیں تسلی دی اور پوچھا کہ سامان سفر کیوں تیار کیا جا رہا ہے۔ خدام ہاتھیوں اور اونٹوں پر خیمے قائم اور فرش ڈیرہ کے لئے چھڑائی جا رہے تھے۔ اس حویلی میں جنگی



شیخ الحدیث ملک سجاد سے مخاطب ہوئے۔  
 ”عمل اور علم میں اولیت کسے حاصل ہے؟“ روہیلہ  
 سرداروں کی آمد سے بے نیاز وہ اپنے حجرہ میں کسی کتبہ پر  
 بحث کر رہے تھے۔

”علم عمل کو جنم دیتا ہے، اس کو جان لینے کے بعد  
 اولیت کی بحث ختم ہو جاتا چاہئے۔“ ملک نے جواب  
 دیا۔

”تخلیق عمل ہے، علم اس کے بعد آیا۔“ شیخ نے  
 اعتراض کیا۔

”مرحلہ تخلیق سے بھی پہلے علم تخلیق اور مقصد تخلیق  
 موجود تھا۔“ ملک سجاد نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

شیخ الحدیث کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”عملی اور علمی جہاد کی اولیت کی ترتیب بھی یہی ہے اور  
 عمل کی علم کے حضور حاضری سے ہمارے جہاد کا مقام  
 متعین ہو جاتا ہے۔ ہم ان طلباء کو علم کے جہادی  
 ہتھیاروں سے مسلح کر کے ہندوستان کے کونے کونے  
 میں پھیلا دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ ہر جگہ نواب نجیب  
 الدولہ جیسے عملی جہاد کرنے والے تیار کر سکیں۔“

”شیخ میں یہ کہنے کے لئے معافی کا خواستگار ہوں  
 کہ جب تک یہ طلباء ہندوستان کے کونے کونے میں  
 پھیل کر علمی جہاد کے مراکز قائم کریں گے ہندوستان  
 میں عملی جہاد کا مرحلہ گزر چکا ہوگا، کفر کی گھٹائیں چھا  
 جانے کے بعد چند شمعیں انہیں بجھائیں سکیں گی۔“ ملک  
 نے کہا۔

”اس وقت یہ درجن نو جوان جہاد میں شامل نہ بھی  
 ہوں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں، اگر یہ علم کا جہاد  
 ترک کر دیں تو ہمارے ملی مستقبل پر بہت ناگوار اثرات  
 مرتب ہوں گے۔“

شیخ الحدیث کی وضاحت پر ملک مسکرایا۔ ”حضور علم  
 اور عمل کے اجتماع تک معاونت فرمائیں تو خاکسار پر کرم

کر گویا کے کنارے ایک قلعہ میں کئی ماہ تک محصور رکھا تھا  
 اور روہیلہ سردار حافظ زمست اللہ کو پیش کی تھی کہ اگر وہ  
 نجیب الدولہ کے خلاف ان کا ساتھ دے تو وہ ریاست  
 روہیلہ کنڈ کی ہاکیمیت ان کے حوالے کر دیں گے اور اس  
 کے تحفظ کی ضمانت فراہم کریں گے۔ روہیلہ سردار نے  
 اپنے نواب نجیب الدولہ کے خلاف مرہٹوں کا ساتھ  
 دینے سے انکار کر دیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی اطلاع  
 پر مرہٹے نجیب الدولہ کے قلعہ کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو  
 گئے تو نجیب روہیلہ سردار اپنی اپنی فوجوں کے امراء احمد  
 شاہ ابدالی کی فوجوں کے ساتھ جا شامل ہوئے تھے۔

اس وجہ سے شاہ ولی اللہ نجیب الدولہ اور ان کے  
 روہیلہ سرداروں کے جذبہ اور خلوص کی بڑی قدر کرتے  
 تھے۔

شاہ ولی اللہ کا میدان جہاد علمی تھا۔ مدرسہ رحیمہ  
 کے طلباء ان کے فلسفہ جہاد کے مبلغ تھے، وہ ابھی عملی جہاد  
 میں شامل نہیں ہوئے تھے اس لئے پورے ہندوستان  
 کے مرہٹہ قوت کے سامنے اکیلے ڈٹ جانے والے نجیب  
 الدولہ اور ان کے ساتھی روہیلہ کے سرداروں کی ایک  
 جھلک دیکھنے کے لئے زبان اور قلم کے میدان میں جہاد  
 والے سارے طلباء اور اساتذہ اپنے حجرہوں سے باہر آ  
 گئے تھے۔

نجیب الدولہ کی چال میں پڑ وقار اکساری تھی۔  
 لڑائی کے میدانوں اور شیخ و تفنگ کے سایہ میں زندگی  
 گزارنے والا سردار سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ پیچھے اور  
 دائیں بائیں دیگر روہیلہ سردار تھے۔ علمی اور قلمی جہاد کی  
 رزم گاہ میں بھی سب نے تلواریں سجا رکھی تھیں۔

شاہ ولی اللہ کے حجرہ کے دروازہ پر انہوں نے  
 تلواریں زمین پر رکھ دیں اور جوستے اتار کر حجرے میں  
 داخل ہو گئے۔

طلباء اپنے اپنے حجرہوں میں واپس چلے گئے۔

READING  
Section



ہو گا۔

شیخ الحدیث نے کتاب بند کی اور شاہ ولی اللہ کے پھر سے کی طرف چل دیئے۔

روہیلہ سرداروں کی روانگی کے بعد شیخ الحدیث نے شاہ ولی اللہ کو ملک سجاول سے ہونے والی بحث سے متعلق بتایا تو انہوں نے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا: ”ہمارے دادا حضور زید کی بھر شہنشاہ اور ملک زریب عالمگیری کی فوج میں مرہٹوں کے خلاف برسر جہاد رہے اور اسی سفر جہاد میں شہید ہوئے۔ والد بزرگوار نے تلوار کے جہاد کی بجائے قلم اور علم سے جہاد کی بنیاد رکھی، ہم اس پر قائم ہیں۔ والد بزرگوار اور ہم بھی تلوار بدست رہتے تو ملت کو صرف دہریہ اٹل جہاد میں آتے۔ ہم خوش ہیں کہ ہمارے تلوار بہ پکڑنے سے ملک سجاول اور نجیب اللہ دلد کی ساری جماعت میدان جہاد میں آگئی۔“

ملک نے آگے بڑھ کر شاہ ولی اللہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا تو شیخ الحدیث مسکرا دیئے۔

دوسرے رجمیہ سے اٹھ کر روہیلہ سرداروں نے حضرت نظام الدین دہلیویہ کے مزار پر جاضری دی اور حضرت آبادیہ ابید ہو گئے۔

ملک سجاول عشاء کی نماز کے بعد درگاہ کے احاطہ میں آئے تو نفل سماع کے لئے چٹائیاں بچھائی جا رہی تھیں اور قوال اپنے اپنے مقامات پر دست کر رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ شاہجہاں آباد کے امراء اور شرفاء کی ساریاں آنا شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے وہ مزار پر جاضری دیتے فاتح پڑھتے اور مسلمانوں کی بے شمار کامرائی کی دعائیں پڑھتے اور پھر محفل سماع میں شریک ہو کر کلام خسرو پر دجد میں چلے جاتے۔ رات گہری ہو گئی تو وہ انہیں وجد کرتے چھوڑ کر باہر آ گئے، ان کے ساتھ منتظر تھے وہ قدر سے رجمیہ کی طرف چل دیئے۔

نواب شوالپوری شکر کی حویلی کے صحن میں دھوپ

پہنچے۔ ان تھکی اس نے باوجود ہار شام سے مار سے جہاد نے ایک کے اوپر دوسرا کر رہا تھا جس میں تھکے ہوئے گھوڑوں پر زینیں لگیں رہتے تھے۔ حویلی کے دروازے خاص میں انکسٹھس کے سامنے گاؤ تکیہ کے بہانے بھی پورعی نواب شوالپوری بیگم اپنی بیوی، علاقائی بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حالات کی مانند الفاظ بھی اس کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ علاقائی بیگم بھی خاموش تھی جسے کچھ سنے کی منتظر ہو۔ نواب شوالپوری بیگم نے کمر بستہ بدلی اور دیوان کی بھست میں بیٹھ جاتی کرتے ہوئے کہا: ”ہماری عمر بڑھ چکی ہے، اس آرمی میں سے تقاضا نہیں کر سکتے، ہمیں ہمارے کچھ پر راضی ہیں اور جب ملک سانس باقی ہیں تو کچھ کر سکتے ہیں۔“

کے جسم نیا ہو گا، انہوں نے کہنا: ”اس میں آواز کہیں بہت دور سے آتی معلوم ہوئی۔“

علاقائی بیگم نے اپنی مائیں کی ایران آنکھوں میں آن کے اکھ کی گہرائی دیکھنے کی کوشش کی۔ حضور کی دست اور دستقامت نے بیٹھ اس خاندان کے اندر فالتوں سے گھرا ہونے کا جو صلہ دیا۔

”میں نے اپنے بیٹے کو شوالپوری بیگم کے پاس کی بات کہی۔“

”ہمارے مائیں میں گرا کر ختم ہو گئے۔ ان کے ہاتھ ہمارے مائیں میں گرا کر ختم ہو گئے۔ ان کے ہاتھ ہمارے مائیں میں گرا کر ختم ہو گئے۔“

”میں نے اپنے بیٹے کو شوالپوری بیگم کے پاس کی بات کہی۔“

”میں نے اپنے بیٹے کو شوالپوری بیگم کے پاس کی بات کہی۔“



ہم نے بھی گمان ملک نہ کیا تھا۔ شولا پوری بیگم کو بخدا بیگم کی بات پسند نہیں آئی۔

کنیز نے سلام کر کے سوار یوں کی تیاری کی اطلاع دی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ افغان بادشاہ اس مہم میں بھی مرخرو ہو گا۔ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ آپ ہمارا یہ مراسلہ عماد الملک تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ ملت سے کہتے کہ وہ زیادہ دیر زلحدہ نہیں رہ سکے گا۔ شولا پوری بیگم نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”حضور کے حکم کی تعمیل کی پوری کوشش کی جائے گی، ہم نے عماد الملک سے رابطہ کا انتظام کر رکھا ہے۔“ مغلانی بیگم نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

”ہم نے آپ کے لئے شاہ ولی خان کے ذریعہ کے قریب دُور ہنگوا دیا ہے، افغان بادشاہ پر اس کا بہت اثر ہے۔“ شولا پوری بیگم نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”شاہجہان آباد کے حالات کے بارے میں ہم نے اب اس کے لئے مراسلہ الملک سے ارسال کر دیا ہے۔“

”بادشاہ معظمہ حضور کی خدمت کی بہت قدر کرتے ہیں۔“ مغلانی بیگم نے جواب دیا۔

”ہم بادشاہ معظمہ کی کامیابی کے لئے دعا کرتے رہیں گے، ملت کی امیدیں اب ان سے وابستہ ہیں۔“

دیوان خاص کے دروازے پر کنیزیں ادب سے جھک گئیں تو اب شولا پوری بیگم ان کے درمیان سے چلتی ہوئی ڈیوڑھی تک گئیں جہاں مغلانی بیگم کی سواری اور محافظ دست تیار تھے۔ دعاؤں کے ساتھ اپنی بہنو محاذ جنگ کے لئے روانہ کیا اور ان کی گھڑی سے چھائی دیکھتی رہی اور پھر ڈھکاتے قدموں سے دیوان خاص کی طرف پھل دی۔ خدام اور کنیزیں سر جھکا کر شاہ دربار کے انداز میں چلے گئے۔

”ہم اور احسان کا شکر ادا کرنے میں تا کاہر ہے۔ ہم اس حال میں بھی اس کے شکر گزار ہیں۔“ شولا پوری بیگم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”حضور کی استقامت اور فراست اس آزمائش میں ہمارا سہارا ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ حضور اس مرحلہ میں بھی ہمیں کامیاب دیکھیں گے۔“ مغلانی بیگم اپنے کو اور عماد الملک شولا پوری بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم سمجھتے ہیں زوال کی اس گھڑی میں نجات کی ایک ہی راہ ہے جس پر چلنے کا ہم نے عماد الملک کو ہمیشہ مشورہ دیا اور جس پر چلنے سے اس نے ہمیشہ غفلت برتی اگر آج بھی وہ مرہنوں اور سہرج مل کا ساٹھ چھوڑ دے تو ہم اسے انتظام الدولہ کا خون معاف کرنے پر آمادہ ہوں گے۔“

”عماد الملک کو جو بات آج تک سمجھ نہ آ سکی وہ اب بھی نہیں سمجھ سکے گا۔ ہماری درخواست ہے کہ حضور اس کے بارے میں فکر مند نہ ہوں، اس کو درمیان سے نکال کر سوجھیں۔“ مغلانی بیگم نے کہا۔

”ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم اپنے خون سے بے فکر ہو جائیں۔ اس نے ہمیں بڑھو دیا، اس پر بھی ہم اس کا بھروسہ دیکھ سکتے۔ ہمارے لئے یہ مشکل سب مشکلوں پر بھاری ہے۔ اس نے ابھی تک ہمارے مراسلہ کا جواب نہیں دیا۔“

”عماد الملک اب بھی اس امید میں ہے کہ مرہنوں کی مدد سے وہ احمد شاہ ابدالی کو شکست دے کر وزارت عظمیٰ پر بحال رہے گا۔“

”ملت کے زوال پر ذاتی اقتدار کے ختم تعمیر کرنے کے خواب کبھی کسی کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ مرہن فتح مند ہو بھی جائیں، اس سے وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہیں گے۔“

”مخدان جی، زوال کی اس حد تک پہنچ جائے گا،

READING  
Section



کا۔ پھر بھی بستی نظام الدین کے لوگ بادشاہ فی سوری کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھر دلوں سے باہر نکل آئے تھے اور افغان فوجیوں کے خوف کے مارے راستوں سے دور کھڑے تھے۔

جب سے یعقوب خان نے شاجہان آباد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تھا لوگوں کے دلوں پر سے افغان سواروں اور سپاہیوں کا خوف لم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود انہیں لوگوں کو راستے سے دور رکھنے کے لئے چھانٹے لہرائے پڑ رہے تھے۔

یعقوب خان ہمایوں کے مقبرہ کی دیوڑھی پر بادشاہ معظم کا انتظام کرتے رہے اور وزیراعظم شاہ ولی خان افغان امراء اور سرداروں کے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی طرف منہ گئے۔ فوجیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور مسجد میں دو رکعت نفل ادا کر کے دیر تک گھنٹوں میں مردیے بیٹھے رہے۔ ان کا محافظہ دستہ مجاوراں اور سجادہ نشینوں کو مسجد کے دروازے سے باہر روکے کھڑا تھا۔ بادشاہ معظم دعا سے فارغ ہو کر باہر آئے تو سجادہ نشینوں نے انہیں اندر اسنے کا فیض یاد دلایا۔

مسجد سے نکل کر بادشاہ معظم نے ایک بار پھر مزار پر حاضری دی اور مجاوروں اور دیویشوں میں اشرفیاں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

جب درویش اور مجاور اشرفیاں وصول کرنے میں اور عمال شائق تقسیم کرنے میں مصروف تھے تو بادشاہ کا بل شہنشاہ روحانیت کے مزار کے احاطہ میں اہل دنیا کی مرمریں لوہائے مزار سے مرجوہین کے مقابلہ و مرتبہ کا جائزہ لے رہے تھے۔

دین والوں کی درگاہ سے نکل کر بادشاہ دنیا والوں کے مزاروں کی طرف چل دیے۔ راستوں سے آوازوں کے نوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

(خاتم ہے)

جس سوئی سے ہندوستان فی عظیم الشان مغل سلطنت کے وزیراعظم نواب قمر الدین ہاتھیوں اور سواروں کے قافلوں کے ساتھ امراء اور سرداروں کے جہر مسٹ میں جنگ کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے، خان خانان نواب انتظام الدولہ کے دستے ایک شان سے لڑائی کے لئے نکلتے تھے وہاں سے ایک خاتون چند سواروں کے ساتھ محاذ جنگ کے لئے روانہ ہو رہی تھی اور ایک بزرگ خاتون کے سوا اس کی کامیابی اور زندگی کی دعا کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔

بادشاہ اور بھی تیز چلنے لگی تھی، تیراں رسیدہ پتے درختوں سے گر کر کرادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے اور آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نمودار ہو گئے تھے۔ کوئی ٹکڑا سورج کے سامنے آتا تو زمین اس کے سایہ میں آ جاتی، ہوا اسے اڑالے جاتی تو دھوپ چمک اٹھتی۔

\*\*\*

ہمایوں کے مقبرہ کے احاطہ میں داخلہ کے دروازے باہر اور اندر افغان دستے قطاریں باندھے کھڑے تھے، ان کے نیزے اور تلواریں چمک رہی تھیں۔ آل تیمور کے اس وسیع و عریض ویران گورستان میں بہت عرصہ بعد اتنے سوار اور پیادہ داخل ہوئے تھے۔ یعقوب خان افغان دستوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مزار تک گئے اور جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ بادشاہ کا بل وقتدار احمد شاہ ابدالی اپنے سمری مقتول شہنشاہ ہندوستان عالم گیر عانی پر فاتح خوانی کے لئے آنے والے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد سے شاجہان آباد میں یہ ان کی پہلی آمد تھی مگر انہوں نے منع کر دیا تھا کہ شاجہان آباد کے امراء اور شرفاء میں سے کوئی بھی ان سے ملنے یا استقبال کے لئے نہیں آئے گا اور نہ ہی مسجد اور شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کرے

RETURN  
Section



# آٹا دی گے چرخ لہو سے جلتے ہیں

مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہو کر لال ہو جاتی ہے۔ مٹی کو اپنانے کے لئے تو اسے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون سے سینچنا ضروری ہوتا ہے۔ مقبول ہٹ نے اپنا زندہ خون دے کر اس زمین پر اپنی ملکیت کی مہر لگا دی۔

0300-9667909

☆ دنگیر شہزاد



READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



مان لیتا، میں اپنی دھرتی سے غداري نہ کرتا۔ میں ہندوؤں کو دوست نہ کہتا، کبھی ڈھٹائی نہ کرتا۔ وہ بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ ”آزادی کے چاہو سے چلتے ہیں۔ اس کی ہر بات میں وزن تھا۔ وہ عقل سے سوچنے اور دور تک پہنچنے کا عادی تھا۔ میری طرح جذبات سے رہنے میں کبھی بہہ نہیں جاتا تھا۔ وہ تو سچا تھا۔ چٹان کی طرح مضبوط اور اٹل اسی لئے وہ مر کے بھی زندہ ہی رہا اور میں چار چار گھنٹے اس ویرانے میں پتھروں سے سرکلرا کر واپس آ جاتا ہوں۔

رام کشور، گیان پرکاش اور ششوپال اب اس طرف نہیں آتے تھے۔ وہ اس قبر کی طرف دیکھتے ہوئے دور دور سے قہقہے لگاتے گزر جاتے تھے۔ حقارت سے تھوکتے اور ٹھوکر لگاتے ہوئے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ آزادی کا بایں موت سے کھیل گیا۔

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا تھا، وہ اس دلیں کے بایں کب تھے؟ منافقت ان کے خون میں رہی ہوئی تھی۔ مقبول بٹ کا تو اس مٹی کے ساتھ صدیوں کا ساتھ تھا، وہ اس پاک دھرتی کا اصل نام لیا تھا۔ مگر وہ لوگ تو ہندو تھے، ان سب کی زبان بھی اور مٹی، وہ تہذیب اور وہ معاشرت بھی نہیں تھی۔ اگر وہ آزاد تھے تو ان ہی کی طرح آزاد میں بھی ہوں۔ مگر یہ کیسی آزادی ہے کہ آج میرا رواں رواں بدترین غلامی اور دہشت گردی کے جال میں پھنسا ہے۔ ایک دائمی خوف میرے حواس پر مسلط ہے۔ میں فس نہیں سکتا، دل کی بات کسی سے کہ نہیں سکتا، میں تو جج کرو بھی نہیں سکتا۔

1947ء کا وہ ایک روز تھا کہ پیارے لعل کا باب ہمارے گھر آیا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے تحکمانہ انداز میں کہنے لگا۔ ”گزرے دنوں کی یاد میں کچھ نہیں رکھا، کبھی ہو کے تم کھاتے پیتے زمیندار، اب تو زمین راہن رکھنے کی بات کرو۔“

اس پر دادا لڑا اٹھا۔ میں دو ٹوک سنائے کو تھا مگر اس

میں میرے خاندان کو درندوں نے کس طرح 1947ء اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، کیسے بتاؤں، اب وہ لوگ اس دنیا میں نہیں رہے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ خاک اور خون میں تڑپتے نظر آتے ہیں لیکن کیا ستم ہے آنکھیں بند کر کے میں اپنے پیاروں کا دیدار نہیں کر سکتا۔ آج بھی وہی موسم ہے۔ بھورے بادل آسمان پر چھائے ہیں۔ وہی جانی پہچانی ہوا اٹل رہی ہے۔ مگر وہی خوشبو نہیں ہے۔ ہر طرف گھٹن ہے، موسم ہر سال اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ ہوائیں پرانی یادوں کی خوشبو رہی ہوئی ہے۔ پرانے لوگ پرانے چہرے، پرانی بستیاں سب ذہن کے دریچوں سے اٹھ اٹھ کر جھانکتے ہیں اور دل کے چپے ہوئے زخم پچھتاؤں کا سورہن کر رہے لگتے ہیں۔

ابھی ابھی میں مقبول بٹ کی قبر سے ہو کر آ رہا ہوں۔ ویرانے میں اس کی لاش کے گرد خود بخود بید کی جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ چاروں طرف ہانس کے گھنے جنگل ہیں۔ ہوا درختوں سے سرسرا کر گزرتی ہے تو سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ مقبول بٹ کی موت پر جیسے سب آہیں بھر رہے ہیں، ہر وقت وہاں ماتم کی فضا چھائی رہتی ہے، میں دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا گزرتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے غداست میں ڈوبے آنسوؤں کو پوچھنے کے لئے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ مگر سارا وقت مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے مقبول بٹ میرے پاس موجود ہے۔ وہ میری حالت سے واقف ہے۔ کیا ہوا جو وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔

مستل روتے کے بعد میں پوچھل دل لئے واپس آیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اب تک خاک پھانکتا رہا ہوں۔ اس نے مجھے معاف نہیں کیا، کبھی کیسے سکتا ہے۔ چھوٹی بڑی غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے مگر اتنا سنگین گناہ تو مجھ جیسے ذلیل اور کم ظرف لوگوں سے ہی سرزد ہوتا ہے۔

کاش مقبول بٹ زندہ ہوتا تو میں اس کی ہر بات



سونا اگلنے والی ماں کا سودا کر لیا۔ دھرم چند نے بدلے میں مٹی بھر چاول ہمارے گھر بیچ دیے۔ چاول کے دام اونچے ہوتے جا رہے تھے تا۔۔۔ اس لئے سب نے ایک ایک دانہ ہاتھوں میں لیا۔ دو چار دن جہنم بھرنے کے بعد پیٹ کی آگ پھر بھڑکنے لگی۔

دادا بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے بازوؤں میں سکت نہیں رہی ہے۔ وہ زیادہ کام بھی نہیں کر سکتا ہے۔ پہلے تو ایسی حالت نہیں تھی۔ لہلہاتے کھیتوں میں وہ شیر کی طرح پھرتا تھا۔ دھان اور گندم کی کھڑی فصل کا پیرہ دیتا تھا۔ لیلیٰ اور ملکہ دن بھر گھر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے خالی وقت میں چرنے پر سوت کاتتی تھیں۔ دھان چھڑتی، رشتی میں بل ڈالتیں یا گڑ کاڑھتی تھیں۔

لیلیٰ کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے خواب بھرے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہیں آئے گا۔ بیاہ کی بات کئی ہو جانے کے بعد تو وہ اور بھی گھر آئی تھی۔ دن میں دو بار کپڑے بدل کر بالوں میں سرسوں کا مہکا تیل ڈالتی، جوڑے میں سورج مکھی کا پھول لگا کر سارے گھر میں اشٹلاتی پھرتی۔

آنگن میں سفید نیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ دادا کہتا تھا کہ لیلیٰ جب اپنے گھر جائے گی تو ان کو بھی ساتھ ہی لے جائے گی۔ جیسی تو وہ صبح شام ان کو دانہ چو کر ڈالتی۔ اپنے ہاتھ سے مل مل کے نہلاتی اور چوری چوری ان کی چوڑی پیشانیاں بھی چوم لیتی تھی۔ نیل اس کے پیروں کی چاپ پہچانتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اپنے کھوٹے پر خوشی سے اچھلنے لگتے۔

زمین کا سودا ہوا تو گھر کی دیرانی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ دادا نے ایک دن بے لہجے میں کہا۔ "عبداللہ! تو تو یونہی دکھ کرتا ہے۔ زمین تیری ماں نہیں تھی، یوں سمجھ لے کہ تیری بہن تھی جس کو ایک نہ ایک دن پرائے ہاتھ میں جانا ہی تھا۔" میں نے گھور کر اس کو دیکھا تو اس کی

نے مجھے سچ میں آنے سے روک دیا۔ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "سچ کہتے ہو، دھرم چند! پیٹ کی آگ اگر نہ ہوتی تو میں تم سے بات بھی نہ کرتا۔"

دھرم چند نے زمین پر تھوک کر غصے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ "دھان آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔ پانچ سیر بھی سونے کے مول ہے، بولا۔"

دادا نے سر جھکا لیا۔ یہ ہماری پسماندگی کا بدلہ تھا کہ دھرم چند کبھی بیٹائی کا حراز تھا اور اب سینٹھ ہو رہا تھا۔ "رہن کی بات نہیں کروں گا۔" دادا قرض کے ڈر سے مرنے لگا۔

"تو پھر سچ کیوں نہیں دیتے۔" دھرم چند نے حریفوں لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" دادا نے جواب میں زمین کا سودا کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ دو روز سے گھر میں چولہا نہیں جلا۔

میں تو لڑنے کو تیار تھا مگر دادا نے کہا۔ "عبداللہ! زمین اب ہمارے بس کی نہیں رہی۔ خدا کی مرضی ہوتی تو سیلاب ہی نہ آتا، سب کچھ بہہ نہ جاتا۔ زمین تو ماں ہے اپنے ہاتھوں کوئی اپنی ماں کیسے پھینک سکتا ہے۔"

"نشیب میں ہے یہ زمین۔" دھرم چند ناک چڑھا کر بولا۔ "سودا تو مجھے ہی مہنگا پڑ رہا ہے۔ اگر تمہاری بھوک کا خیال نہ ہوتا تو کبھی اپنے سر نہ اوڑھتا۔"

اس پر میں نے اور دادا نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ وہ منہ بتا رہا تھا۔ بار بار تھوک رہا تھا، بے لگام بدک رہا تھا۔ بھوک، افلاس، بے روزگاری۔

ملکہ اور لیلیٰ بے بسی سے کواڑ کی ادٹ سے جھانک رہی تھیں۔ ان کے چہرے اترے تھے۔ ہونٹ سوسکھے تھے اور آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ آدمی پیٹ کھا کر ان میں جان نہیں رہی تھی۔ دھان کی فصل کو کیڑا لگ گیا تھا۔ اس لئے گھر گھر بھوک کی پکار تھی، دادا نے زمین پھینک دی۔

READING  
Section



نہیں تھی۔ بھوکے پیٹ بھلا کب نیند آتی ہے۔ میں نے  
مندی مندی آنکھوں سے دیکھا، دو مجھ پر جھکی کچھ نہہرا  
چاہتی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اپنے گھر سے ہوئے باں ان بے کانوں کے پیچھے  
اُس لئے اور سر جھکا کر رونے لگی۔

”کسی نے آج کل کہا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”واہ! بیٹوں کی بات پکار رہا ہے“ ان نے رندھی

آواز میں کہا۔

”بیٹوں کی؟“

”ہاں!“

میں نے ڈنڈا اٹھا لیا، چادر دوڑا دیتے ہوئے باہر آ

گیا۔ رام کشو کا باپ تھوڑے مہینوں پہ تازہ دے رہا تھا۔

پگڑی سر سے اچک کر بولا۔

”بھل تو سب کچھ کے مارے لگ رہے ہیں، بالکل

بڑھے۔“

واہ! مارے غم کے سرخ ہو گیا مگر ایک دم زرد پڑ گیا۔

یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے وقت ہی انسان کو بے

موت مارتا ہے اور وقت ہی کسی چہار کو برا زمیندار بناتا

ہے۔

”گھر کے پاس لے ہوئے بچے ہیں۔“ واہ! بے کہا۔

”ابھی بڑھے کیسے ہو گئے؟“ واہ! کی آواز میں زور نہیں

تھا۔

”گزر گئے وہ زمانے جب تم نے انہیں پالا ہوگا۔“

واہ! نے حیرانی سے دیکھا اور کہا۔ ”ابھی تو تین برس

بھی پورے نہیں ہوئے۔ زمانہ کیسے زور گیا؟“

”وقت سے تمہارا ہرج ان کی بھی پسلیاں نکل

آئی ہیں۔ ہادی میاں! اُدی خود اگر دو وقت نہ کھائے تو

کوئی بات نہیں مگر جانور کو کھانا تو بہت ضروری ہے۔ ان

ڈھانچوں کا کیا مول پڑے گا خاک!“

آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ کندھے پر رکھے رد مال  
ست پونچھ کر بولا۔ ”تو سمجھتا ہے کہ وہ زمین کو میرے پاس  
رہنے دیتے؟“

میں اٹھ گیا۔ اب ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے

مٹانے سے کیا فائدہ۔ مگر وہ پیچھے پیچھے ہی سرکتا ہوا۔ مجھ

کندھوں سے پکڑ کر وہ زمین پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

”کان کھول کر سن لے، اب یہاں ہمارا کچھ بھی نہیں

بچا۔“

میں چونک گیا، وہ کیا کہہ رہا تھا۔

”یہ گھر، یہ سامان، سب کچھ کوئی دن جاتا ہے کہ یہ

لوگ تھک کر سہ جائیں گے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تو ابھی نادان ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ہمیں

سنبھل کر چلنا ہو گا۔ یہ بہت گندی ذہنیت کے لوگ

ہیں۔“

”واہ!“

”پنے ہاتھوں اپنا مال لٹا دینا اچھا ہے۔“ واہ! نے

کہا۔ ”کسی بات کا غم نہ کر۔“

پر میں نے مانا۔ پہلے سے بھی بڑھ کر غم زدہ ہو

گیا۔ واہ! کو وہیں چھوڑ کر اپنی زمین کی طرف چلا گیا۔

وہ دیسی کی دیسی ہی تھی، خاموش اور بے بس۔

یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی، چپ چاپ گود میں چھپا

لینے والی۔

رات ہوئی تو میں نے کسی سے بات نہ کی۔ گھر میں

کچھ کھانے کو تھا ہی نہیں اس لئے کھات پر لٹ گیا۔ معلوم

نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا جب

لیٹی نے آہستہ سے مجھ پر ہاتھ رکھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

برف جیسی سفید چاندنی میں اس کی آنکھیں بوجھل

لگ رہی تھیں۔ واہ! بھرائی تھی۔ شاید دو ساری رات سوئی

READING

Section



”دکھ نہ کر عبد اللہ! نکل اگر اپنے ہاتھ سے نہ دیئے جاتے تو کل ہی چوری ہو جاتے۔ اس سے تو اچھا ہے جو بھی ہاتھ آ جائے۔ ڈھائی سیر دھان تو دو وقت کا ساتھ دے جائیں گے مگر نکل تو ایک رات بھی نہ کاٹ سکتے تھے۔“

لیلیٰ تو رو رو کر مری جا رہی تھی۔ نکل چلے گئے تو اس کا بیاہ کیسے ہو گا۔ شگون ہی بدل گیا۔ ہندو ذہنیت کا مطلب اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ چیت رام ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ہم اور تم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ سدا سے دو چلے آ رہے ہیں اور ہمیشہ دو ہی رہیں گے، ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔

جب سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہی دن اتمول تھے جب برسوں پہلے ہم ہوشیار پور سے آ کر اس زمین پر بس گئے تھے۔ ہمارے گھر بالکل آسنے سا بنے تھے۔ ہم سب اردو زبان بولتے تھے اور پھر اس کو اس طرح اپنا لیا جیسے وہ ہی ہمارا اوڑھنا بچھوٹا، ہماری مادری زبان تھی۔ اس تمام عرصے میں ہم اس رنگ میں رنگ گئے لیکن چیت رام کی جڑیں اس زمین کی نہیں تھیں نہ دھرم چند کی، دادا تو یہیں کا باسی تھا۔

ہم یعنی رام کشور، ششوپال اور میں ہم سب کے پاؤں اور کواٹھے ہوئے تھے۔ ہماری باتیں آسمان کو چھو رہی تھیں مگر زمین میں ہم دھنستے نہ تھے۔ مقبول ہٹ اپنی فضاؤں کا پالا تھا۔ اس کی رنگت میں اسی مٹی کا رنگ تھا۔ اس کی مٹی سے محبت، اس کا اٹنا بیٹھنا، سب اسی کا جوڑ تھا۔ جو کچھ بھی ہو اس سے کسی کو کیا غرض برسوں تک ایک دھرتی میں رہنے کے بعد زمین غیر نہیں رہتی۔ آہستہ آہستہ اپنے اندر سمیٹنے لگتی ہے۔ میں کیسے کہوں میرا اس سے ناٹھ نہیں تھا۔ میں یہاں اجنبی کیسے ہو سکتا تھا۔ ان سارے گزرے برسوں میں ایسا کال کبھی کا ہے کو پڑا ہو گا۔ ان دنوں تو دادا بھی اکڑ کر چلتا تھا۔ اس کی ایک ہی لٹکار سے کیا

میں چپ کا چپ رہ گیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا ہتھیلی کے پسینے سے بھیک گیا۔ اسی تکرار میں پو پھنٹنے کو ہو گئی۔ چڑیاں جاگ گئی تھیں۔ صبح کی ہوا میرے کانوں کے آ رہا ہوئی جا رہی تھی۔

”تم جو کچھ بھی سمجھتے ہو، دام لگا لو۔“ دادا عاجز ہو گیا۔

”ان کا وبال تو ہادی میاں! کوئی بھلا آدمی مشکل ہی سے اٹھا سکے گا اور دو چار دن میں بوچھا خانے کے لائق ہو جائیں گے۔ دوستی کی لاج رکھ رہا ہوں، ڈھائی سیر دھان“

”ڈھائی سیر.....؟“ دادا کا منہ کھٹکا کھٹکا رہ گیا۔

”دھان کا بھاؤ پوچھ لو منڈی میں۔“ چیت رام نے بیلوں کی پکڑی رستی چھوڑ دی۔ ”جاؤ بولی لگوا کر دیکھ لو۔ ان ہڈیوں کے بنجر کا کوئی کیا دیتا ہے۔“

وہ اکثر ہی ہوئی سوچیں لئے جانے کو تیار ہوا تو دادا بھوک کے خوف سے مرنے لگا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”غصہ جانے دو چیت رام میں اور تم کوئی دو تو نہیں ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ اکڑ گیا۔ ”دو کیسے نہیں ہیں۔“

دادا ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے بے چارگی سے سر جھکا لیا۔ پیت رام نے بیلوں کی رستی کھولی اور دادا سے بولا۔

”زمانہ بہت بدل چکا ہے ہادی میاں! اب وہ پہلے کی بات نہیں رہی۔ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

دونوں نکل اس کے پیچھے ذکر کر گئے تھے۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے تھے اور وہ انہیں ڈنڈے مار مار کر لئے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیلیٰ کی سسکیوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ پھر شیخ کر چیت رام کے پیچھے ہی جانے لگا تو دادا گلے گلے پانی میں ڈوب کر ابھر آیا۔ ہوش میں آ کر کہنے لگا۔

READING  
Section



”ہادی سیال!“ جگت سوامی کھڑکھڑے بولا۔  
”میں نے سنا تھا تمہارے حالات اچھے نہیں ہیں؟“

جگت سوامی نے بڑا بڑھیا جوتا پہن رکھا تھا، کلف لگے دھوتی کرتے میں تو وہ گزرے دنوں کا تیلی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ سارا دن تیل کی کپیاں بھر بھر بیچنے والا جگت اب جگت سوامی ہو رہا تھا۔

”یہ تو اس کی دین ہے۔“ دادا نے غصہ بھری سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ”جب چاہے موتی کو کنکر بنا دے۔“

جگت سوامی نے بڑی زوروں میں گردن ہلائی۔  
”پھر کیا خیال ہے؟“

”حالات کا کیا ہے۔“ دادا ایک دم سمجھ گیا اور چونک کر بولا۔ ”سوامی جی آج ٹھیک نہیں ہیں تو کل سدھر جائیں گے۔“

”میں نے سنا تھا پاٹ کی زمین دے رہے ہو۔“  
جگت سوامی نے کہا۔

”گھبرا کر راتوں میں ہو گیا ہوں۔“ دادا رو ہانسا ہو گیا۔  
”مگر تھری فصل نہیں دوں گا۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔“

”سوچ لیا۔ ہے خوب اچھی طرح۔“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“

”فصل کا ست لوں تو پھر زمین کا سودا بھی دیکھا جائے گا۔“

”تنبہ ہی مری پڑی حالت پر ترس آ گیا تھا تو چلا آیا تھا۔“ جگت سوامی نے مکارانہ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ مجھے کیا پڑی تھی یہاں آنے کی۔“

دادا کی آنکھوں میں پھر نمی آ رہی تھی، آستین سے پونچھ کر بولا۔

”تم اس کی فکر مت کرو۔“

دادا بیچ کر جانے لگا، ملک اس کے لئے شربت بنا

دھرم چند کیا چیت رام سب ہی ڈرتے تھے۔ اس کی آواز من کر دہل جاتے تھے۔

دادا نے تو یہاں کی بھر زمینوں کو اپنے خون سے بیچ کر ہرا بھرا کر دیا تھا۔ دن رات ایک کر کے دھان، پاٹ، جو، گندم، ایسے بھر بھرا گائے کہ میلے میں ہادی میاں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا لوگ اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے تھے۔ دھرم چند، جگت سوامی، چیت رام سب اس کے سامنے سر جھکا کر چلتے تھے۔ کیا مجال جو ادھی آواز میں بات کر جائیں مگر اب معلوم نہیں یہ کیا کیسے پلٹ گئی جو چاہا تھا وہ کیوں نہ ہوا۔ دادا تو بڑے سختی تھے، مگر کمر اور گلے گلے پانی میں اتر کر دھوپ دوپہر میں کام کرتے۔ کرتہ، چمچل سے بے نیاز ہو کر کچھڑا اور بدبو کو گوارا کرتے۔ پاٹ کو سڑاتے، ایسی فصل اگاتے کہ منڈی میں اصل سے دس گنا ہ فائدہ اٹھاتے۔

انسان کا مقدر ساتھ دے تو آغوشی اور سیلاب بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مگر جہاں سونا ہی مٹی برابر ہونے لگے تو اس ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ دھرم چند نے جس زمین پر ہاتھ مارا تھا وہ سونے کی کانٹھی۔ ہر سال دریا کی مٹی اور پانی کی لہریں اس کو زرخیز بناتی تھیں۔ اب تو دریا بھی اپنا دھارا بدل رہا تھا۔ کچھ ہی برسوں میں وہ چار گنا زیادہ اناج اگلنے لگے گی۔ مگر بھوک تو آج پڑی تھی۔ سیلاب میں دھان کی کھڑی فصل بہہ گئی تھی۔ اس ہاتھ سے جانے دالی زمین کے علاوہ ابھی دادا کے پاس گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ کٹائی کے بعد پوری امید تھی کہ اچھے دام دے جائے گی تو اتنی بھوک نہیں پڑے گی۔

بیلوں کی جوڑی چلی گئی تو ہار ہویں روز ہی ششوپانی کا باپ ہمارے دروازے پر کھڑا تھا۔ دادا اس کو دیکھتے ہی قفل اٹھا۔

”آئیے آئیے، جگت سوامی جی!“ دادا نے خوش دلی سے کہا۔ ”نصیب جاگے ہمارے، کہنے کیسے آتا ہوا؟“



روزگار نایاب، آزادی کے نام پر ہندو لوٹ مار میں سرگرم تھے۔

میرا ضمیر ہتھوڑے مار مار کر میرے ذہن کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ پیٹ میں بھوک کے مارے ملی پڑ رہے تھے۔ ایک طرف آزادی، آزادی، آزادی کے فلک شکاف نعرے تھے۔ لوگ ہر طرف آزادی کا جشن منا رہے تھے تو دوسری طرف روزگار کی مایوسی تھی۔ میرے ہونٹوں پر تھکان اور مایوسی کی چڑی جمی تھی۔ ماتھے پر غریبہ کی خاک اڑ رہی تھی۔ تھک ہار کر اپنی کھات پر پڑ گیا۔ مسلمان کے لئے اس دھرتی میں سب دروازے بند ہو گئے تھے۔ خدا کا دروازہ تو ہمیشہ کے لئے کھلا تھا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ بغیر کچھ کھائے بے سو گیا تو دادا نے گہری رات میں جھجھوڑ کر جگایا۔ ”عبداللہ... عبداللہ!“

”کیا ہے دادا! سونے بھی نہیں دیتے“ میں نے کسمسا کر کر دھت بدلی۔

”پاٹ (گندم) کو آگ لگی ہے۔“ دادا نے گھبرائی آواز میں کہا۔

میں دو تھوڑے دیر اندھ کر اندھیرے میں بھاگتا چلا گیا۔ راستے میں ٹھوکر لگی تو منہ کے تل گرتے پچا۔ کچھ بھائی بھی تو نہیں دیتا تھا۔ کوئی گیلی گیلی چیز میرے ہتھ میں سے نکل کر زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ ٹول کر دیکھا تو خون تھا۔

زمین میرے خون کی پیاسی تھی۔ میں نے پروانہ کی اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔ دریا کنارے جا کر دم لیا۔ نظروں کے سامنے ساری امیدیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ دادا ایک طرف منڈیر پر گھنٹوں میں سردے بیٹھا تھا۔ وہ تو چچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کو اتنا بے حال نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ فصل اچھی پک جائے گی تو دونوں لڑکیوں کا بیاہ ہو جائے گا۔ مگر میں کچھ دن کھانے کا آسرا بن جائے گا۔ ہو سکا تو دودھ

کر لائی تو اس نے منہ موڑ لیا۔ جاتے جاتے بولا۔ ”جب قانون سے مرتے مرتے اونے پونے وصول کرنے لگو تو مجھ سے پوچھ لینا، میں پھر بھی تمہاری دوستی کی لالچ رکھ لوں گا۔“

”مہربانی ہے آپ کی سواری جی! ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔“

وہ چلا گیا تو میں جیسے گہرے خواب سے بیدار ہوا۔ دادا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ٹوکس سوچ میں ہے؟“

”میں قادر آباد چلا جاؤں گا۔ شاید کسی پاٹ کول میں مزدوری مل جائے۔“

”مزدور بھرتی ہو گا تو؟“ دادا کی آواز میں طنز تھا۔

”ہاں دادا!“

وہ خاموش ہو گیا، اس کے بعد وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں جانتا تھا اس کے سینے پر پتھر کی ریل رکھی ہے۔ دن چڑھتے تک جب میں دھلے کپڑے پہن کر روانہ ہونے لگا تو میلی نمک ملا ہاسی بھات لے آئی۔ میں نے دونوں لے ملق سے اتارے، پانی کا گلاس ایک سانس میں پی کر پیدل ہی نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جمبوکوں میں ہال اڑے جاتے تھے۔ کچھ میں کھانے کو نہیں تھا تو سر میں لگانے کو تیل کہاں سے آجاتا۔ دو چار قطرے پہلے کے پڑے تھے وہ تو لٹی نے لگا لیا تھا۔

دن بھر خوار ہونے کے بعد شام کو میں جھک مار کر واپس آ گیا۔ پل کے پل میں کیسا اندھیرا ہو گیا تھا۔ مسلمان کارخانوں میں ہندوؤں نے ساری جگہ گھیر لی تھی۔ نہاں اسامیاں تھیں وہاں راتوں رات مشینیں بہ اکھاڑ کر ہندوستان پہنچائی جا رہی تھیں۔ میرے جیسے بے شمار نوجوان گرد میں اُٹے پریشان چہرے لئے وہاں کھڑے ہندوؤں کے تعصب اور نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ ٹیکسریاں، ہندو، کل، پڑے غائب، عہدے ختم،

READING  
Section



گئے جب ان زمینوں پر تمہارا زور چلتا تھا۔ اب تو وہ لوگ بھی حقدار ہیں جو اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ تمہاری آزادی کے بعد یہ زمین بھی تقسیم ہوگی۔  
”کون لوگ؟“

”منہ کھلواتے ہو میرا، تو سن لو۔“ جگت سوامی نے کہا۔ ”میں بھی برابر کا حقدار ہوں مگر میں تمہاری دوستی کی لاج نبھا رہا ہوں۔ قیمت دے کر زمین لینے آیا ہوں۔“  
”حق دار..... کیا حق؟“ دادا بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

”واہ ابھی کیا ہے۔ ابھی تو بہت کچھ ہو گا، جن زمینوں اور جاگیروں پر تم لوگ کنڈلی مارے بیٹھے ہو۔ سب کی پرکھ ہوگی جو اصل حقدار ہوں گے اب یہاں وہ ہی رہیں گے۔“

دادا کا دم گھٹ رہا تھا۔ کھانسی کھانسی مرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کھانسی غربت اور کمزوری کی علامت ہے۔ بس اب دادا زمین پھینک کر جان چھڑا لے گا اور ہوا بھی یہی۔ جگت سوامی نے کانڈوں پر لکھت پڑھت اسی وقت کر کے دامن دانے ہماری کونٹری میں پھینک دیئے۔ کہنے لگا۔ ”ہادی میاں! تم فکر مت کرو، میرا نندہ سے تو میں وہ نگر لوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا۔“

دادا سے اٹھنے کی میری عمر نہیں ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنے حالات کو سمجھتا تھا۔ میرا کیا ہے زیادہ سے زیادہ دو چار دن منہ پھلا کر دور دور پھروں گا پھر ان سب میں ایک ہو جاؤں گا۔ آخر تو مجھے اسی گھر میں رہنا ہے۔ بس میں دادا سے بات نہیں کروں گا۔ دن بھر اپنا دکھا اپنے ساتھ لئے سرکوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا پھروں گا اور رات کو پچھلی کے شکار پر چایا کروں گا۔ یوں دادا اور زمینوں سے میرا کوئی واسطہ بھی نہیں رہے گا۔ مجھے کیا پروا ہے کسی کی۔ نوکا تو میرے پاس ہے ہی اور جال بھی میرا لٹا ہے۔ کچھ دن میں دل ہی دل میں منصوبے بناتا رہا۔

کے لئے گائے بھینس لے لیں گے۔ مگر نہ معلوم کس طرح آگ لگ گئی۔  
لیلیٰ تو لڑتی رہی کہ دادا نے ضرور کھیت کنارے چلم سلگائی ہوگی۔

دادا ہزار کہتا رہا گھر میں کھانے کو نہیں ہے تو چلم پھونکنے کو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ چھ مہینے ہو چلے چلم کو ہاتھ لگائے۔

میرے پیروں تلے زمین کھینے لگی۔ زمینیں گئیں، بیل گئے، اب فصل بھی گئی اور بھوک وہیں کی وہیں رہی۔ رات بھر انگاروں پر لوٹتے گزری۔ صبح ہی صبح جگت سوامی پھر سے آ گیا۔  
”کمری فصل جل گئی، بہت بُرا ہوا۔“ اس نے دادا سے کہا۔ ”اب خالی زمین کا سودا کر لو، اب بھی کچھ مل سکتا ہے۔“

”زمین کو چور تو نہ لے جائیں گے۔“ دادا جلا بیٹھا تھا۔

جگت سوامی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ جاتے جاتے تھوک کر بولا۔ ”کیا خبر جو چور ہی لے جائیں۔ یاد رکھو! میرا نندہ تو سرکاری طور پر کوشش کر رہا ہے کہ وہ زمین اس کو مل جائے، وہ روز پکھری جاتا ہے۔“

دادا سانٹے میں رہ گیا۔  
”بھئی ہادی میاں!“ جگت سوامی نے طنز پر انداز میں کہا۔ ”جیسے تم اس زمین کے مالک ویسا ہی وہ بھی ہے۔ یہ ابھی قانونی طور پر تقسیم نہیں ہوئی۔ برسوں تک تم نے اس پر عیش اڑایا ہے، اب اس کا بھی تو حق ہے۔“

میرا تو جی چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کا منہ توڑ دوں مگر بابا ہی مرنے لگا۔ ہاتھ پکڑ کر جگت سوامی کو چار پائی پہ بٹھایا پھر پوچھنے لگا۔ ”اصل بات ہے؟“

”تم ان لوگوں کو تو خوب اچھی طرح سمجھتے ہی ہو ہادی میاں!“ وہ جو بٹھ کر تے ہوئے بولا۔ ”وہ دن ختم ہو



وہ بہت تھے اور میں اکیلا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا، مجھے آسمان پر پورا چاند کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ناامیدی کے کانے بادل گھرے آ رہے تھے لیکن آزادی کا جشن میری آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔

میں مان گیا، سو داٹے ہو گیا۔

میں نے سوچا دادا لڑے گا تو کہہ دوں گا۔ تم نے جو زمینیں پھینک گئیں تو میں نے نوکا دے کر مسئلہ حل کرنا چاہا ہے۔ رام کشور اور ششوپال میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ وہ اگر دھوکا بھی دے گئے تو کیا ان کے باپ تمہارے ساتھ چال نہیں چل گئے؟

اب تو ہمارے چاروں طرف جھوٹ ہے، چالاکی ہے اور فریب ہے۔ دادا زیادہ اونچ نیچ کرے گا تو میں شرم بھاگ جاؤں گا۔ یہاں میرا رکھا ہی کیا ہے؟

وہ دونوں اچھلتے کودتے نوکا لے گئے۔ ساتھ ہی جال بھی تھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور ہانڈوں میں بجلی بھری تھی۔ رات گئے تک میلہ لگا رہا۔ وہ دونوں دریا کی سطح پر بہت دور نکل گئے۔ میں ان کے ساتھ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ گھر کی حالت اچھی ہوتی تو میں بھی ان میں شامل ہو کر ضرور خوش ہوتا۔ کنارے پر بیٹھے بیٹھے دیر ہونے لگی تو میں گھر چلا آیا۔

کھاٹ پر آنکھیں بند کر کے لیٹا تو نیند نہ آئی۔ برہار کے بستر پر سسکیوں کی آواز بے چین کئے دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ لیلیٰ کو اپنے بیلوں کی یاد ستا رہی ہے۔ بھوک پھر ہمارے دروازے میں ٹپکی تھی۔ میں نے اسے چپ کرانے کا کوئی جتن نہ کیا۔ حالات تو ہم سب کے سامنے ہی تھے۔ سراپکا کر دیکھا تو ملکہ کر دیکھیں بدل رہی تھی۔ مجھے جاگتے پایا تو آہستہ سے بولی۔

”عبداللہ! تو نے نوکا بھی دے دی؟“

”ہاں!“ میں نے کروٹ بدلی اور چپ ہو گئی۔ میری ذاتی معاملہ تھا۔

میرے چاروں طرف ایسی سرگوشیاں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ غبار چڑھا ہے۔ جن ہندو دوستوں کو اب تک میں اپنا سمجھتا آیا وہ میرے نہیں تھے۔ ان کے اور میرے درمیان مذہب کا فاصلہ تھا۔ تہذیب اور معاشرت کا بھد تھا۔ ایسی ایک دوری تھی جس سے ہم نے آزادی حاصل کی تھی۔ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکتے۔ کبھی بھی یکسانیت کے پردے میں ڈھل نہیں سکتے۔ میں نے ہندو دوستوں کے فریب میں آ کر مقبول بٹ کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مقبول بٹ جو میرا بھائی تھا، جس کے ساتھ میرے بھی رشتے تھے۔ خون کے مذہب کے، روح کے، ہم تو ازل سے ایک ہی تھے اب تک ایک ہی رہیں گے مگر نہ جانے کیوں میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اندھیروں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ چاند چڑھا تو دریا کنارے رونق آگئی، ڈھول بجنے لگا۔ دور دور سے لوگ کھینچے آئے گئے تو میں بھی امیدیں لئے وہاں پہنچ گیا۔ شور ہو رہا تھا۔ مٹی جال بکھیرنے کی تیاری میں تھے۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ بدست ہو کر دنیا کے غم بھلا رہے تھے۔ اتنے میں ہجوم میں پہچان کر رام کشور اور ششوپال میری طرف بھاگے آئے۔

”عبداللہ! نوکا بچو گے؟“

”نوکا..... مگر کیوں؟“

”تمہارے گھر کی حالت اچھی نہیں ہے اس لئے۔“

”تم سے کس نے کہا؟“

”سب گاؤں والے بتاتے ہیں۔“

”نوکا کون لے گا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہمیں دے دو، جو پھلی ہاتھ آئے گی اس میں

آدمی تمہاری۔“

معلوم نہیں میرے ہاتھوں کا زور کیوں ٹوٹنے لگا۔ وہ سب میرے گرد جمع ہو کر میرے جواب کے منتظر تھے۔

READING  
Section



آئے ہیں ورنہ تمہارا حصہ تو اس میں بنتا بھی نہ تھا۔  
ششوپال احسان بنانے لگا۔

اور پھر وہ دونوں جلدی سے چلے گئے۔ میں ان کی  
طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو اتنی جلدی بدل گئے کہ مجھے  
سمجھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میری ان سے پندرہ بیس سال  
کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ وہ معمولی کسان کے بیٹے تھے۔  
دونوں کے باپ کھیتوں میں بٹائی کا کام کرتے تھے۔ نہ  
ان کی اپنی زمینیں تھیں، نہ نوکا، نہ کوئی کرنگا۔ ہم میں کوئی  
اونچ نیچ نہیں تھی۔ میں بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ مگر  
میرے دل میں کبھی میل نہیں آیا تھا۔ آزادی سے پہلے ہم  
سب ایک تھے لیکن ہندو مسلم نفرت دلوں میں موجود تھی۔  
پھر بھی سچ تہوار ہمارے سب ساتھ کے تھے۔ میرے گھر  
ہر سال محرم کی دس تاریخ کو کچھڑی یا کھیر کی نیاز ہوتی۔  
رات بھر لوہ پڑھا جاتا تو رام کشور اور ششوپال ساتھ بیٹھ  
کر سنتے اور نیاز کھاتے تھے۔ عید بقر عید ہم ساتھ ساتھ  
خوشیاں مناتے۔ مل کر میلے میں جاتے۔ ہنس ہنس کر گلے  
ملتے۔ رمضان میں برابر کے روزے رکھتے۔ ان کے گھر  
میں درگا پوجا ہوتی، آرتی کیرتن کا دخول بجاتا تو میں بے  
اختیار بھاگا جاتا۔ کھانڈ کھلونے جیب میں بھر کر لاتا۔

ہمارے یہاں بارہویں کی فاتحہ ہوتی تو اس میں  
پیارے لال بھی آتا، رام کشور بھی ہمارے ساتھ ہوتا۔  
سب ہی مل کر مسلم لیگ کے جلسوں میں جاتے اور  
قائد اعظم کی تقاریر سنتے۔ مجھے تو وہ گزرا ہوا ایک ایک مل  
ایک ایک لمحہ اس طرح یاد ہے جیسے یہ سب ابھی ابھی کی  
باتیں ہوں۔ ہمارا تو مرنا جینا ہی ساتھ کا تھا۔ برسات کی  
گھٹائیں اٹھ کر آتیں۔ بہتے دریا میں مچھلی پکڑتے۔ یہ  
مچھلیاں ہمارا شکار تھیں۔ ان سے ہماری خوشحالی اور خوشی کی  
ساری امیدیں بندھی تھیں۔ پو پھٹنے تک کشتیوں کی دوڑ  
جاری رہتی۔ سب سے آگے نکل جانے والا مارے خوشی  
کے اونچی آواز میں ماسے کاٹا تھا۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگتا تو

”کھائیں گے کہاں سے؟“

یہ میرا مسئلہ نہیں تھا، دادا کا تھا۔ اس لئے میں نے  
کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بھی دم سادھ گئی اور یوں رات  
آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح ہوئی اور میں ابھی باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا  
کہ دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ رام کشور اور  
ششوپال دونوں منہ پھیلائے کھڑے تھے، میرے منہ پر  
جال مارتے ہوئے بنوے۔

”سننا لو اپنا جال، ردی ہو چکا ہے یہ۔“

”کون کہتا ہے؟“

”نوکا تو، ضرور نئی بناؤ گے؟ لاکھوں چھید ہیں اس  
میں، رات ہم ڈوبتے ڈوبتے بچے۔“

”رام کشور! ایک چھ ماہ ہی ہوئے ہوں گے جب  
میں نے یہ نوکا تمہارے ساتھ ہی بنوائی تھی۔“ میں انہیں  
سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا مگر وہ مردہ نمبر بکڑے  
گھوڑے کی طرح بدک رہے تھے۔

”وہ کوئی اور ہوگی۔“

”ہوگی کیسے؟“ میں کھیانا ہو گیا۔ ”اور ہے ہی  
نہیں۔“

”مجھے تمہاری نوکا کی کوئی خبر نہیں ہے۔“ رام کشور  
نے بے نیازی سے کہا۔

”تمہیں اطمینان نہیں ہے تو پھر واپس دے دو۔“  
”واپس کہاں سے دیں؟“ ششوپال نے کہا۔  
”ایسی خستہ حالت تھی کہ میں نے وہیں کنارے پر اس کے  
کھڑے پھینک دیئے۔“

”نوکا کے کھڑے.....“ میری جان ٹکٹنے لگی۔

”اور کیا روٹی کے کھڑے؟“ وہ طنز سے ہنسا۔

”یہ کو۔“ اس نے سیر بھر مچھلی زمین پر رکھتے ہوئے  
کہا۔ ”اٹھا لو۔ رات بھر کی محنت اس ٹوٹی ہوئی نوکا سے اور  
وصول بھی کیا ہو سکتی ہے۔ دوستی کی لاج رکھنے کو یہ بھی لے

READING  
Section



رسائی کی مہم میں شامل ہوں۔ یہ دنیا مجھے جادو بھری دکھائی دینے لگی۔ نہ جانے کیسی بانسری کی لئے تھی کہ میں بے خود ہو گیا۔ وطن کی آزادی، وطن جو اپنی جان سے بھی پیارا ہے، جس پر ہندو اور انگریز نے تل کر قبضہ جمار کھا تھا۔ جس پر ظالموں نے یلغار کر رکھی تھی۔ میرا وطن، مقبول بٹ کا وطن۔ سب کا پیارا دلیس اب آزاد ہو چکا تھا۔

آزادی..... انگریز کی غلامی سے نجات کا نشہ چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اناج کی بوریاں دامگہ کے راستے سرحد پار لے جاتا۔ وہاں کے لوگوں کو دیتے وقت میرا دل کتابڑھ جاتا میں سمجھتا کہ میں انسانیت کے لئے بہت بڑا کام کر رہا ہوں۔ میں تو ایسا بے بس کھلوتا تھا کہ جدھر وہ میرے ہندو دوست چابی کھجاتے میں گھوم جاتا۔

حالات نے مجھے مقبول بٹ کا دشمن بنا دیا۔ میں نے اس سے کنارہ کر لیا۔ وہ میرے دروازے پر بھی آتا تو کوئی اسے منہ نہ لگاتا۔ ہندو دوستوں کے ساتھ میں جب انگریز فوجیوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا تو میرا دل اونچا اچھل جاتا۔ سارے گاؤں میں گڑ پنے بانٹا بھرتا۔ اس کے بعد ہمارا دروازہ ہی یہی کام ہو گیا کہ جو بھی کوئی صورت سے ہندو نظر آئے اور ذرا سی بھی ہندوستان کے حق میں آواز اٹھائے اس کا گھات لگا کر نشان ہی مٹا دو۔ ایسے ہی ایک دن جب ہم نے ایک بہت بڑا ہندو افسر گھیر کر مارا تو سب کا سیروں خون بڑھ گیا۔ رات بھر الاؤ کے گرد و حول بجا بجا کر ٹاڑی چلتی رہی۔ سب تپتے اور گاتے رہے۔

ایک شام مجھے میرے خفیہ ذرائع سے خبر ملی کہ بہت بڑا شکار پھنسا ہے۔ میں اس وقت گھر جانے کی جلدی میں تھا۔ لیلیٰ کے بیاہ کی بات چل رہی تھی، اس لئے جلد سے جلد تاریخ مقرر کرنا ضروری تھا۔ حالات جانے کیا سے کیا ہو جائیں۔

سڑک کے موڑ پر مجھے مقبول بٹ نظر آیا۔ میں کترا

گاؤں کے لوگ چادل، گڑ اور چنے کی بارش کرتے۔ لوٹنے والے ادا بد کر بھاگتے جو بھی ہاتھ آتا سمیٹ کر لے جاتے۔

رام کشور اور ششوپال تو میرے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ میں تو اب یہی کہوں گا کہ ان دنوں زندگی صحیح معنوں میں زندگی تھی۔ نہ فکر تھی نہ فاقہ دادا وقت پہ مل چلاتے، دانے بکھیرتے، پانی دیتے اور وقت پہ فصل کاٹتے۔ موسم اپنے وقت کے مطابق بدلتے تھے۔ ان دنوں تو بندپوں میں بڑا سر پلا بچ وٹم تھا۔ ہر طرف سبزے کی فراوانی تھی، بادل جھومتے آتے تھے، دھواں دھار برستے تھے۔ بجلی تڑپ کر کڑکتی تھی۔ ہوائیں اٹھلا کر چلتی تھیں۔ ہالیوں سے بھرے جھومتے مسکراتے کھیت لہرا لہرا کے اٹھیلیاں کرتے جیسے بچہ ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا ہو۔ کیسے کیسے دن و بے پاؤں گزر گئے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو جیسے ان دنوں کی بکھری ہوئی موسیقی روح کے تار جگانے لگتی ہے۔ بڑترے میں ایسے ایسے سر چھپے تھے کہ ساری کائنات مستی میں ڈوبی لگتی تھی۔

صبح کے وقت گاؤں کے سب لڑکے مل کر مدر سے جاتے۔ رات کو رات جگا مٹاتے۔ ہم سب ایک تھے۔ مسلمان اور اسلام کی جڑیں اس وقت بھی اس زمین میں بہت گہری تھیں۔ پانچ وقت مؤذن کی صدا اٹھ کر چلنے کی راہ بتاتی۔ سب مسجد میں جمع ہو کر وضو کرتے اور مل کر نماز پڑھتے۔ مقبول بٹ نماز میں ہمیشہ پہل کرتا۔ میں اس کو روکتا رہ جاتا مگر وہ یہی کہتا تھا کہ دیر سے نماز پڑھی تو کیا فائدہ؟ اس نے تو مرنے میں پہل ہی کی۔ چاہے یہ موت کس طرح بھی آئی ہو، ہماری دیکھا دیکھی رام کشور اور ششوپال بھی مندر جاتے تھے۔ کئی بار بحث ہوتی تو وہ یہی کہتے کہ خدا سب کا ایک ہی ہے۔ تم اگر اپنے خدا کے قریب جانا چاہتے ہو تم ہم اس سے دور کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ دن تو ایسے بڑا سرا رہا تھا کہ جیسے میں کسی سراغ

READING  
Section



سرور کی کیفیت چھائی رہتی۔ دن بھر ہم چپ چاپ سر جھکائے کھیتوں میں کام کرنے والے سیدھے سادے کسان دکھائی دیتے تھے، رات کو ہم بڑے افسروں کے گھر پہ چھاپے مارتے۔ ان کے بچوں کو تلواریں کی نوک پر اٹا لٹکا کر اچھا لیتے، زندہ جلا دیتے۔ تڑا تڑا ہڈیاں چٹنے کی آوازیں آتیں۔ جتنی تیز انسانی گوشت جلنے کی بو اٹھتی اتنی ہی تیز ہمارے روئیں روئیں میں آزادی کی خوشی بھرنے لگتی۔ آزادی تو دشمن کی لاش پر پاؤں رکھ کر ہی ملتی ہے۔

ہر طرف مسلم لیگ کی دھواک بندھی تھی۔ ہم ایک ہیں، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا، وطن کی آزادی ہم سب کی پکار ہے۔ ہم ایک ساتھ جنیں گے اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔ مسلم لیگ ایک کھلا سمندر بن چکی تھی۔ اس میں روز بروز ادھر ادھر سے ندی کی لہریں اٹھنی ہو کر مل رہی تھیں۔ ان میں کئی لوگ میرے گاؤں کے تھے۔ میں ان کی شکلیں پہچانتا تھا مگر اس سے بھی زیادہ میرے گمان سے بھی بڑھ کر سرحد پار سے لوگ کھس آئے تھے۔ ان میں انگریز فوجی بھی شامل تھے۔ رام کشور اور ششوپال مجھے سمجھاتے۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں، خیر خواہ ہیں۔ یہ ہمیں ہر دکھ سے نجات دلاتے آئے ہیں۔ میں ان سب کا احسان مند تھا، وہ میرے وطن کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے۔ میری مدد کر رہے تھے۔

مقبول بٹ کبھی مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ سفید ٹوپی پہن کر بس وضو کرتا رہتا۔ اس کا لہجہ اور ابھی اچھا معلوم نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ اقبال کے شعر پڑھ پڑھ کر دیوانہ ہوا جاتا۔ اس نے تو سارے کا سارا کلام ہی رٹ ڈالا تھا۔ ایک دن سب کی موجودگی میں مجھ سے بولا۔ ”اگر سچے مسلمان ہو تو اقبال کو سینے میں چھپالو“۔

رام کشور بدک اٹھا اور بولا۔ ”مقبول بٹ! تم کیا سوچتے ہو، کوئی بھی حکومت مذہب کی بنیاد پر نہیں چل سکتی“۔

کر بھاس گئے تو تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے قدم تیز کر لئے تو وہ بھی تیز تیز چلنے لگا۔ وہ تو بھانگتا بھی بہت تیز تھا۔ جیسے شکاری کتوں کی آواز پر ہرن چوڑیاں بھرتا ہے۔ کئی دنوں سے میں نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دیا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

”آنکھوں پر پردہ ڈال لیا ہے عبداللہ!“

وہ بڑی اچھی اردو بول رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔

”تجھے کیا؟“

”بے شک میری بات پر نہ دھیان دو، پر یاد رکھنا کہ ہندو کی بات میں نہ آتا۔ رام کشور اور ششوپال اس مٹی کے دشمن ہیں۔ ہندو کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔“

”میں تو شیریا باتوں میں نہیں آؤں گا۔“

”پچھتاؤں گے، بہت عبداللہ بھائی!“ اس نے فکر مند لہجہ میں کہا۔ ”یہ لوگ ہمیں ایک ایک کر کے مار دیں گے۔ ہندو کے دل سے کبھی منافقت ختم نہیں ہو سکتی۔“

”دیکھ لوں گا۔“

میں بھاگتا ہوا گھر جانے کی بجائے اس طرف چل دیا جہاں میرے سر پہ حاکم خان مجھے پہنچائے گیا۔

لاٹھیاں، خنجر، بھالے میرے منہ پر تھے۔ سردک سے ذرا نیچے ڈھلوان پر اتر کر تراکی میں دس بارہ آدمی درختوں کی اوٹ میں چھپے تھے۔ میرے دوستوں نے دور ہی سے پہچان کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آزادی کی پکار میں آنکھ جھپکتے ہی ہم ان آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ مار مار کر ان کی دھجیاں بکسیر دیں۔ ساری کی ساری زمین خون سے رنگ گئی۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی کہ وطن کی ہاگ تو اسی کے ہاتھ میں رہتی ہے جس کا خون مٹی میں رچ جائے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آئی بھی نہیں سکتا۔ میرے دماغ پر میری آنکھوں میں ہندو کی دوستی کا نقشہ چڑھا تھا۔ ان دنوں عجیب



سارے اندھیرے دور کر دے گی۔ ہمارے دھنوں کی تو بڑی لمبی فہرست تھی۔ میرے بھائیوں کو، میرے دوستوں کو روزگار نہیں ملتا تھا۔ آزادی ملے گی تو اونچی نوکریوں پر قبضہ جمائے بیٹھنے والے ہندو اور انگریز بھاگ جائیں گے۔ بڑی اسامیاں خالی ہو جائیں گی۔

سلی اور ملکہ کے بیاہ ہوں گے۔ دادا سے مل نکل نہیں سہلتا کوئی خزانہ ہاتھ لگے گا تو بڑھا پا سنور جائے گا۔ ابھی میں ہی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ نہ پڑھائی میں جی لگتا تھا، نہ کام کرنے کو جی چاہتا تھا۔

میرے سر پر تو انقلاب سوار تھا۔

ایک بار مسلمان آزاد ہو گا تو آسمان سے خوشیوں اور حقوق کی موسلا دھار بارش ہوگی۔ میں نے اس کے منہ پر بے تحاشہ پتھروں کی بارش کی دی۔

مقبول بٹ گال سہلاتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بیچ بیچ کر لڑے تو میرے ہاتھ میں اس کو مارنے کا بہانہ آ جائے۔ مگر وہ تو موم کا بنا تھا۔ کبھی بات کرتا تو سرگوشی میں جیسے اس کے چاروں طرف کان لگے ہوں۔ وہ مجھے بھی سمجھاتا تو اتنی پیار بھری آواز سنائی دیتی جیسے کوئی پہاڑی جھرنڈ آرام آرام سے بہہ رہا ہو۔ مگر میرا تو رداں رداں میرے ہندو دوستوں سے بندھا تھا۔ میں اُن کے خلاف کوئی بات کیسے سن سکتا تھا۔

یقیناً مقبول بٹ مکار تھا، بڑا دھوکے باز، بھیڑی کمال میں بھیڑیا جب میں کی صورت نہ ملتا تو وہ بڑا معصوم بن کر بولا۔

”بھائی! بد فطرت اور بد سرشت ہندو خبیث آپ کی مخالفت کرے گا، یہ آپ کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کرے گا۔“

میں نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا اس سے نہ کبھی کوئی واسطہ تھا اور نہ رہے گا۔ وہ پکا غدار ہے، قوم کا غدار، خدا کی سزا

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”جب خدا نے ہر انسان کو ایک ہی جیسا گوشت پوست کا بنایا ہے تو پھر یہ مذہب و مذہب کیا ہے۔ میں تو انسانیت کا پرستار ہوں۔“

مقبول بٹ مجھے باتوں باتوں میں الگ لے گیا۔ کہنے لگا۔ ”عبداللہ! تم ہندو کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم نے کلمہ کی پکار پر جو آزادی حاصل کی ہے وہ ہمارے واسطے جان سے بھی بڑھ کر قیمتی ہیں اپنے ملک اور قوم سے غداری مت کرو۔ ہندو سے دوستی چھوڑ دو۔“

میں نے اس کو تھپڑ مار دیا۔ پانچوں انگلیوں کے جھوپو نشان اس کے گال پر دیر تک جمے رہے۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”عبداللہ! یہ ہندو ہمارے دریاؤں کے ڈھار سے موڑ دیں گے۔“ گال سہلاتے ہوئے وہ چلایا۔ ”ہم کو ایک ایک بوتل کو ترسائیں گے۔ ہمارے کھیت بخر ہو جائیں گے، یہ ہمارا مال منڈیوں میں گھسیٹ کر لے جائیں گے۔“

میں نے اس سے پیٹھ موڑ لی۔

”ہندو کی دوستی کا سودا تمہیں مہنگا پڑے گا۔“ وہ پھر چلایا۔

”مقبول بٹ!“ میں تیزی سے مڑا اور اس کو غمو کریں مار مار کر عاجز کرنے لگا۔ میرے سر پر تو آزادی کا بھوت سوار تھا۔ ان دنوں میں کیسے سہانے خواب دیکھتا تھا۔ کھلی آنکھوں میں ایسا نور تو کبھی برسا ہی نہ تھا، جیسے میرے خوابوں میں ڈھلا ہوا اور سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑا غبدہ مل جانے کے خواب کی تعبیر۔

آزادی پاکستان میں گھر گھر خوشیاں برساتے گی۔ میرے اپنے گھر میں۔ میرے گاؤں میں۔ میرے سارے ملک میں کئی غریب ندر ہے گا، کسی کو کوئی دکھ نہ ہو گا۔ سارے قرضے چمک جھپکتے اتر جائیں گے۔ سارے رہن چھوٹ جائیں گے۔ آزادی تو ایک پھونک، رکر ہی

READING  
Section



میرے سامنے ہوئیں جیسے انصاف کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ میں سر سے پاؤں تک پشیمانی کے پسینے میں ڈوب جاتا۔ کبھی ان جھاڑیوں کے قریب سے گزرتا تو دل کی دھڑکن بڑھنے لگتی۔ ڈرتے ڈرتے نظر اٹھاتا تو مکھیوں کا ڈھیر اڑنے لگتا۔ اس کی آنکھیں ہر ذرے پر چمکتی دکھائی دیتیں۔

کئی دنوں بعد ان آنکھوں سے چمکارا پانے کو میں نے سب سے چھپ کر آدمی رات کو اُسے بغیر کفن کے دفن کر دیا۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پڑوا کے تیز جھونکے میرے کام میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔ مگر میں بے نیاز ہو کر اس کی بوسیدہ لاش کو دفنانے میں مصروف رہا۔

جب میں قبر کو بند کر کے اس پر گھاس اور جڑی بوٹیاں پھیلا رہا تھا تو پھٹ رچی گئی۔ تارے ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ میں بظاہر مطمئن ہو کر گھر واپس آ گیا مگر میری وحشت اور تنہائی میرا ساتھ نہ چھوڑ سکی۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا۔ ضرور کوئی زبردست طوفان آنے والا تھا۔

میرے دوستوں نے ہزار بار میری اداسی کا سبب پوچھا مگر میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ انہوں نے مقبول بٹ کے گھر کو آگ لگائی، اُس کے ماں باپ کو زندہ جلا دیا۔ چاروں بہنوں کو تشدد کر کے ڈنڈوں سوٹوں سے مار دیا۔ تو میں ان کے ساتھ ان تمام کاموں میں شریک نہیں ہوا۔ میری روح کو گھن لگ رہا تھا۔ میرا سب کچھ کھو چکا تھا۔ میں کہاں تھا، کیا تھا۔

آزادی مل گئی..... ہر طرف شادیانے بےجے اور میرے سب ہندو دوست مجھ سے آنکھیں چرا نے لگے۔ میں ان کے گھر جاتا تو باہر ہی سے جواب مل جاتا۔ راستے میں کہیں نہ بھیڑ ہوتی تو وہ رکھائی برتے پلک جھپکتے میں ہی سارے ناٹے ٹوٹ چلے تھے۔

موت ہے۔ میں نے طیش میں آ کر ساتھیوں کو پکارا۔ ”بڑا شکار پھنسا ہے، جلدی آؤ!“ وہ سب کے سب لپک پڑے، مقبول بٹ ان کے ڈر سے بھاگا نہیں، بڑے حوصلہ سے کھڑا رہا۔

”عبداللہ! میں آپ کا بھائی ہوں۔“ آخری مرتبہ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”آپ کو میری باتیں بہت یاد آئیں گی۔“

”جار ہنے دے۔“ میں نے کہا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ ”بڑا آپا نصیحت کرنے والا۔“

آن کی آن میں اس کو چیت گرا کر میں اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے چھڑانے کو ہاتھ پیر مارے۔ اپنی جگہ گھسٹانے لگا اور پھڑکنے لگا۔ تو رام کشور اور ششوپال نے اس کے بازو قابو میں کر لئے۔ پھر بھی وہ ٹانگیں مارتا رہا۔ ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اس کے حلق میں سے بھیا نک خرخراہٹ نکلتی رہی مگر میری انگلیوں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں۔ رام کشور نے جیب سے سرنج نکال کر اس کا خون بھرا اور زمین پر پٹکا دیا۔

مٹی پیاسی تھی، سارا خون ایک منٹ میں چوس گئی، کسی کو بھی یہ خیال نہ آ سکا کہ مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہو کر لال ہو جاتی ہے۔ مٹی کو اپنانے کے لئے تو اُسے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون سے سینچنا ضروری ہوتا ہے۔ مقبول بٹ نے اپنا زندہ خون دے کر اس زمین پر اپنی ملکیت کی مہر لگا دی۔ سب نے چاقو اور خنجر کے وار کر کے اس کی لاش کو چھلنی کر دیا اور اسے تھپیٹ کر جھاڑیوں میں چھوڑ آئے۔ کئی دن تک چیلیں اور گدھ لاش پر منڈلاتی رہیں۔

میں نے قہقہوں میں سب کچھ بھلانے کی کوشش کی مگر اس کی کھلی آنکھوں کو نہ بھول سکا۔ اکیلے میں بیٹھتا تو وہ

READING  
Section



پیارے لالہ زمین پر تھوک کر بیلوں کو شکار رہا ہوا بولا۔  
 ”بے وقوف بڑھا اب اپنی عزت کا سودا کرے گا۔“  
 دونوں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ تیل بے قابو ہو  
 گئے۔ اچھل اچھل کر دادا کے ہاتھ سونگھنے اور چائے کو سر  
 ترانے لگے۔ شکوہ ایسا مضبوط تھا کہ بے بس ہو کر رہ گئے۔  
 یوگ راج نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور

ترانہ مارنے لگا۔ دادا لنگڑا ہوا شام کو واپس آ گیا۔ مردہ  
 لگ رہا تھا۔ بھیک نہیں ملتی تھی۔ میں بھوک سے بے تاب  
 ہو رہا تھا۔ رات ہو رہی تھی۔ کئی دن سے گھر میں چولہا نہیں  
 جلا تھا۔ لیل اور ملکہ گھٹنوں میں سر دیئے چپ چاپ بیٹھی  
 تھیں۔ آسمان پر پھیلی چاندنی پھیلی تھی۔ چاند کے گرد ہالہ  
 تھا۔ شاید کسی بڑے طوفان کی آمد تھی۔

میں اپنی جوتیاں گھسیٹا کھات پر سے اٹھا۔ جا کر رام  
 کشور کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابھی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ وہ  
 اندر ہی سے بولا۔

”یہاں کچھ نہیں ملے گا۔“

”تم باہر تو آؤ۔“

”بہت مشکل ہے۔“

میں نے اس کی پرانی دوستی کا واسطہ دیا تو وہ آنکھیں  
 ملتا ہوا ہار آیا۔ کہنے لگا۔ ”سو نے بھی نہیں دیتے کبخت!“  
 جھگڑنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تدامت سے  
 گڑ گڑایا۔ ”کچھ نا کمال جائیں گے؟“

”نا کا..... کوئی درختوں پر تو نہیں لگتے..... ہاتھ پر  
 نوڈ کر ہی آتے ہیں۔“

”اس وقت بہت ضرورت تھی۔“

”ضرورت کے خیال سے ہی تو کہہ رہا ہوں۔“ اس  
 نے طعنے لگے۔

پھر وہ رک کر بولا۔ ”کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟“

”کام ملے جب نا!“

”کام کرنے کی تمہاری نیت ہی نہیں۔“

میں ان کے رویہ کو پہچان نہ سکا۔ ہر بار وہ  
 مصروفیتوں کا رونا روتے۔ اب کیسی مصروفیت تھی، میں  
 نے بار بار پوچھا۔ ہر بار ٹکا سا جواب مل گیا۔ میں بددل ہو  
 کر گھر میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں آتا نہ جاگتا۔ آزادی کی خوشی  
 کو گلے سے لگائے مقبول ہٹ کی یاد میں خون کے آنسو  
 بہایا کرتا۔

رام کشور، ششوپال آزادی کا خراج لوٹ رہے  
 تھے۔ راتوں رات میرے وطن سے مشینری اکھاڑ کر سرحد  
 پار بھیج دیتے تھے۔ گندم کے انبار غائب کر دیتے تھے۔ کچی  
 اینٹیں سمیٹ، سریا یہاں تک کہ طوں کے پچھلے زے بھی۔  
 جب ساری دنیا بے خبر سوتی تھی تب رات کے  
 پردے میں یہ کاروبار جاگتا تھا۔ ان سب کا تو جنم جنم سے  
 بھارتیہ بھوی کا ساتھ تھا۔ وہ تو ہندو ذہنیت کی پیداوار تھی۔  
 آہستہ آہستہ میرے وطن کی رونق اجڑنے لگی جیسے آسمان  
 سے ہڈی ول اتر اور ہمارے گھروں سے صفایا ہو گیا۔  
 یوگ راج نے ہمارا گھر رہن رکھ لیا۔ کچھ دن بعد بولا۔  
 ”گھر خالی کر دو۔“

”ہم نہیں جائیں گے، اب تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ہم کہاں جائیں؟“

”جہاں ہندو ہیں، اُس ہندوستان میں جاؤ۔ چند  
 سال پہلے یہ سارے گھر، کھیت کھلیان، باغ باغیچے ہمارے  
 تھے تم نے ڈاکہ ڈالا اور سب کچھ لوٹ لیا۔ تم انگریز کے پٹو  
 ہو۔“

گھر پر قبضہ، زمین پر قبضہ، دکان پر قبضہ، روزگار پر  
 قبضہ آئے دن جھگڑا۔

دادا بھوک سے تنک آ کر ریل کی پٹری بھیک مانگا  
 چلتا گیا۔ اس کی زمینیں دونوں طرف ذرا سی ڈھلوان اتر کر  
 تھیں۔ پیارے لالہ اور یوگ راج مل چلا رہے تھے۔  
 اونچی آواز میں گیت گارہے تھے، فتح اور خوشی میں ڈوبی  
 آوازیں۔ وہاں سے سنائی دے رہی تھیں۔ دادا کو دیکھ کر



ایک ایک کی پہلی میں نیزے کی نوک اتار دی۔ وہ کچھ دیر تک ترپتے رہے۔ پھر سناکت ہو گئے۔ میں نے ان کی ماؤں، بہنوں کو گھروں سے تھپیٹ کر ننگے سر ہیرا منڈی بازار میں چھوڑ دیا۔ میں پاگللوں کی طرح بھاگا، گرم گرم آنسو میری خوشی اور میری آزادی کا پیغام بن کر میری آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ مقبول بٹ کی قبر پر جا کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کو بے اختیار پکارا۔ وہ وہاں نہیں تھا، کہیں نہیں تھا۔ پھر میں بے ہوش ہو کر اس کی ڈھیری پر گر پڑا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں میں عداوت کے آنسو تھے۔ مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہوتی ہے۔ میں آزادی کا سورج دیکھ رہا تھا۔ شہادت کا فخر میرے نصیب میں نہیں تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سرخ مٹی سے قبر کی زمین پر پاندتار بنایا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کو اٹھا کر ماتھے پر سجایا۔ سینے سے لگا کر چوما۔ میں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ میری آواز دھرتی کا عین چیر کر مقبول بٹ تک پہنچی ہوگی۔

مجھ سے کیسی ٹھول ہو گئی تھی، میں نے ایسا کیوں کیا، مقبول بٹ سچا تھا، وہ ٹھیک کہتا تھا۔ آزادی کے چراغ لہو سے جلتے ہیں۔ وہ آزاد ہو گیا۔ پاکستان آزاد ہو گیا۔ کاش میں اب روحانی کرب سے آزاد ہو جاتا۔ پھر میں نے کھیتوں کی طرف دیکھا، واڈا پھر سے فصلوں میں شیر کی طرح چل رہا تھا۔ آج ایک آزمائش کی گھڑی میرے سامنے ہے۔ خون میں رنگی سرخ مٹی مجھ سے میرے گناہوں کا کفارہ مانگ رہی ہے۔

عشق و آزادی بہادر زیست کا سامان ہے  
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے  
عشق پر کروں فدا میں اپنی ساری زندگی  
لیکن آزادی پر میرا عشق بھی قربان ہے



میں پھکی چاندنی میں اس کے ماتھے پر پڑی شکنیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر سے اکڑتا ہوا بولا۔ ”کام نہیں کرنا چاہتے تو لیلیٰ کی شادی مجھ سے کر دو۔“

میں ہنسنے لگی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔  
میں نے آنکھوں میں آنکھیں ملائیں تو وہ لٹکا کر بولا۔

”احسان فراموش؟“  
”کیسا احسان؟“ میں نے پوچھا۔  
”واہ، اتنی جلدی بھول گئے..... تمہیں آزادی نہیں دی کیا؟“

میں نے اسے ہالوں سے پکڑ کر زمین پر گرالیا اور زبائے کا ہاتھ منہ پر مارا۔ پھر ٹھنڈوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگا اور جب واپس آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا، لڑکوں کا ایک ٹڈی دل میرے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں سب کو جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ رام کشور، ششوپال، رام سرور، یوگ راج، پیارے ہر دیال سب کے سب ایک ہی ذات، ایک ہی ذہنیت کے تھے۔ میرے گھر کے کواڑ چنچ رہے تھے۔ دیکھتے ہی شعلے بھڑکنے لگے۔ لیلیٰ اور ملک کی چیخیں آسمان کو ہلا رہی تھیں۔ لوگ انہیں تھپیٹ کر لے جا رہے تھے۔ وہ بے حال ہوئی جاری تھیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں نے طیش میں آ کر نیزے سے ان سب کے جسم چھلنی کر دیے۔

”اب بولو“ میں نے کراخت لہجے میں کہا۔  
ان کے پاس سہم کر چپ رہ جانے کے علاوہ اور چارہ بھی نہیں تھا۔

”سچ بولو، آزادی تم نے مجھے دی کہ میں نے چھینی ہے؟“ وہ چپ رہے۔

”بولو بولو لیتے کیوں نہیں؟“ وہ سوچتے رہے۔  
”اب سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ بولو“

پھر میں نے ان کے منہ پر بھر پور پھٹر مارے اور



## تقسیم کے وقت پیش آنے والا دل گداز واقعہ

: قابل فراموش

”کس منہ سے جاؤں پاکستان ابو جانی! میرے پاس کیا رہا ہے؟“

## آزادی کی قیمت



☆ محمد نذیر ملک

بڑی بھاری قیمت دے کر ہمیں یہ وطن ملا ہے۔  
 ماسٹر نور عالم 60 کے پٹے میں تھے جب وہ ہمیں  
 ساتویں جماعت میں تاریخ کا مضمون پڑھاتے تھے۔ تب  
 تاریخ انگلستان کے ساتھ ساتھ تاریخ ہندوستان بھی  
 پڑھائی جاتی تھی۔ وہ پڑھاتے پڑھاتے اکثر آبدیدہ ہو  
 جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم اور  
 ملک پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر آبادی کی جو  
 ہجرت ہوئی وہ برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی ہجرت

اگست کا مہینہ جہاں ہمارے لئے ہر سال خوشیوں  
 کا پیام بر ہوتا ہے کہ اس ماہ میں ہمیں آزادی  
 ملی، اپنا ایک الگ وطن ملا، ہمیں اپنی شناخت ملی۔ یہ مہینہ  
 ہمیں آزادی کی نعمت سے سرشار بھی کرتا ہے اور اس  
 شرف سے ہمکنار بھی کرتا ہے تو وہاں یہ ہمارے غموں کا  
 نقیب بھی ہے کہ اس پیارے وطن کے حصول کے لئے دی  
 جانے والی قربانیوں کی ہمیں یاد بھی دلاتا ہے اور آزادی  
 کے نام پر ہمیں لگنے والے زخموں کی گنتی بھی کراتا ہے۔

READING  
Section

SCANNED BY AMIR



آپس میں گاڑی چھنتی تھی۔ حتیٰ کہ ہمارے مال مویشی بھی اکٹھے چلتے چلتے تھے۔ یوں کہتا تھا ان کی بھی آپس میں دوستی تھی، وہ بھی ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی اور ہماری زمین بھی ساتھ ساتھ تھی۔ دارا سنگھ کے بھی دو جوان بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، لڑکوں کی آپس میں بڑی گہری دوستی تھی اسی طرح لڑکیاں بھی ایک دوسری کی خوب سہیلیاں تھیں۔

روزانہ دو پہر شام دونوں گھروں میں جو پکتا تھا اس کا آپس میں تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ کہیں شادی بیاہ یا لگی پر جانا ہوتا تو دونوں گھروں کے مرد اکٹھے اور خواتین اکٹھی ہو کر جاتیں۔ غرض دونوں گھرانے آپس میں شیر و شکر تھے۔ جب کہیں اکیلے میں ان کے یا ہمارے گھر سے کوئی کسی شادی بیاہ میں چلا جاتا تو لوگ باقاعدہ پوچھتے تھے کہ آج آپ کے ساتھ والے کہاں ہیں؟

سردار دارا سنگھ گھریلو اور نہایت نجی قسم کے مسائل پر مجھ سے مشورہ لیتے اور میں بھی ان کے سامنے اپنے مسائل کی پوچھی کھول دیتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا کہنا مان لیتے۔ دارا سنگھ کے بیٹے بڑے تھے۔ پڑھائی میں تو اتنے خاص نہ تھے لیکن ویسے زمینوں میں اپنے باپ کا ہاتھ بناتے تھے۔ وہ خوب گھروں جو ان تھے۔ میرے ہاں بیٹیاں بڑی تھیں جو کالج جاتی تھیں۔ بیٹے بھی ہائی سکول میں نویں دسویں میں تھے۔

ایک روز دارا سنگھ نے میرے گھر آ کر ایک انوکھی فرمائش کر ڈالی جس نے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے رنجیر کے لئے میری بڑی بیٹی زینب کا رشتہ مانگ لیا۔ دارا سنگھ کے لئے تو یہ فرمائش کر ڈالنا کوئی اتنا مسئلہ نہ تھا کہ اس کا بیٹا تھا مسئلہ میرے لئے آن پڑا کہ میں کیسے اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک غیر مسلم کے ہاتھ بکڑا دیتا۔ اب میں اگر انکار کرتا ہوں تو اس نازک موقع پر برسوں کے تعلقات اور بھائی چارہ جانے کا

تھی۔ ماسٹر نور عالم بتایا کرتے تھے کہ ملک کی تقسیم کے وقت وہ گورداسپور کے پرانے رہائشی تھے۔

”پاکستان معرض وجود میں آیا تو شروع میں ہمیں باور کرایا گیا تھا کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان کے حصہ میں آئے گا۔ اس لئے ہم لوگ مطمئن تھے کہ ہمیں کہیں نہیں جانا، یہیں رہنا ہے، یہی ہمارا پاکستان ہوگا۔ جبکہ ہمارے چاروں طرف ہر نو مسلمانوں کی نئے ملک پاکستان کی جانب ہجرت جاری تھی اور ہر طرف سے فسادات، قتل و غارتگری، لوٹ مار اور آتش زنی کی خبریں آرہی تھیں۔ وہاں پر میں گورنمنٹ خالصہ ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس سکول میں اکثریت سکھ طلباء کی تھی۔ وہاں میں نویں جماعت کو تاریخ پڑھاتا تھا۔ میری جماعت میں طلباء کی تعداد 25 تھی جن میں 5 مسلمان، 3 عیسائی، 2 پارسی اور 15 سکھ تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی سکھ تھے۔ ان کا نام سردار جگدیش سنگھ تھا۔

ملکی حالات کے پیش نظر سکھ لڑکے اکثر ”راج کرے گا خالصہ“ کا نعرہ لگا کر کرتے تھے۔ تاہم زندگی نہایت پرسکون طور پر روانہ ہواں تھی۔ علاوہ ازیں ہماری گھریلو زندگی اور خفا مثالی تھی۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو کالج سکولوں میں پڑھتے تھے۔ ہماری کچھ زرعی اراضی بھی تھی ہم نے مال مویشی بھی رکھا ہوا تھا۔ زمین حزاروں کو دے رکھی تھی۔ ہماری بہت اچھی گزر بسر ہو جاتی۔ ہمارے ساتھ والا گھر سردار دارا سنگھ کا تھا جو علاقہ کا بڑا زمیندار تھا۔ وہ اچھی خاصی زرعی زمین کا مالک تھا۔

دارا سنگھ کے گھرانہ کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات تھے یہاں تک کہ ہم نے مہمن کی دیوار سے ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے لئے الگ سے راستہ بنایا ہوا تھا۔ جہاں سے ہم ان کے اور وہ ہمارے گھر بلا جگ ٹوک آیا جاتا کرتے تھے۔ دونوں گھروں کی

READING  
Section



ملکی حالات کے پیش نظر سکول کان بند ہو گئے تھے۔ میں بھی گھر بیٹھ گیا، اسی لمحے میں میرے دن گزرنے لگے کہ میں دارا کو انکار کیسے کروں۔ کروں تو کیا کروں۔ نہ جانے اس کا رد عمل کیا ہو۔ وہ بہت اڑیل اور اپنی ہٹ کا پکا تھا اسے جتنا بھی جانتا تھا اتنا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اس انکار کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ میں ممکن تھا وہ دشمنی پر اتر آئے جس کا میں ان حالات میں قفل نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ دارا نے کوئی چیز مانگی ہو اور میں نے انکار کر دیا ہو یا میں نے کوئی بات کہی ہو تو اس نے نہ مانی ہو۔ مگر ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس آزمائش میں پڑ جاؤں گا۔ دارا سنگھ نے مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے یہ بات جب اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس کی مخالفت میں رائے دی اور کہا کہ رشتے ہمارے گھروں میں موجود ہیں۔ ضرور ایک غیر قوم میں کرتا ہے۔ تعلقات اور مراسم اپنی جگہ لیکن دین مذہب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ دارا سنگھ کی یہ ضد ٹھیک نہیں۔ پھر حالات ایسے ہیں کہ نئے ملک پاکستان کی جانب وسیع پیمانے پر ہجرت جاری ہے۔ یہ دو الگ الگ ملک ہوں گے پھر پیچھے کون آ جائے گا۔ لوگ اپنی جائیدادیں اور بھرے بڑے گھر اور کاروبار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ ایسے میں دارا سنگھ کو نامعلوم کیا سوچھی ہے۔ غرض سب نے اس رشتہ کے خلاف رائے دی۔

میں نے انہیں یہ بھی دلیل دی کہ ضلع گورداسپور پاکستان کے حصہ میں آئے گا ہم کہیں نہیں جائیں گے لیکن اندر سے میرا ضمیر مجھے مان کر نہیں دے رہا تھا۔ پھر جب دارا سنگھ کا اصرار بڑھا تو میں نے کیا کر دیکھ دارے، آج کل ملکی حالات بہت خراب ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف سے لوگ آ جا رہے ہیں۔ نامعلوم کوئی کہاں ہو گا

خوشہ تھا۔ یوں دونوں گھرانوں کی آپس میں بد مزگی پیدا ہونے کا قوی امکان تھا۔ کم از کم میں اس کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا گھر چاروں طرف سے سکھ برادری کے گھروں میں گھرا ہوا تھا۔ میرے رشتہ دار اور عزیز و اقارب سب ذرا دور رہتے تھے۔ دارا اور میں دوست بھی تھے اور پڑوسی بھی۔ کہتے ہیں ہمسائے ماں باپ جائے۔ مصیبت میں سب سے پہلے پہنچنے والے ہمسائے ہی ہوتے ہیں۔ عزیز و اقارب تو آتے آتے پہنچتے ہیں۔

رشتہ حاصل کرنے کی آس میں دارا سنگھ کے گھر والوں کی ہمارے گھر میں آمد و رفت معمول سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ ادھر ہم دونوں میاں بیوی سوچ سوچ کر ملکان ہونے لگے کہ انہیں کیا جواب دیں اور کیسے دیں۔ اگر ہم مذہب کو آڑ بنا کر جواب دے دیتے ہیں یعنی انکار کر دیتے ہیں تو ہمیں پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ ہماری آپس میں راہ و رسم بھی اتنی رہتی جہاں سے ہا آسانی دلیبی ہو سکتی۔ اس وقت دونوں گھرانوں نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ اپنے دھرم کے معاملہ میں دارا سنگھ بھی واہ گرد کا کٹر خالصہ تھا۔ وہ باقاعدگی سے گوردوارے مانتا ٹھیکے جاتا تھا۔ بسا اوقات اس کا سارا پر پوار بھی اس کے ساتھ جاتا۔ میں دارا سنگھ کو حکمت سے ٹالنا چاہتا تھا اور وہ میرے سر پر سوار تھا کہ میں اسے ہاں پانہ کا فوری جواب دوں۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے اتنی ایسا جلدی تھی ملکی حالات دگرگوں تھے۔ دونوں طرف وسیع پیمانے پر ہجرت جاری تھی۔ ہر طرف قتل و غارتگری عصمت دری اور لوٹ مار کی خبریں آ رہی تھیں۔ ایسے میں دارا سنگھ مجھ سے ضد لگا کر بیٹھ گیا کہ بنی کا رشتہ دو۔ اس حوالے سے اس نے اپنے گھر والوں کو بھی ذہنی طور پر اتنا مائل کر ڈالا تھا کہ انہوں نے تو ہمارے گھر میں چھاؤنی ہی ڈال رکھی تھی۔ ہر وقت ان کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بے گھر میں آیا ہوتا۔

READING  
Section



تھا۔ میں نے دارا کے تئیں بھانپ لئے تھے اور پھر مجھے اس کی عادات و اطوار کا بھی یہ خوبی علم تھا۔ وہ کوئی بات کہتا اور آگے سے کوئی انکار کر دیتا اسے وہ اپنی خشک سمجھتا اور یہ ہنگ اور بے عزتی اس سے برداشت نہ ہوتی۔ اسے انکار سننے کی عادت نہ تھی۔

آخر اسی شش و پنج میں ایک دن یہ روح فرسا خبر ملی کہ ضلع گورداسپور بھارت میں شاطرن کروایا گیا ہے اور یہ کہ یہاں کے مسلمان پاکستانی علاقوں میں جائیں گے۔ مسلمان کہتے ہیں آگے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہر کوئی سہا ہوا نظر آتا تھا۔ البتہ کچھ اور ہندو خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ کہ انہیں کہیں نہیں جانا پڑے گا اور یہ کہ مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے مکانات، جائیدادیں اور زمینیں ان کے قبضہ میں ہوں گی۔

اس کے ساتھ ہی گورداسپور سے مسلمان آبادی کا انخلاء شروع ہو گیا، لوگ ذرے ذرے ہوتے تھے۔ ان تک پہلے ہجرت کرنے والے قافلوں نے حالات و واقعات پہنچ چکے تھے۔ بہرحال مسلمانوں کو یقین دلایا جانے لگا کہ انہیں باقاعدہ فوج کی نگرانی میں اپنی منزل مقصود تک پہنچایا جائے گا لیکن کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس طرح کے واقعات ہو چکے تھے۔ جب اس طرح کی حفاظت کا باوجود بھی مسلمان قافلوں پر شب خون مارے گئے اور بے رحم قتل و غارت اور عصمت دری کے واقعات منہور پناہ ہوئے۔ حفاظتی فوج نے بھی ان واقعات سے چشم پوشی کر لیا اور سب سے فوجی غائب رہی۔

بہرحال شہر میں کئی ایسے قبضہ گرد پناہ چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کے گھر میں آتے اور انہیں فوری طور پر گھر چھوڑنے پر مجبور کرتے۔ بعض چھوٹے پر آشوب زنی کی دودھ دہکائی بھی ہوئے تھے۔ وہ عیسویوں کے مکان چھوڑنے سے پہلے ہی گورداسپور پر قبضہ پاتے تھے باوجود

کوئی کہاں۔ اس معاملہ پر سوچ بچار کو ہم سو خر کر دیتے ہیں۔ تاوقتیکہ وقت ہی کوئی فیصلہ کر دے۔

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ گورداسپور پاکستان بننے کا آپ تو پھر بھی کہیں نہیں جانے والے۔ واہ گورو کی کرپا تہم نے بھی مخالف ماں کا دودھ پیا ہے وقت آیا تو ہم بھی یاروں کی خاطر جان لڑا دیں گے۔“ دارا نے بھائی پر ہاتھ مار کر یہ بھاشن دیا۔

”ابراہیم جوش کے ناخن تو تمہیں شاید حالات کی سنگینی کا کھل ادراک نہیں۔ گورداسپور کا نقشہ ایسا ہے کہ ہندوستان اسے بھی نہیں چھوڑے گا۔ حیدر آباد اور جونا بڑھ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔“

”تو میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں۔“ دارا نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”اچھا چلو ایسا کرتے ہیں کہ ابھی صرف بگائی (مٹنی) کر لیتے ہیں اور شادی جب حالات ٹھیک ہوں گے تب کر لیں گے۔ یہ تو نور عالم تمہیں منظور ہو گا۔ یا یہ بھی نہیں؟“

”تم میری بات نہیں سمجھ دارا سنگھ!“ میں نے کہا۔ ”یہ موقع بچوں کی مٹنی یا شادی بیاہ کا نہیں، نہ جانے ہم کہاں ہوں گے اور آپ کہاں۔ ہر طرف سے بڑی بڑی خبریں آرہی ہیں۔ موقع کی نزاکت کو سمجھو۔ میں نے اسے قائل کرنے کے سے انداز میں بات کہی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اسے صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہئے تھا اور اسے یہ جواب لینے میں بہت جلدی تھی۔ بچوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے دارا کا اصرار بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ دارا کی بیٹیوں نے بھی ہمارے گھر آ کر نہن کو بھاؤ کہنا شروع کر دیا اور پہروں میری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اپنا پیار جتا میں اور اس کے سامنے اپنے بھائی رگھیر کی تعریفیں کرتی نہ تھکتی تھیں۔ حالات کی نزاکت کے باعث میں دارا کے گھرانے سے اپنے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا

READING  
Section



”خند نہ کرو دارے!“ میں نے اس سے کہا۔  
 ”ہمارا بڑا اچھا بھائیوں کی طرح وقت گزرا ہے۔ ہمارے  
 ہاں ہمیشہ یگانگت اور بھائی چارے کی فضا قائم رہی ہے  
 ہم اچھی یادیں لے کر ایک دوسرے سے رخصت ہوں۔  
 یہ یادگار وقت تھا اسے یادگار ہی رہنے دو۔ اسے اپنی  
 ناجائز ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے داغدار نہ کرو۔“

”کچھ بھی ہونے نہ ہو تم نہیں لے جا سکتے۔ یہ اس  
 گھر کی بہو ہے۔“ دارا تلخ ہنچے میں مخاطب تھا۔

”ہاں چاچا! یہ میری منگ ہے اسے چھوڑ دے۔“  
 یہ دارے کے بڑے بیٹے کی آواز تھی جو بڑھک کے  
 منشا بہ تھی۔

”دیکھو دارے! میں سب کچھ چھوڑے جا رہا  
 ہوں۔ اپنا گھر چھوڑ رہا ہوں، اراضی چھوڑ رہا ہوں اور کیا  
 چاہئے تمہیں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جا رہا ماسوائے  
 ان بچیوں کے یہ میری اولاد ہے میرا خون ہے۔ میں اسے  
 کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“ میں نے دارے کو سمجھاتے ہوئے  
 بات کی۔ ”ہمیں جانے دو ہمارا وقت برباد نہ کرو، ہمارے  
 راستے سے ہٹ جاؤ۔“

”تمہیں کون روکتا رہا ہے، ہم تو صرف اپنی چیز  
 اپنے پاس رکھ رہے ہیں۔“

”بھلا تمہاری چیز کیسے ہو گئی؟ کیا کوئی نسبت بٹے  
 ہوئی تھی۔ اگر ہو بھی جاتی تو جب تک نکاح نہ ہو جائے  
 اور باپ اجازت نہ دے بیٹیاں یوں گائے بھینسوں کی  
 طرح پکڑائی نہیں جاتیں۔ تم خود بیٹیوں والے ہو  
 دارے! ذرا سوچو تو!“

لیکن دارا اور اس کے بیٹے ہمارے راستے میں تن  
 کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کرپا نہیں نکال لیں، وہ  
 سمجھنے یا سمجھوتہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ برسوں کے  
 تعلقات اور بھائی چارہ کو انہوں نے ایک طرف رکھ دیا  
 تھا۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ تمہیں چھوڑنا چاہتا تھا

محلہ میں بار بار اعلانات ہو رہے تھے کہ مسلمان گورداسپور  
 چھوڑ دیں۔ انہیں بحفاظت اپنی منزل مقصود تک پہنچایا  
 جائے گا۔

ہم بھی اپنا رخت سفر باندھنے لگے۔ طے یہ پایا کہ  
 سب رشتہ دار مل کر ہمارے گھر آ جائیں گے اور یہاں  
 سے قافلہ کی صورت میں نکلنے کے کیونکہ شہر سے نکلنے کے  
 لئے راستہ ہمارے گھر کے سامنے سے ہو کر گزرتا تھا۔ اچھا  
 خاصا دن چڑھ آیا تھا جب ہمارے رشتہ دار اور عزیز و  
 اقارب ہمارے گھر کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ وہ  
 اپنے ساتھ گھریلو سامان سے لہے رہیزرے بھی لاتے  
 تھے جن کے آگے نل اور گائیں جتی تھیں۔ موٹی چونک  
 گھر کے تھے یہی خیال تھا کہ اسی بہانے یہ بھی پاکستان  
 پہنچ جائیں گے اور وہاں کام آئیں گے۔ ہم نے تیاری تو  
 رات ہی سے شروع کر دی تھی۔ ہم بچا کھچا ضروری سامان  
 رہیزروں پر رکھ رہے تھے کہ دارا سنگھ اور اس کے دونوں  
 بیٹے ہمارے گھر کے سامنے آ گئے۔

”جار ہے ہو نور عالم؟“ دارا سنگھ نے معنی خیز  
 نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں دارے!“ میں دارے کو گلے لگانے کے  
 لئے آگے بڑھا۔

”نمبر نور عالم! ہماری امانت تو دیتے جاؤ۔“  
 ”کون سی امانت..... میں سمجھا نہیں؟“

”اتنے بھولے بھی نہ بنو۔“ دارے نے کہا۔ ”میرا  
 مطلب ہماری بہو نہنہ سے ہے، وہ میرے بیٹے رگبیر  
 کی منگ ہے، یہ ادھر ہی رہے گی۔“

”کیا کہہ رہے ہو دارے سیاں؟“ میں نے شپٹا کر  
 کہا۔ ”یہ رشتہ کب طے ہوا تھا؟“

”ہوا تھا یا نہیں ہم تو اسے اپنے گھر کی عزت مانتے  
 ہیں اور یہ ہمارے گھر میں رہے گی۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں  
 جا سکتی۔ دارا سنگھ کی آواز سب سے گویا ہوا۔



”نہیں پتر کسی کی مان بھی لیتے ہیں..... یہ میری طرف دیکھ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں..... واہ گورو کی ہے!“

”اچھا پھر اگر ان کی بھی منہ ہے تو یہ چلے جائیں لیکن اگر راستہ میں کوئی گڑبڑ ہوگئی یا انہیں نقصان پہنچا تو پھر ہمیں الزام نہ دیتا۔“

”راستہ کی یہ جانیں اور ان کے مقدر، یہاں سے تو انہیں جانے دے۔“ بوڑھے سکھ نے اپنی بات مکمل کی۔ دارا نے راستہ چھوڑ دیا اور بیٹوں کو بھی پیچھے ہٹا لیا۔

قافلہ چل پڑا۔

مگر نہایت سست رفتاری سے۔ کوئی فوج وغیرہ نہ آئی۔ جلد ہی رات چھا گئی سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ خواتین اور بچوں کو سردوں اور جوانوں نے اپنے حصار میں لے لیا اور ان پر پہرہ دینے لگے۔ رات خیریت سے گزر گئی قافلہ صبح پھر روانہ ہوا۔ اپنے محبوب وطن پاکستان کی ایک جھلک دیکھنے کا مشتاق ان دیکھی منزل کا قافلہ دن بھر چلتا رہا۔ دوسری رات آگئی۔

گزشتہ رات کی طرح مردوں نے عورتوں اور بچوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور پہرہ شروع ہو گیا۔ قریب دو بجے رات زبردست شور کے ساتھ قافلہ پر دو اطراف سے حملہ ہو گیا۔ حملہ آور پوری طرح مسلح تھے جن میں اکثریت سکھوں کی تھی۔ سکھوں نے اکثر ڈھالے باندھے ہوئے تھے اور چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ مسلمان جوانوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ان کے پاس چاقو، بھالے اور چھڑیاں (کلہاڑیاں) تھیں۔ انہوں نے بھی حملہ آوروں کا خاصا نقصان کیا لیکن ان کا حملہ بڑا منظم تھا اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ آسمان صاف تھا اور چاند بھی خوب چمک رہا تھا۔ ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ حملہ آور تو اپنے ساتھ مشعلیں بھی لائے تھے جن سے کافی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دارا سکھ اور اس کے

لنگ گیا تھا۔ وہ گھرا ب ہمارا کب رہا تھا اس کے تو دور دیوار ہمارے دشمن بنے ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا ہمیں نکال باہر کرنے کو تیار تھے۔

”دیکھو چاچا! اگر ہم اس فاختہ کو چھوڑ بھی دیں تو راستہ میں خالصہ سرکار کے کتنے باز بیٹے ہیں وہ اسے فوج ڈالیں گے۔ یہاں یہ ہماری حفاظت میں رہے گی۔ جب امن ہو جائے گا تو پھر آ کر اپنی امانت لے لے جاتا۔“

دارے کا بیٹا پھر گویا ہوا۔

”اجمقوں جیسی باتیں نہ کرو رگھیر کا کے!“ میرا بڑا بیٹا لٹکا رہا۔

”مٹھیر تجھے تو میں دیکھ لیتا ہوں۔“ دونوں اطراف کے بڑے بوڑھے اور بزرگ درمیان میں آن کھڑے ہوئے اور بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگے۔ جو مدتوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھ دارے تھے آج ایک دوسرے کی جان کو آ رہے تھے۔ دارا اور اس کے بیٹے تو آپے سے باہر ہو رہے تھے۔

”دارا! پتر ان مسللوں کا راستہ چھوڑ دے انہیں جانے دے۔“ ایک بزرگ سکھ نے کہا۔ ”اپنے ہاتھ خون سے مت رنگ۔ ان کا پاکستان ان کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ یہ وہاں خیریت سے پہنچے تو تباہی مٹا دے۔ راستے میں ہی ان کے گھڑے ہو جائیں گے۔“

”اس لئے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ ہماری امانت ہمیں دے جائیں ہم اس کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کریں گے۔“ دارا بولا۔

”نہیں پتر انہیں جانے دے، ان کی منزل کھوٹی نہ کر۔“ ایک بوڑھے سے سکھ نے دارے کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”خواہ مخواہ جانے دیں چاچا جگند را! واہ گورو کی رحمت! کیا ہو سکتا ہے؟“



مجھے مل جائے۔ پولیس اور کیشن کو معیت میں ہم گورداسپور تھے گھر دیکھا جس کے آگن میں میرے بچے اور بچیاں لپی بڑھیں اور کھیلی کودی تھیں، اب اس گھر میں دارا کا بڑا بیٹا رکھیر رہتا تھا۔ اس کے نام کی باہر تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے سابقہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ زینب نے دروازہ کھولا، مجھے دیکھ کر اس کی چٹخیں نکل گئیں وہ مجھ سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

اس کے پیچھے دارا کا بڑا بیٹا رکھیر کھڑا تھا۔ میں اندر گیا۔ سامنے چار پائی پردو جڑواں بچے پڑے تھے۔ میری بیٹی مجھ سے منہ چھپانے کو دوڑ گئی۔ میں نے بھائی کا پوچھا تو وہ پھر پینچنے لگی۔ بعد میں اسی نے بتایا کہ وہ ہمارے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہمیں اپنی گھوڑی سے گرا دیا تھا۔ دو بدولائی میں رکھیر نے اپنی کرپان اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور اس نے وہیں جان دے دی۔ مجھے زبردستی یہاں لایا گیا اور مجھ سے شادی کر لی گئی۔ میرے ہاں یہ جڑواں بچے ہوئے۔ دارا سنگھ تو اس دنیا میں نہیں وہ بھی فسادات میں مارا گیا تھا۔

”کیا وہ میرے ساتھ پاکستان چلے گی؟“ میں نے بیٹی سے کیا۔

”کس منہ سے جاؤں پاکستان ابو جانی! میرے پاس کیا رہا ہے؟“ اس نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا پاکستان آپ کو مبارک ہو۔“

میں بیٹی کو روتے بلکتے چھوڑ کر واپس آ گیا۔ میری اکیلی جان ہے۔ اگست کا مہینہ آتا ہے تو مجھے ہنسنا تا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے لیکن یہ آزادی اور اپنا آزاد وطن ہم نے بہت قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ اس کی قدر کریں۔ یہ کہتے ہوئے ماسٹر نور عالم کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ اپنے رومال سے آنسو صاف کرنے لگ پڑے۔

بیٹوں اور بعض دوسرے سکھوں کا جتنا تھا جن کو میں پہچانتا تھا۔ اکثر سکھ گھوڑیوں پر سوار تھے۔ وہ گھوڑیاں دوڑاتے اور مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا دیتے اور ساتھ کرپانیں بھی چلاستے۔ جس سے مسلمانوں کے قافلہ کا کافی نقصان ہو رہا تھا۔

دو بدولائی میں نو جوان مسلمان سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ سکھ قافلے میں کسی طرح نو جوانوں کے حصار کو توڑ کر قافلے میں گھری ہوئی خواتین تک پہنچنا چاہتے تھے۔ آخر موقع پا کر وہ خواتین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خواتین نے بھی لائیووں وغیرہ سے مزاحمت کی لیکن کہاں تک۔ وہ ایک ایک خاتون کا چہرہ دیکھتے اور اسے پہچاننے کی کوشش کرتے۔ آخر انہوں نے زینب کو پہچان لیا اور اسے پکڑ لیا اسے اٹھا کر گھوڑی پر ڈال کر ایک سکھ نے مجمع کا حصار توڑتے ہوئے گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ میرے بڑے بیٹے نے جب یہ دیکھا تو اس نے ایک گھوڑ سوار پر چھوڑی کا زوردار وار کر کے اسے اپنی گھوڑی سے گرا دیا اور خود کو دگر گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اپنی بہن کو اٹھا لے جانے والے سوار کے پیچھے گھوڑی لگا دی۔

اس کے بعد میرا بیٹا واپس آیا نہ اس کی بہن اور میں دونوں کا انتظار کرتا رہ گیا۔ میری بیوی، دوسرا بیٹا اور بیٹی مارے گئے۔ ہم باقی ماندہ لٹے پٹے مسافر آگے کے رہے نہ پیچھے کے۔ مجھے اور میری طرح کے بد نصیبوں کو اپنی اولاد کا غم سہنے کے لئے زندہ چھوڑ دیا گیا۔ ہم اپنی جانوں کو تھمتے پاکستان پہنچ گئے لیکن سچ پوچھیں تو میں اپنا جسم تو سلامت لے کر پاکستان پہنچ گیا لیکن میری روح زخموں سے چور چور تھی۔ میرے دونوں بیٹے، بیٹیاں اور اہل پاکستان پر قربان ہو گئے۔

پاکستان بننے کے بعد مغویہ خواتین اور بچیوں کی بازیابی کے لئے جو دطرزہ کیشن بنائے گئے میں ان کے ساتھ اپنی بیٹی زینب کی بازیابی کے لئے بھارت گیا کہ وہ

OMO

SCANNED BY AMIR

Section



# دستِ شفاء

## اگر آپ کا بچہ بولتا نہیں.....

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)

0321-7612717

ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)

ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب

ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن

شعبہ طب و نفسیات

### رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

گوٹے بچوں کے کیس بڑی کامیابی کے ساتھ کر چکا تھا۔ ایک کیس میں خوشاب کی ایک بچی تھی جس کی عمر تقریباً 12 سال تھی جو کہ بالکل ہی بولتی نہ تھی، ڈاکٹروں کو چیک کروایا تو انہوں نے بتایا کہ زبان میں کوئی فالٹ نہیں لیکن زبان سے دماغ تک کے Nerves کام نہیں کر رہے۔ جب اس کی ہسٹری لی گئی تو معلوم ہوا کہ بچپن میں بچی کو ٹائیفائیڈ بخار ہوا تھا جو کہ تقریباً پندرہ بیس دن تک رہا۔ ایلو پیتھک علاج کرایا گیا جس سے بخار تو اتر گیا مگر مذکورہ بچی جو کہ پہلے ”ماما پاپا“ کہتی تھی اب بالکل خاموش ہو گئی ہو گئی اور ”اوں آں“ کے سوا کوئی آواز نہ نکال سکتی تھی۔ جب کیس میرے پاس آیا اور میں نے چیک کیا تو اندازہ ہوا کہ ابھی تک اندرونی بخار موجود ہے جو کہ ختم

اس ماہ کے شمارے میں جو کیس میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ کئی لحاظ سے بہت ہی اہم اور منفرد بھی ہے۔ منفرد اس لحاظ سے کہ اس میں انسانی سوچ کی ایک بہت ہی گھٹیا قسم کا کردار بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ کیس پایہ تکمیل کو نہ پہنچتے پہنچتے ایک سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ میرے لئے ایک ناقابل فراموش کیس ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آج سے تین سال قبل جب کہ دستِ شفاء کا ایک دفتر / کلینک اکبر چوک گلستان کالونی نمبر 1 فیصل آباد میں بھی تھا اور میں ہفتے میں 4 دن وہاں پر مریضوں کو دیکھا کرتا تھا اور ذاتی رہائش گاہی وہاں پر بھی تھی۔ پھر میں اس سے قبل میں دو عدد



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)



میں نے اس سے ملاقات کی تو اس کا بھائی کہنے لگا کہ تو لمبی فرق نہیں لہذا علاج نہیں کرا تا (حالانکہ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ کم از کم چار سے چھ ماہ تک علاج ضرور کرائیں۔ میرے دل کو اس کی بات سے اطمینان نہ ہوا تو میں نے خود اس کے بھائی مریض سے ملاقات کی۔ اس سے اشاروں میں بات کی تو اندازہ ہوا کہ جیسے وہ از خود بولنے کی کوشش کر رہا ہے اور جملوں کے Starting الفاظ اس کی زبان سے نکلنے والے ہوں۔ میں نے اس بات کو بہت اچھی طرح نوٹ کیا اور پھر واپس آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دو انیاں اپنا کام کر رہی ہیں اور مریض خاصا بہتر ہو رہا ہے۔ مگر اب میں ان کی اجازت کے بنا علاج نہیں کر سکتا تھا تاہم میں نے اس کی وجوہات پر غور کرنا شروع کیا اور کئی دن غور کرتا رہا تو آخر جو بات سمجھ میں آئی خدا معاف کرے کہ انسان اتنا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے۔ وجہ صرف یہ سمجھ میں آئی تھی کہ مریض لڑکا سویتا تھا۔ بڑا بھائی پہلی بیوی سے تھا جو فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ چھوٹا بھائی دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا۔ بڑے بھائی کی سوچ یہ تھی کہ آج یہ مجبور اور ذہنی معذور ہے میری ہر بات بے چوں و چرا مان رہا ہے اگر ٹھیک ہو گیا تو نہ صرف میرے ماتحت رہنے سے انکار کر دے گا بلکہ اس کو جائیداد سے حصہ بھی دینا پڑے گا اور جو میری ٹھانڈ باٹھ سے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس نے اپنے بھائی کے اچھے مستقبل کا نہ سوچا بلکہ اپنی انا اور مطلب کو آگے رکھا۔ اللہ ایسی گھٹیا سوچ سے سب کو بچائے آمین!

یہ باتیں مجھے ان کے ایک رشتے دار کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور ان کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ یہ حیثیت ایک معالج اور مسیحا یہ بات میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ مجھے اللہ کے بھروسے اس بات کا یقین تو کہ یہ لڑکا ٹھیک ہو جائے گا مگر میں زبردستی اس کا علاج

نہیں ہوا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی رائے سے میں نے پورا اتفاق کیا کہ زبان سے دماغ تک جانے والے Nerves بالکل کام نہیں کر رہے لہذا اس بات کو بنیاد بنا کر میں نے اس کا علاج شروع کیا۔ عرصہ تین ماہ کے اندر ہی اس میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور بچی نے چند الفاظ ادا کرنے شروع کر دیئے اور اگلے تین ماہ بھی تواتر کے ساتھ کیس میں ترقی ہوتی رہی تاہم یہ قسمت کی ہی بات ہے کہ سردیوں کے دن تھے جب بچی کو اچانک نمونیہ ہو گیا اور پھر وہ اللہ کو پیاری ہو گئی ورنہ وہ پاکستان میں فرسٹ کیس ہوتا کہ ایک گوگلی بچی مکمل بولنے لگی ہوتی۔ تاہم قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے اس کے آگے کسی کا زور نہیں۔

دوسرا کیس بھی تقریباً اسی قسم کا تھا مگر وہ لوگ کسی وجہ سے علاج مکمل نہ کرا سکے اور علاج درمیان میں ہی چھوڑ دیا تاہم کسی قدر شفا یابی ضرور ہوئی اب میں تیسرے اور اصل کیس کی طرف آتا ہوں۔

یہ کیس فیصل آباد سے تعلق رکھتا ہے۔ مریض لڑکے کی عمر تقریباً 16 سے 18 سال کے درمیان تھی۔ دیکھنے میں ہی نیم پاگل سا لگتا تھا مگر کسی کو نقصان نہیں دیتا۔ اشاروں کی زبان تھوڑی بہت سمجھ لیتا اور بازار سے سودا وغیرہ بھی لے آتا۔ اس کا بھائی جیولری کا کام کرتا ہے اس کے علاوہ ایک مکان اور سرگودھا میں باغات وغیرہ بھی ہیں۔ ایک روز میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ بولتا نہیں۔ اس کا علاج کرنا ہے۔ میں نے اس کو بغور چیک کیا۔ دانت اور منہ بھی دیکھے۔ دانت بھی خراب اور منہ سے پانی بہہ رہا تھا۔ جیسا کہ اکثر نیم پاگل لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں نے اس کو ایک ماہ کی دو انیاں دیں۔ اس کے بھائی نے جو کہ ہومیو پیتھک سے قدرے واقفیت رکھتا تھا دو پوچھی مگر میں نے نہ بتائی اور کچھ احتیاط نہیں بتائیں۔

جب ایک ماہ ہوا تو وہ میرے پاس دوبارہ نہ آیا

READING  
Section



مذہب سے اجالے تک

یہ ہونے اور نہ ہونے کو بھی ہم نے اپنی مرضی پر کیوں ڈھال  
رکھا ہے۔ بس ہمیں وہ ہی ہونا چاہئے جو ہمارا خدا چاہتا ہے



## شک اور یقین

0331-5178929

☆ ریزنٹ

انسان اپنے آپ کو جتنا مضبوط سمجھتا ہے اتنا ہوتا ہے۔ جتنا دھکی سمجھتا ہے وہ اتنا دھکی ہوتا ہے۔ جتنا بیمار سمجھتا ہے وہ اتنا بیمار ہوتا ہے۔ اگر بیمار اپنے آپ کو تندرست سمجھے تو تندرست ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ بس سمجھ سمجھ کی بات ہے۔ کچھ جاؤ تو تم سمجھدار ہو اور سب کچھ پاس ہے تمہارے۔

یہ سب معاملہ یقین کا ہے۔ یقین جانو یقین سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ یقین ہی ایک عام انسان کو خاص کرتا ہے اور خاص کو مقرب ہونے میں نسبتاً کم وقت لگتا ہے۔

لیکن یقین نے تو بے جان پتھر کو بھی خدا بنا ڈالا۔ تو یقین جان بربک پہنچانے کے ساتھ ساتھ جان لینے کی بھی قابلیت رکھتا ہے؟ تو کیا شک کی اہمیت بھی اپنی جگہ بے تحاشہ ہے؟ ہاں بالکل ہے کیونکہ کچھ بڑھیاں پہلے اسی شک نے ہی تو ہمارے اجداد کو مسلمان کیا تھا۔

دو مخالف چیزیں اور دونوں کے فوائد ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پر ایسا ہی ہے۔ خدا یقین ہے، خدا ایمان ہے، پر خدا غیر اللہ پر شک بھی تو ہے لیکن خدا تو ہر جاتی ہے۔

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



ہے اور لوہا ڈوب جاتا ہے اور اگر دونوں کو اکٹھا باندھ دیا جائے تو ان میں سے کسی کی خصوصیات اثر انداز ہوں گی جس کا وزن اور حجم زیادہ ہوگا۔ اگر کمزری بڑی ہو تو وہ لوہے کو بھی ڈوبنے نہیں دے گی اور اگر کمزری چھوٹی ہوئی تو لوہا اس کو بھی ساتھ لے ڈوبے گا اور یہاں ان کے ڈوبنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے۔

میں نے یہ دیکھا اور سنا تو سمجھ میں آیا کہ اچھا تو یہ بات ہے کہ ہمیشہ بڑی چیز ہی اثر انداز ہوتی ہے، ہمیشہ مضبوط کا اثر ہوتا ہے کمزور پر۔ ہم ہمیشہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو تاکید کرتے ہیں کہ برے لوگوں کی صحبت سے بچو۔ اصل میں ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تمہاری اچھائی کمزور ہے اور اس کی برائی بہت مضبوط ہے وہ تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم یہ تاکید کیوں نہیں کرتے کہ تم اچھائی کو مضبوط کرو اتنے بڑے ہو جاؤ کہ وہ تمہیں ڈبو نہ سکے اور تم اسے پار لگا دو۔

کیا یہ ہی اصل چیز نہیں ہے؟ کیا ہم اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں؟ کیا ہمیں ڈوبنے کا خطرہ اس لئے نہیں کہ ہم اس کو پار لگانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

کیا میں وہ نہیں ہوں جو مجھے ہونا چاہئے؟ یا مجھے وہ ہونے کا خطرہ ہے جو مجھے نہیں ہونا چاہئے۔ تو کیا میں کسی کو وہ نہیں کر سکتا جو اسے ہونا چاہئے؟ اور یہ ہونے اور نہ ہونے کو بھی ہم نے اپنی مرضی پر کیوں ڈھال رکھا ہے۔ بس ہمیں وہ ہی ہونا چاہئے جو ہمارا خدا چاہتا ہے اور اتنی شدت سے وہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی سیلاب بھی ہمارے اندر کی گرمی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آئے تو ہم پانی میں بھی آگ لگا دیں اور یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب ہمیں خود پر یقین ہو۔ یقین سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں اور یقین سے زیادہ وزن بھی کسی چیز کا نہیں ہے اور اس سے زیادہ حجم بھی کسی چیز کا نہیں ہے۔ جو تم کو بھی پار لگا سکتا ہے اور تمہارے ساتھ لٹنے والی ہر کم وزنی چیز کو بھی تو بس یقین کا وزن پیدا کر دو اور پار لگا دو ہر ڈوبتی ناؤ کو۔

میں ان والدین کے خلاف بات نہیں کر رہا جو اپنی اولاد کو غلط صحبت سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ اپنی اولاد کو کمزور ہونے کا احساس مت دلائیے کہ تم ان کے بچ جاؤ گے تو وہ تم کو بہن لے لے ڈوبیں گے۔ اپنے جیسا بنالیں گے۔ ان کو کہئے کہ تم کو اس وقت وہاں جانے دیا جائے گا جب تم ہمیں اپنی مضبوطی کا یقین دلاؤ گے اس طرح وہ بچ بھی جائیں گے اور دل سے مضبوط ہونے کی کوشش بھی کریں گے۔ آخر زندگی میں کہیں نہ کہیں تو ان کو بڑے لوگوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا اور اگر ان کو آپ ذاتی مسیقت یا اور ہر تو وہ خود ڈوبنے کی بجائے سب کو پار لگا دے گا اور کسی کو ظلمات سے نور تک لے کر جانا ہی اصل احسان ہے اور والدین کا اپنی اولاد کو اس سے بڑا سمجھ کر دینا کہ وہ انہیں احسان کی ترغیب دیں۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



# تحریک آزادی

## شعراء میدان عمل میں

خالی، آزاد، اکبر الہ آبادی، جو ہر برادران، ظفر علی خان اور علامہ اقبال  
نے اپنے اشعار سے قوم کے تن مردہ میں آزادی کی شمع روشن کر دی

### ☆ شازیہ حسن

14

اگست 1947ء قیام پاکستان کی صورت میں  
مسلمانوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو گئی  
لیکن دو سو سالہ غلامی کی زنجیر کو توڑنے کے لئے کتنی قیمتی  
جانوں کی قربانی دینا پڑی، کتنی ماؤں کے لعل کٹ گئے،  
کتنی بیٹیوں کی عصمت قربان ہو گئی، کتنے نوجوان خون  
میں نہا گئے، کتنے بزرگ تہہ خاک ہوئے ان کی آہیں پایہ  
عرش سے ٹکرائیں۔ اس کا اندازہ تو روز محشر ہی ہو گا مگر  
اس تمام جدوجہد میں بیرونی استبداد کے خلاف ہر طبقے کی  
کسی نہ کسی شکل میں جنگ جاری رہی۔ اس جدوجہد میں  
شعراء کرام نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔  
نگ میں شرفا اور دانشوروں کا طبقہ ہی عوام الناس کی

رہنمائی کرتا ہے لیکن جب وہ خود عضو معطل ہو جائیں تو  
پورے معاشرے پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ لال  
قلعہ کی تباہی اور خاندان تیمور کی بربادی کا غم ان سے  
زیادہ کس کو ہوا ہو گا۔ کوئی اور ہوتا تو سر پھوڑ کر مر جاتا مگر  
جناب ظفر کا دل بھی بادشاہ تھا کہ رنج الم کے اس پہاڑ کو  
بھی اٹھالیا۔ جب حرم شاهی سے نکل کر زنداں فرنگ میں  
پہنچے تو ایک آہ سرد سمجھنے کے کہا۔

جائیں نکل قلعہ کے احاطے سے ہم کہاں؟  
ہوئے گا سر پر چرخ بھی جائیں گے ہم کہاں؟  
کوئی بلا ہے خانہ زنداں یہ آسماں

READING  
Section



چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں  
جو آ گیا اس محل تیرہ رنگ میں  
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں  
1857ء کے بعد جب انگریز کے پاؤں  
ہندوستان میں اچھی طرح جم گئے تو اس نے یہاں کے  
عوام اور خاص کر مسلمانوں سے جن جن کر بدلہ لیا۔ جب  
اس کی آتش انتقام شہیدوں کے خون سے بھی نہ بجھ سکی تو  
اس نے لاکھوں معصوموں کو بھی تختہ دار پر کھینچا اور رنگ و  
تار یک قید خانوں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ ان میں سے بعض کو  
تو آہ بھرنے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن جنہیں زبان کھولنے کا  
موقع ملا تھا ان کا کلام آج بھی اتحاد و انگیز ہے کہ روٹنے  
کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انگریز حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف  
دار و گیر کا سلسلہ بدلتا جا رہا۔ اگرچہ سرسید کی تحریک  
نے بہت سی غلط فہمیاں دور کر دی تھیں لیکن بدیشی راج  
کے خلاف جو جذبہ ابھرا تھا، وہ کبھی سرد نہیں ہوا تھا۔ اس  
زمانے کے شعراء اگرچہ کھلم کھلا بغاوت کی تلقین نہیں  
کرتے تھے لیکن حب الوطنی کا ترانہ ہر ایک کے لب پر  
تھا۔ حانی، آزاد اور نظیر احمد وغیرہ نے مسلمانوں کو خواب  
غفلت سے چونکا کر اپنے مستقبل کو سنوارنے کی ترغیب  
دی اور اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے کچوکے بھی  
لگائے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج!  
ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے  
طرح طرح کے بیٹا لو لباس رنگا رنگ  
علاوہ روٹی کے ریشم بھی اور دول بھی ہے  
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر!  
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ ڈیم فول بھی ہے  
لیکن اس زمانے میں بھی مولانا ثعلبی نعمانی کی نغہ  
کی میں تلخ نوائی کا عنصر نمایاں رہا اور انہوں نے ہر

احتیاط کو خیر باد کہہ کے پر ملا کہاں

کوئی پوچھے تو اے تہذیب انسانی کے استاد و  
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک؟  
یہ مانا تم کو کمزوروں کی تیزی آزمائی ہے  
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک؟  
عروں بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں  
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے درخشاں کب تک؟  
بیسویں صدی سے پہلے چوتھائی حصے میں اس  
برصغیر کے افق پر ایسے دو ستارے نمودار ہوئے جن میں  
سیاسی بصیرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ شعلہ نوائی کی گرمی  
بھی تھی۔ ان میں ایک مولانا حسرت موہانی اور دوسرے  
مولانا محمد علی جوہر تھے۔ ان بزرگوں نے آزادی کی  
جدوجہد میں قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کیں وہ اکثر  
اشعار کے پیکر میں ڈھل جایا کرتی تھیں۔ مولانا حسرت  
موہانی فرماتے ہیں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مصیبت بھی  
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی  
اور مولانا محمد علی جوہر بدیشی استبداد کو للکار تے  
ہیں۔

دور حیات آئے گا قافلِ سزا کے بعد  
ہے ابتداء ہماری، تیری انتہا کے بعد  
ستمبر 1917ء میں علی برادران کو باغیانہ تقریر  
کرنے کے جرم میں دو سال قید کی سزا ملی۔ اس موقع پر  
ایک نظم مولانا محمد علی جوہر کی والدہ محترمہ ”بی اماں“ کے  
جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی لکھی گئی جو ”صرف“ بی  
اماں“ بلکہ ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔

ہو بی اماں محمد علی کی  
جان بیٹا خلافت پہ دے دو  
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی  
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

READING  
Section



بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا  
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنے  
پورے اس امتحان میں اترنا  
جان بیٹا خلافت پہ دے دو  
ہوتے اگر میرے ساتھ بیٹے  
کرتی سب کو خلافت کے صدقے  
ہے یہی دین احمد کے رستے  
جان بیٹا خلافت پہ دے دو  
حشر سے حشر برپا کروں گی  
پیش حق تم کو سنے چلوں گی  
اس حکومت پر دعوئی کروں گی  
جان بیٹا خلاف پہ دے دو

بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر 1937ء کا  
زمانہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ  
اہم تھا۔ 1906ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور 1937ء  
میں انڈیا ایکٹ کے مطابق ہندوستان کے پندرہ صوبوں  
میں سے گیارہ صوبوں میں کانگریسی وزارت قائم ہوئی۔  
خود مختاری کا یہ سب سے بڑا اور بھرپور تجربہ تھا جو  
ہندوستان میں کیا گیا۔ اس تجربے نے ہندوستانی  
مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے  
آزادی کی جو شمع جلائی تھی اس نے بہت سے تاریک  
گوشوں کو منور کر دیا تھا۔ اگرچہ انہیں قید و بند کی بے انتہا  
صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی زبان کو بند نہ کیا  
جاسکا۔ انہوں نے بدیشی حکمرانوں کو لٹکارتے ہوئے کہا:

ازلی کے روز سے پار لانت کا ہوں میں حال  
خدا کا فضل بے پایاں ہے میرے حال کو شامل  
مسلمان ہوں میرا مقصود ہے آزادی کامل  
قسم ہے سرور کو زمین کی جاں نثاری کی  
کہ اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی  
ٹہپا سے بھی اونچا دین قیم کا علم ہو گا

سردائے ملت عرصہ تیغ و دم ہو گا  
موصد ہوں میرا سر غیر کے آگے نہ خم ہو گا  
قسم ہے اہلب تو حید کی محشر خرابی کی  
اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی  
نہیں ہے اک فقط معمورہ ہندوستان میرا  
بنایا ہے وطن اللہ نے سارا جہان میرا  
ہے اونچا ساری قوموں کے نشانوں سے نشان میرا  
قسم ہے سطوت صغریٰ کی، یلغار دوائی کی  
اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی  
اپنا ہے وطن سے جو کچھ خوش فہمیاں وابستہ تھیں وہ  
ختم ہو گئیں اور پوری قوم اس باغک دراپہ ہمہ تن گوش ہو  
گئی۔ وہ اپنے جادو کے زور سے مستقبل کے در پیچے کھول  
کر لیلائے منزل کا رہنما زیبا دکھا رہا تھا۔

ٹو راز کن نکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا  
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا  
تیرے علم و ہنر کی نہیں ہے انتہا کوئی  
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی



غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں  
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کشت جاتی ہیں زنجیریں  
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا  
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں  
یقیں محکم، عملی قیہ، محبت قانع عالم  
جہاد زندی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں  
اقبال کی مجرہ نوالی ست ایک دربانہ شاہین کو پھر  
بان و پر عطا ہوئے نور کچھ دنیا نے دیکھا 14 اگست  
1947ء کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اسلامی  
جمہوریہ پاکستان معرض وجود میں آگئی۔



READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



# پشماں کوٹ سے پسرور تک

آخری قسط

☆ مسافر



مسافر اگست 1947ء میں اپنی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کی سرکئی لاشوں کو پشماں کوٹ  
 سے ایک جلتے ہوئے گاؤں میں چھوڑ کر پلا تھا۔ ان کے اس بھیا تک سفر کی ڈائری جولائی  
 میں شائع ہو چکی ہے۔ اب ایک عورت اسے پاکستان کی سرحد میں داخل کرتی ہے۔



پاکستان چار ہے تو اس

ہاں۔

پھر ہم ابھر کھیں تو اس

نہیں۔

وہ چپ ہو گئی ہے۔ میرے پیچھے پیچھے رہی

ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سنی دے، سنا ہے۔

اچانک ایک چیخ سانی ریت پہ گئی، میرے

سے پاؤں ٹک۔ سمجھوڑ ڈالا ہے۔ یہ کی انسان کی چیخ

نہیں۔ میں ڈر کے مارے پیچھے نہیں دیکھا۔ یقین سا

ہونے لگا ہے کہ میرے پیچھے آنے والی عورت انسان نہیں

جدیل ہے۔ سنا تھا کہ جڑیل کی آواز پر پیچھے دیکھو تو وہ

کھینچ مٹنے کے راستے نکال دیتی ہے۔

ہچکیاں اور سسکیاں سانی دینے لگی ہیں۔ تب میں

نے گھوم کر دیکھا ہے۔ وہ بیٹھی ہوئی ہے۔ سر گھٹنوں میں

دینے رو رہی ہے۔ میرے دل سے سارے خوف اور وہم

نکل جاتے ہیں۔ دوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھا ہوں۔ اس

نے مراٹھا کر مجھے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

نہیں، ویرانی اور وحشت ہے۔

اس کے سینے سے ایسی چیخ نکلتی ہے کہ ہندوستان کا

ویرانہ لرز اٹھا ہے۔ وہ اٹھ کر پیچھے کو دوڑ پڑی ہے۔

اسے دوڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ دوڑ

نہیں سکتی۔ گر پڑے گی، وہ تو چل بھی نہیں سکتی۔

ہاں وہ گزر پڑی ہے۔ ابھی تو ہے مگر ابھی

ہے۔

میں دوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھا ہوں۔ چوہما

ترم دوڑ کر اس کی آنکھیں پونگ گئی ہیں۔ میں جانتا ہوں

اور وہاں کہاں جاتا چاہتا ہے۔ انی تین قبریں اسے پاس

جن میں چھوٹی چھوٹی اور ایک بڑی ہے۔

میرے اس نے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا پتا

تھیں۔ سے سنا پستان کے نام پر راج ہو گئے ہیں۔ خدا

پتہ چار ہے تو اس۔ اٹھا کر گئی ہو یا میراں۔  
 وہ دیکھ کر اٹھا کر گئی ہو یا میراں۔  
 کی عورت آگئی، جس میں اشکوں کے سوتے سوکھ گئے  
 ہیں، دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میری آنکھیں ابھی اسی  
 لہر سے دھوئی نظر آتی ہوں۔

میں اب رو یا تھا؟ یاد نہیں رہا۔ رو یا ضرور تھا۔ اب  
 تو ذہن میں ایک ہی بات اٹک گئی ہے۔ مجھے چلنا ہے،  
 چلنا ہے، چلنا ہے۔ اب تو سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ کس  
 سمت کو بھاگنا ہو یا بھٹک بھٹک کر اتنی دیریں کو لوٹ  
 جاؤں گا جہاں۔

اف خدا۔ وہ منظر پھر میری نظروں کے سامنے آ  
 گیا ہے۔ میرے ٹھٹھے ٹھٹھے بچوں کے کٹے ہوئے سر اپنی  
 ہاں کے کٹے ہوئے سر کے پاس پڑے ہیں۔ ہاں کی  
 سر پریدہ لاش اپنے بچوں کی لاشوں پر پڑی ہے۔ میں نہیں  
 یاد کرنا چاہتا کہ تھلیاں میں کیا ہوا تھا۔ میں نے ابھی ابھی  
 اس بد حال عورت سے کہا تھا۔ "پیچھے مت دیکھو۔ آؤ  
 جلدی جلدی اس ٹکری کی اوٹ میں ہو جائیں۔ کہ ہمیں  
 پیچھے رہنے والی کوئی چیز نظر نہ آئے۔" مگر میرا پتا ذہن  
 ٹکریاں، پہاڑ، جنگل اور دریا بھاٹک کر مجھے اسی جگہ لے  
 گیا ہے جس کی خونی یاد کو میں وہاں سے فوج کر ہندوؤں  
 اور سکھوں کی مٹی میں گم کر دینا چاہتا ہوں۔

میرے خدا مجھے بے حس کرانے۔ پتھر بنا دے  
 مجھے۔ میرا جسم بڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ نپے پڑ آتے  
 ہیں تو ہڈیاں جی اٹھتی ہیں۔

میری ہمسفر سنا پوچھا ہے۔ "کہاں سے آرہے  
 ہیں؟" میرے ہونٹ کپکپاتے گئے ہیں۔ دل اچھل جاتا  
 میں اٹک گیا ہے۔ میں اسے نہیں جانتا چاہتا۔ بتا دیا تو وہ  
 ساری بات سنا کر کوکھوں میں گھس گیا۔

"تم بولے کیس نہیں؟" اس نے کہا ہے۔ "کوئی  
 بات ہے؟" مجھے ڈرتا ہے۔ گم سے چوٹیں جاتے ہیں۔

READING  
Section



کا مقیم نہیں تھا۔ خدا سے تمہیں کچھ نہیں ہو سوز میں  
مظاہر کی ہے۔

میں نے کہنے کی کوشش کی تھی۔ کہ نہ رہا۔ مجھے  
اپنے اپنے یاد آگئے ہیں۔

"میں جمل نہیں نکلتی۔" وہ کہہ رہی ہے۔ "بھئی! اٹھا  
کر میرے۔" بچوں کی غیروں کے پاس۔ ننھا آؤ۔ وہ  
میرے گوشیوں میں بولی رہی ہے۔ "دونوں میرے پاؤں سو یا  
کر سوتے تھے۔ ان کیلئے دار لگے ہیں گے۔"

"تم خوش قسمت اور جو بچوں کو دفن کر کے پٹی دو۔  
میں نے اسے لہا ہے۔" میں اپنے بچوں کی لاشیں گلی میں  
پھینک آ رہی ہوں۔

"خیر سے بچوں کا باپ بھی۔"

"میری بیوی کا سر بھی اپنے بچوں کے ساتھ ہی  
لٹ گیا تھا۔" میں نے اسی کی بات کاٹ کر کہا ہے۔  
"آج ہندوستان میں رسول کی امت کا کوئی بچہ زندہ نہیں  
رہا۔ سب لٹ گئے ہیں۔ میں بھی اپنے بچوں کو آ آیا  
ہوں۔ تم بھی اپنے بچوں کو آ آئی ہو۔ اپنے بچوں کو رسول  
کی امت سے الگ نہ کرو۔ آؤ چلیں۔ تم مجھے اپنے بچوں  
کی باتیں سناتی چلنا میں تمہیں اپنے بچوں کی باتیں سناتا  
جاؤں گا پھر پاکستان آ جائے گا۔"

"پاکستان کتنی دور ہے؟ کب آئے گا؟"

"آ ہی جائے گا۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے تو  
وہ میری آنکھوں میں یوں ٹٹکنی بانڈھے اٹھ کھڑی ہوئی  
ہے جیسے اسے میری آنکھوں میں پاکستان نظر آ رہا ہو۔

وہ میرے ساتھ چل پڑی ہے۔ اسے یقیناً میری  
آنکھوں میں پاکستان نظر آ گیا ہے۔

\*\*\*

میں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے یہ شاید میرا ہاتھ  
نہیں ہے۔ میں نے دیکھ نہیں سکا۔ ہاں محسوس کر رہا  
ہوں کبھی تو اس کا ہاتھ میرے ایک بچے کا ننھا سا ہاتھ

میں چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے بچے کی بیوی کا۔ وہ بھی  
شاید میرے ہاتھ کے مس میں اپنے بچوں اور ان کے  
باپ کا لمس محسوس کر رہی ہے۔ انصروں میں عجیب سی  
ماقت آتی ہے۔ یہ عجیب سی حالت ہمارے جسم میں  
سرایت کر گئی ہے اور ہم چپے چپے ہیں۔ سورج غروب  
ہو گیا ہے۔

جس طرف۔ سورج غروب ہوا ہے ہم اسی طرف جا  
رہے ہیں۔ ہر طرف، وہ بچی بچی ٹھیراں ہیں۔ کچھ ایسی  
چیں جن پر درخت کھڑے ہیں، کچھ بالکل نکلی ہیں۔  
درخت بھوت بنے ہمارے ہیں۔ ٹھیراں راستہ ہمارے  
کھڑی ہیں۔ ہم گھومتے، مڑتے، بچوں پر چلتے پھرتے جا  
رہے ہیں۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ گھومتے مڑتے واہیں ہی  
نہ چلے جائیں۔ عقل نے ذرا ساتھ دیا ہے تو میں نے آٹھویں  
ستارہ دیکھ لیا ہے۔ اب کسی ٹیکری کے سرے سے مڑتا  
ہوں تو اس ستارے کو دیکھ لیتا ہوں۔

دور سے ایک بھیڑیے کے بھونکنے کی آواز آتی  
ہے۔ میری سمیٹ بھی اس آواز کو پہچانتی ہے۔ ذرا کر  
میرے ساتھ لگ گئی ہے۔  
"نہ ڈرو۔ کتا ہے۔"

"بھیڑیا ہے۔" اور وہ اتنی زیادہ میرے قریب آ  
گئی ہے کہ مجھے مجبوراً اسے اپنے بازو میں لپیٹ لینا پڑا  
ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا بازو میری سرسنگ گرو لپٹ گیا  
ہے۔

اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ہر قدم بھی نہ چل  
سکتا۔ جسم سے جان نکل گئی ہے۔ بچ پوچھتے تو ہاں کھا کر  
میں ہار گیا تھا۔ جی میں آئی تھی کہ بیٹیا جان دے ہوں۔  
اب یہ عورت میری پناہ میں آئی ہے تو خدا نے پھر سے  
میرے جسم میں جان ڈال دی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں  
بھٹا ہوں۔ اسے زیادہ ڈانٹنا نہیں چاہتا۔ اسے سمجھنے سے پہلے  
لوں گا۔

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



اجانک زمین ملنے لگی ہے۔ کوئی بھاری بھر کم جانور  
دوڑا آ رہا ہے۔ اس کی آواز بھینس کی طرح ہے۔  
بھینس ہی ہے تو وہ سخت ڈری ہوئی ہے۔ بڑے ڈراؤنے  
طریقے سے بول رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو آوازیں  
سنائی دینے لگی ہیں انہوں نے میری رگوں میں خون خشک  
کر دیا ہے۔ یہ بہت سے بھیڑیوں کی آوازیں ہیں۔ وہ  
غراتے اور بھونکتے ہوئے بھینس کے پیچھے دوڑ رہے  
ہیں۔

شام کے بعد موشیوں کو کون باہر چھوڑتا ہے۔ یہ کسی  
مسلمان کی بھینس ہوگی جس کے مالک کٹ گئے ہوں  
کے یا بھاگ گئے ہوں کے۔  
چھینے کی کوئی جگہ نہیں۔ بھاگنے کی ہمت نہیں۔  
درخت پر چڑھنے کی طاقت نہیں۔ عائشہ کے منہ سے دہلی  
دہلی چیخ نکلتی ہے اور معصوم بچے کی طرح ڈر کر میرے  
ساتھ لپٹ گئی ہے۔

بھینس بہت قریب آ گئی ہے۔ ہم دو ٹکریوں کے  
درمیان کھڑے ہیں۔ راستہ اتنا تنگ ہے کہ یا ہم کھڑے  
رہ سکتے ہیں یا بھینس گزر سکتی ہے۔ اگر کھڑے رہے تو  
بھینس روند ڈالے گی۔ اس سے بچ گئے تو بھیڑیوں کا  
ہجوم ہمیں چیر پھاڑ دے گا۔ ٹکری اونچی ہے۔

میں عائشہ کی کمر کے گرد بازو ڈالے ٹکری پر  
چڑھنے لگا ہوں۔ دو تین گز اوپر گیا ہوں گا کہ بھینس بادل  
کی گرج کی طرح دھاڑتی نکلتی گئی ہے۔ عائشہ گر پڑی  
ہے اور ٹھنوں اور ہاتھوں کے بل اوپر جا رہی ہے۔

بھیڑیے بھینس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہم جہاں تک  
پہنچ سکے ہیں، وہیں لیٹ گئے ہیں۔ رات تاریک ہے۔  
بھیڑیے ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ میں ٹکری کے ساتھ لگ گیا  
ہوں اور عائشہ میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ تھر تھر کانپ  
رہی ہے۔ چار پانچ گز نیچے بھیڑیوں نے آگے ہو  
بھینس کو روک لیا ہے۔ مجھے اندھیرے میں ذرا ذرا سا

ہاں، میں بھیڑیے سے زیادہ خوفناک ہوں۔ درندہ  
ہوں۔ اس عورت کے قریب جو بھی آیا اسے چیر پھاڑ  
دواں گا۔ میں ہندوستان کی کم از کم اس مسلمان عورت کو  
ہندوؤں، سکھوں اور بھیڑیوں سے صاف بچا کر پاکستان  
لے جاؤں گا۔ اس عزم کے زور پر میرے اس بازو کا گھیرا  
اور تنک ہو گیا ہے جو اس کے دبلے پتلے، مظلوم مہجور اور  
غمزوہ جسم کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ چاہتی  
ہے کہ میں اسے اپنے اتنا قریب کر لوں کہ وہ میرے جسم کا  
حصہ بن جائے۔

میں نے اسے اپنے جسم کا حصہ بنا لیا ہے اور مجھے  
ایسا قرار سامحوس ہونے لگا ہے جیسے پاکستان کی آمد اور  
اسلام کی عصمت کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا ہے۔ روح  
جاگ اٹھی ہے۔ جسم کا انگ انگ نئی زندگی لے کر ہر  
خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بیدار ہو گیا ہے۔  
”تمہارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“

”میرا ایک سال کا جو منٹا ہے نا، وہ مجھے سم کہا کرتا  
ہے۔“ اس نے ایسے لہجے میں کہا ہے جیسے اس کا منامحن  
میں کھیل رہا ہو۔ ”اور بڑا چار سال کا ہے۔ وہ امی کہتا ہے  
اور ان کا باپ عاشو کہا کرتا ہے۔ میرا نام عائشہ ہے۔“

وہ ”ہے“ کے صیغے میں بات کر رہی ہے۔ اس کے  
ذہن نے ابھی قبول نہیں کیا کہ ہمیں امی اور ابو کہنے والے  
ماضی کے سائے بہن گئے ہیں جو دور نہیں دور دور ہی دور  
ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر میں خود ماضی میں جا پڑا ہوں۔ عائشہ کے  
بکھرے ہوئے بال میرے گالوں اور ہونٹوں کو چھو رہے  
ہیں۔ ان بالوں سے مجھے اپنے بچوں کو مان کی بو آنے لگی  
ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے جیسے ننھا میرے کندھے پر سر رکھے  
سورہا ہو اور اس کے بال میرے گالوں کو چھو رہے ہوں  
اور کبھی ایسے لگتا ہے جیسے میرے بچوں نے اسی عورت کی  
چھاتیوں سے دودھ پیا تھا۔

READING  
Section



چمکتی برومٹی آ رہی ہیں۔ افق سے چمک اٹھتی ہے تو گرد و  
 پیش روشن ہو جاتے ہیں۔  
 ”تیز چلو۔“ اس نے کہا ہے۔ ”بھڑیے آ جائیں  
 گے۔“

”اب نہیں آئیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی  
 ہے۔ ”ہمیں بھڑیوں سے بچانے کے لئے خدا نے  
 بھینس بھیج دی تھی۔ ذرو مت خدا ہمارے ساتھ ہے۔  
 تمہیں بھوک تو لگی ہوگی؟“  
 ”نہیں..... اور تمہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا ہے اور سوچ رہا  
 ہوں کہ مجھے بھوک کیوں نہیں لگ رہی؟ کیا دنیا سے میرا  
 دانہ پانی ختم ہو گیا ہے؟ خند بھی نہیں آ رہی۔ تنگی کا  
 احساس بھی سٹ چکا ہے۔ صرف ایک احساس زندہ ہے  
 کہ مجھے چلتے رہنا چاہئے۔ جہاں ٹانگیں اکڑ کر جسم کو اٹھ  
 دیں گی وہ پاکستان کی سرحد ہوگی۔

گھٹا سر پر آ گئی ہے۔ نکلی چمک کر راستہ دکھا رہی  
 ہے اور جب نکلی کڑکتی ہے تو عائشہ بدک کر میرا بازو پکڑ  
 لیتی ہے۔

”بازش بر سے گی تو کہاں چھپیں گے؟“  
 ”نہیں بھی نہیں۔“ میں نے اسے کہا ہے۔ ”چلتے  
 جائیں گے۔“

”تمہیں کس طرح یقین ہے کہ ہم جدھر جا رہے  
 ہیں پاکستان ابھر رہی ہے؟“

”میری طرح اسی طرف بھی جا رہی ہے۔“ میں  
 نے اسے کہا ہے۔ ”جس سرزمین کی خاطر ہم نے بچے  
 دینے کراسے ہیں وہ ہمیں اپنی طرف مہینچ رہی ہے۔ ہم  
 بھٹک نہیں سکتے۔“

”میں شاید وہاں تک نہ پہنچ سکوں۔“ اس نے غلیل  
 آواز میں کہا ہے۔ ”لیکن میں اس سرزمین کو دیکھنے بغیر مرنا  
 نہیں چاہتی جس نے میرے سہاگ اور میرے بچوں کی

آگالی دبے رہ رہے۔ بھینس جدھر کھینچی ہے ٹھیک دو  
 بھڑیے اسے روک لیتے ہیں۔ وہ سر نیچے کر کے ان پر  
 سزا کرتی ہے تو دو تین بھڑیے پیچھے سے حملہ کر کے اسے  
 بے بس کر دیتے ہیں۔ بھڑیے بے شمار ہیں۔ ان کی  
 آوازیں ایسی کہ رات بھی عائشہ کی طرح تھر تھر کانپ رہی  
 ہے اور جب بھینس ڈکارتی ہے تو دل دہل جاتا ہے۔

عائشہ رونے لگی ہے۔ بھڑیوں نے بھینس کو  
 گھٹنوں کے تل بٹھالیا ہے۔ تین چار بھڑیے اس کی پیٹھ  
 پر چڑھ گئے ہیں۔ میں عائشہ کو ساتھ لئے پیٹ کے تل  
 پر کھڑے کھٹنے لگا ہوں۔ ٹیکری پر ٹوکینے پھر رہی ہوں۔

میں نے عائشہ کو اپنی پیٹھ پر لٹا لیا ہے۔ میں پھر  
 ہوں، پھر دل پر ریگ سکنا ہوں۔ وہ اتنی زیادہ ڈرنی  
 ہوئی ہے کہ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد پھندا  
 بنا گئے ہیں۔ اس کے بال سر سے منہ پر بکھر گئے ہیں اور  
 میں اپنی ہاتھوں کے ڈھانچے کو اور اس پر لدے ہوئے  
 عائشہ کے جسم کو ایک ایک انچ اوپر کو سرکار رہا ہوں۔

ٹیکری ہو گئی تو نہیں۔ انکی ٹیکریوں اور چٹانوں کو  
 تل برلوں کی طرح پھلانگ کر رہا تھا مگر یہ تو ماؤنٹ  
 ایورسٹ ہے۔

بھینس کی آواز بھڑیوں کی غراہٹ میں ڈوب گئی  
 ہے۔ بھڑیوں کی آوازیں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ بھینس کو  
 تیز پھانز اور بھینچوڑ ہے ہیں۔

\*\*\*

میں عائشہ کو پیٹھ پر اٹھا۔ نے ٹیکری کی دوسری طرف  
 پہنچ گیا ہوں اور اسے کہا ہے۔ ”ہم دوڑ نہیں سکیں گے۔  
 آؤ تیز چلیں۔ یہ چل سکو تو میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ۔“

”چلوں گی۔“ اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا  
 ہے۔ میں نے اس کی آواز اس طرح سنائی دے رہی ہے جیسے دور  
 دہلی پر کھڑی بول رہی ہو۔

ہم نکلا پڑے ہیں اور ساون کی گھٹائیں گر جتی



READING  
 Section





قریبانی کا سبب۔ تمہیں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ساتھ  
موت کا غم ہے۔

”کوئی تمہیں اس بارے میں نے مردوں کی طرح کہا ہے  
موت کے بارے میں پوچھا ہے۔“ اور تمہیں کیا؟

”دو گہری سوچ میں تھو گئی ہے۔ میں نے تھوڑی دیر  
انتظار کر کے پھر کہا ہے۔“ ”تو ڈرنا، تمہیں اپنے خاندان اور  
بچوں کے مرنے کا کتنا غم ہے؟“

”میں انسان ہوں نا۔“ اس نے کہا ہے۔ ”غم تو  
بہت ہے لیکن پاکستان میں جا کر سارے غم بھول جاؤں  
گی۔ پاکستان اتنا خوبصورت ہو گا تا جو میرے سارے  
غم دھو ڈالے گا؟“

”بہت خوبصورت۔“ اور ایک بے حد خوبصورت  
تصور نے ہماری رفتار تیز کر دی ہے۔ میں تصوروں میں  
دیکھ رہا ہوں کہ لاکھوں انسان ایسے ہی خوبصورت تصور کی  
طرف بھوکے پیاسے ہڈیوں کے کھڑکھڑاتے ڈھانچے  
بنے ہوئے، بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

کیہا رنگی گھٹائیں برس پڑی ہیں۔ سادوں کی بارش  
برس نہیں رہی۔ آسمان سے آبشار کی طرح گر رہی ہے اور  
ہم اس تصور کی سمت بڑھے چلے جا رہے ہیں جو بہت ہی  
حسین اور آسمان کے پائلوں سے دھوا ہوا ہے۔

میں بارش کے شور اور زنانوں میں عائشہ کو بتا رہا  
ہوں کہ پاکستان کتنا حسین ہو گا۔ ہماری رفتار اور تیز ہو گئی  
ہے اور پاکستان کا تصور عائشہ کے ذہن میں نقش ہوتا چلا  
جا رہا ہے۔

پانی سر سے بہہ کمر بند میں جانے لگا ہے جس سے  
پیراس کا احساس بیدار ہو گیا ہے۔ میں نے منہ پورا کھول  
کر آسمان کی طرف کر دیا ہے۔ عائشہ نے بھی منہ کھول کر  
آسمان کی طرف کر دیا ہے۔ خدا کا پاک پانی ہمارے  
جسموں میں داخل ہو رہا ہے۔ روت بھی ہلکی چٹکتی ہوتی جا  
رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے روح پر میل جم گئی تھی جسے

بارش نے دھو ڈال رہی ہے۔

اڑتا سا خیالی آتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اور عائشہ  
کو قریب تو نہیں دے رہا؟ کیا وہ پاکستان اتنا ہی  
خوبصورت ہو گا جتنا میں نے عائشہ کو بتایا ہے؟ کیا میں  
اسے پاکستان کی اتنی موت سے جا رہا ہوں؟ ایسا ایک خیال  
ہم سابقین کے ذہن میں آتا ہے اور نگل جاتا ہے۔ میں  
اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ مگر اس وہم سے دل کی  
ایک دودھرائی نکلیں رک ضرور جاتی ہیں۔

چلو خود فرمائی ہوئی سی، دسم ہوئی سی، جو کچھ ہو گیا ہے  
ہے اتنا دکھ کہ ہم بولاشوں سے براہ کر کچھ بھی نہیں  
بڑیوں کے شجر میں پاؤں پہ کھڑے۔ ہنسی کی سبب نہیں،  
چلتے جا رہے ہیں اور ہماری رفتار اتنی موہنا دہاں بارش  
اور کچھل میں بھی تیز ہوتی جا رہی ہے۔

\*\*\*

بارش اور تیز ہو گئی ہے۔ ہم چلے جا رہے ہیں۔  
پھر ملی زمین پیچھے رہ گئی ہے۔ کچھ ہمارے پاؤں جھڑ رہا  
ہے۔ جیسے ہندو اور سکھ ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر  
ہمیں پاکستان سے دور ہی دور جان سے مار دینے کی  
کوشش کر رہے ہیں۔ ہر قدم ایک ایک من کا ہوتا جا رہا  
ہے۔ یہ شاید کھیتیاں ہیں۔ اگر کھیتیاں ہیں۔ تو قریب کوئی  
گاؤں بھی ہو گا۔ اگر گاؤں ہے تو کیا یہ پاکستان کا گاؤں  
ہو گا؟

پاکستان کا گاؤں..... دل سرور ہوا تھا پھر ڈوب  
گیا ہے۔ ڈر گیا ہوں کہ یہ گاؤں ہندوستان کا نہ ہو۔ بجلی  
چمکتی ہے تو ابھر ادھر دیکھتا ہوں۔ بارش کی چمکتی لکیروں  
کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔

میں نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ پیٹ ایک عرصے  
سے خالی ہے۔ بارش کے پانی سے پیٹ بھر گیا ہے تو پیٹ  
سے ایسا درد اٹھتا ہے جو ساری انتڑیوں میں بجلی کی لہریں  
طرح پھر رہا ہے۔

READING  
Section



عائشہ! تمہارے پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے۔  
 "نہیں... چلا نہیں جاتا... کسی درخت کے نیچے  
 بیٹھ جائیں؟"

مجھ پر غشی طاری ہونے لگی ہے۔ اپنے آپ سے لڑ  
 جھگڑ رہا ہوں کہ بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ اکیلا ہوتا تو اور  
 بات تھی، ایک عورت کو اپنی پناہ میں لے کر میں گرنا نہیں  
 چاہتا۔ مگر بارش کی چمکتی لکیریں چکر میں گھومنے لگی ہیں۔  
 ایسی ابکالی آئی ہے جیسے انتڑیاں باہر آ جائیں گی۔

قدم آپ بنی آپ ایک درخت تلے آئے  
 ہیں اور میں جان مار کر کوشش کے باوجود دھڑام سے  
 ٹھٹھنوں کے بل گر پڑا ہوں۔ عائشہ نے میرے پاس بیٹھ  
 کر میری پیٹھ اپنے سینے سے لگا لی ہے۔ میں عورت کا  
 سہارا قبول نہیں کرنا چاہتا مگر اپنے سہارے بیٹھ بھی نہیں  
 جاتا۔ جوں جوں اپنی ہاری ہوئی قوتوں کو جگانے کی کوشش  
 کرتا ہوں، جسم سن ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے اُسکے  
 غریب تاج پر رہے ہیں۔ عائشہ کچھ کہہ رہی ہے۔ اب وہ  
 روٹھ رہی ہیں۔ اس کے سب دسک میں مایوسی بھی نہیں، عزم  
 ہے۔ وہ تو مری ہوئی آواز میں بولتی تھی۔ اس کی آواز میں  
 اتنی جان کہاں سے آگئی ہے؟ وہ وہ بھر تھک رہی نہیں  
 لگتی۔

میں نے جسم کو زور سے جھٹکا دے کر اٹھایا ہے۔  
 عائشہ کی ہانپوں سے ٹکر آیا ہوں مگر تھوڑا کر گریا ہوں اور  
 اتنا ہی کہہ سکا ہوں۔ "عائشہ! دعا کرو"۔ اس نے میرے  
 قریب دوڑا تو بیٹھ کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور  
 میرے کانوں سے دو الفاظ گھراسے ہیں۔ "میرے خدا!"  
 اور میرے لئے رات بیاہ کالی اور دنیا خاموش ہو گئی ہے۔

\*\*\*

ایک سوال پریشان کر رہا ہے۔ "کیا عائشہ سچی بولی  
 رہی ہے؟" پھر خیال آتا ہے، وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟  
 میں خود تو چل نہیں سکتا تھا۔ عائشہ اور خدا کے سوا اور کوئی

منا تھا۔

ہوا یوں ہے کہ میں نے آنکھیں نمائی، نا سب  
 سے پہلے اوپر دیکھا۔ مجھے وہ درخت نظر نہ آیا، میں نے  
 نیچے میں جا کر اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ بارش نظر آئی نہ  
 کیچڑ۔ عائشہ کی صورت نظر آئی۔ منہ سنا، تو اور ہانپ  
 بکھر سے ہوئے نہیں تھے۔

میرے ارد گرد، نئی ای دیواریں تھیں جس میں  
 کے س گھر کی، جہاں سے میری بیوی اور بچوں کا آخری  
 سفر اور میری یہ کٹھن مسافت شروع ہوئی تھی۔ دیواروں پر  
 گا چنی مٹی کا صاف سہرا لپٹ تھا۔ عائشہ کو دیکھ تو اس نے  
 ہونٹوں پر اداس اداس سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ اٹھ کر  
 بیڑوں سے باہر نکل گئی۔ میں کسی گھر میں چار پائی پا پڑا  
 تھا۔

عائشہ آئی تو اس کے ساتھ ایک بوز دیا دیرہاتی اور  
 وہ "مال آؤں تھے۔ ان کے پیچھے ایک دیرہاتن تھی۔  
 میں ان سے پوچھا۔ "میں کہاں آؤں؟"  
 "پاکستان میں۔"

اور جانے کیا ہوا۔ میرے لئے میری کوئی چیز الٹ  
 مٹی پھر میری ہڈی نکل اور میں زار و قنار روئے لگا۔ میں  
 آنسوؤں کی دھند میں، مجھ کو لگا کہ کس نے میرے سر پر  
 ہاتھ رکھا اور کس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا ہے۔ مجھے  
 بوز مٹی آؤں، مٹی بولی۔ "لاؤ بیٹھو اور رو لیے درد بھرا  
 نکل جانے دو"۔ اس آواز میں اتنا پرہیز اتنی اپاہت اور  
 اتنا درد تھا کہ میں اپنی طرف بٹک کر اسے بچھڑا  
 پھر آنسوؤں اور ہچکچہ کا غبارانہ نم ہوا۔ مجھے ایسا  
 سکون آنے لگا جیسے میں پہلے ہی گیا ہوں اور ماں نے مجھے  
 آغوش میں لے لیا ہو۔

وہ میرے منہ میں دودھ نکالنے لگے۔ میں نے  
 محسوس کیا کہ میرے جسم میں انھنے کی طاقت ہے۔ میں  
 نے انھنے کی کوشش کی تو کسی کے ہاتھ نے میری پیٹھ سے



READING  
 Section





چل پڑی۔ کئی جگہ تمہیں زمین پر لٹایا۔ سانسوں کو سنبھالا اور تمہیں اٹھا کر چل پڑی۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ طاقت مجھے خدا نے دی تھی۔ خدا نے ہمارے بچوں کی قربانی قبول کر لی ہے ورنہ ہم دونوں وہیں درخت تلے مر جاتے۔

رات بھر چلتی رہی، گرتی اور اٹھتی رہی۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی اور مجھے یہ گاؤں نظر آنے لگے۔ میں نے تمہیں ایک درخت تلے لٹایا اور اس گھر میں آئی۔ یہ گاؤں کا پہلا گھر ہے۔ انہیں بتایا کہ میں پنٹا کلوٹ سے آئی ہوں۔ پھر تمہارے متعلق بتایا کہ تم درخت تلے بے ہوش پڑے ہو۔ یہ دو جوان آدمی جو اس بوڑھے کے بیٹے ہیں، چار پائی اٹھا کر باہر کو دوڑ پڑے اور اس طرح تم یہاں تک پہنچے۔

”کب؟“

”پرسوں۔“

”میں اسے دن ہے ہوش پڑا رہا ہوں۔“

”ہاں، کبھی کبھی تم ساجد اور ماجد کو بلا سکتے تھے۔ ایک بار تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا، ساجد کی ماں، بچے کیوں زور ہے ہیں اور تم انہیں خواہ مخواہ ذاتی جھڑکتی رہتی ہو۔“

عائشہ بڑی سادگی اور معصومیت سے مجھے سنا رہی ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں، کیا عائشہ سچ کہہ رہی ہے؟ دماغ پر زور دیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہاں وہ جو کچھ کہہ رہی ہے بالکل سچ ہے۔ ایسا کارنامہ جو عائشہ نے کر دکھایا ہے، خدائی قوت کے زور سے ہوتا ہے۔ اس کو ایمان کی قوت کہتے ہیں اور معجزوں کے پس منظر میں قوت کا فرما ہوتی ہے۔

پاکستان کا پہلا گھر اور پہلے پاکستانی جنہوں نے ہمیں پناہ دی ہے، پاکستان کے اس تصور سے زیادہ خوبصورت ہیں جو میں نے راستے میں دیکھا تھا اور عائشہ

مجھے سہارا دیا اور میں بیٹھ گیا۔ دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے لیا اور سارا دودھ پی لیا۔ گرد و پیش کا ذرہ ذرہ ٹکھڑا ہوا۔

میرے پاس صرف عائشہ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں بارش میں درخت تلے بے ہوش ہو گیا تھا تو اس نے زور زور سے رو رو کر خدا سے مدد مانگی تھی۔ پھر اس نے چیخ چیخ کر خدا کو پاکستان کا واسطہ دے کر بکا رہا تھا۔ پھر اس نے خدا سے یہ بھی کہا تھا۔ ”اے خدا، اگر تو خدا ہے تو سانسے آ نہیں تو ہمارے وہ بچے واپس کر دے جو ہم نے تیرے نام پر ذبح کرائے ہیں۔“

عائشہ کہتی ہے کہ بجلی اتنی زور سے چمکی اور ایسی شدت سے کڑکی کہ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ میں ڈرتو گئی لیکن یہ یقین بھی ہونے لگا کہ مجھے خدا نے اپنا آپ دکھایا ہے۔ بجلی پھر جھک کر کڑکی تو آسمان سے ایک شعلہ زمین کی طرف آیا جو پچاس ساٹھ گز دور ایک درخت پر گرنا۔ میں جانتی تھی کہ درخت پر بجلی گری ہے ایسا دھماکہ ہوا کہ کینا کینا اٹک اٹک بیدار ہو گیا۔ میرے دل سے خوف نکل گیا اور بجلی میرے جسم میں داخل ہو گئی۔ میں نے تمہیں اٹھانے کی کوشش کی تو ایسے لگا جیسے مجھ میں بہت طاقت آگئی ہے یا تمہارا کوئی وزن نہیں رہا یا شاید میں خواب میں تمہیں اٹھا رہی ہوں۔ تمہارا دل دھڑک رہا تھا۔ تم زندہ تھے۔

میں نے تمہارے آگے ہوا کر تمہیں پیٹھ پر ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور جب چلی تو بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اند میرے میں وہ کون تھا جسے میں دیکھ نہ سکی لیکن اس نے میرا ہاتھ تھام کر ایسے راستے پر ڈال دیا جس پر پھسلن ضرور تھی کچھ نہیں تھا۔ میں اسی راستے پر چل پڑی۔

پھر مجھے یاد نہیں رہا اور شاید ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کتنا کچھ چلی۔ دوبار گری۔ ڈرامہ لیا۔ تمہیں اٹھایا اور

READING  
Section

SCANNED BY-AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



## عقیدہ باتیں

ہم پہلے اپنی عادتیں بناتے ہیں پھر ہماری عادتیں ہمیں بناتی ہیں۔

گناہ کا ترک کر دینا توبہ کی عطا ہے۔

جو چاہتا ہے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے اور اس میں جان کھپانے والوں سے آگے بڑھ جائے تو اسے چاہئے کہ گناہوں سے بچے۔

حضرت عمرؓ سے ایک ایسی قوم کے بارے میں پوچھا گیا جو گناہ کا شوق رکھتے ہیں اور ان پر عمل بہت کرتے۔ فرمایا۔ ”وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے آزمائے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔“

روتا رہا ہوں۔ شہید بیوی اور اپنے بچوں کی روح سے رو رو کر معافی مانگتا رہا ہوں۔ اگر عائشہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو میں اسے کبھی قبول نہ کرتا مگر وہ عائشہ ہے اور عائشہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس نے اپنا سہاگ اور مانتا چوڑا کے دینس کی مٹی پر قربان کیا ہے۔

## 19 نومبر 1947ء

عروسی کی رات گزر گئی ہے۔ کیسی گزری ہے؟ لکھنے لگوں تو لکھتا ہی چلا جاؤں۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک کہانی جتنا لبا ہے۔ نہ لکھوں تو بات اتنی سی ہے کہ عروسی کی رات گزر گئی ہے کبھی تو ہم دونوں ہنستے مسکراتے باتیں کرتے تھے، کبھی ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھنے لگتے تھے۔ مجھے عائشہ کے روپ میں اپنے ساجد اور ماجد کی ماں نظر آنے لگتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ عائشہ کو میرے روپ میں انور اور اکرم کا باپ نظر آتا ہوگا۔

عائشہ نے کل رات پہلی بار بتایا ہے کہ اس کے انور کی عمر آٹھ سال اور اکرم کی چار سال تھی۔ وہ پٹھانکوت

کے ذہن میں نقش کر دیا تھا۔  
”عائشہ! اس گاؤں کا نام کیا ہے؟“  
”چوڑا“۔

”آج تاریخ کیا ہے؟ مہینہ کون سا ہے؟“  
”ستمبر کی اکیس تاریخ ہے۔“

میں نے ذہن پر زور دیا ہے تو بڑی مشکل سے یاد آیا ہے کہ میں ۷ اگست کے روز تھلیال سے چلا تھا۔

## 29 ستمبر 1947ء

میں اور عائشہ پھر سے جی اٹھے ہیں۔ اس گھر والوں نے ہمیں کئی بار کہا ہے کہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ وہ سارے گاؤں میں دیکھ چکے ہیں۔ ہندو اور سکھ جو مکان خالی کر گئے ہیں ان میں مہاجرین کے کنبے آباد ہو گئے ہیں۔ چوڑا، سرحد کے قریب تھا اس لئے بہت سارے مہاجرین نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

ہم نے اپنے مشفق میزبانوں کو بتا دیا ہے کہ میرا اور عائشہ کا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ ہم ایک ہی منزل کے دو بھٹکے ہوئے راہی تھے۔ گھر کے بزرگ نے بلا جھجک اور ہاتھ ملکہ دیا ہے۔ خدا نے آسمانوں میں تمہاری روئیں ملا دی ہیں۔ فوراً شادی کر لو اور ان بچوں کو بھول جاؤ جو تم دونوں نے اللہ کے نام پر قربان کر دیئے ہیں۔

## 18 نومبر 1947ء

آج میزبانوں نے مجھے اور عائشہ کو کلمے پڑھوا کر ابدی رشتے میں باندھ دیا ہے۔ ہنسی بھی آتی ہے، روتا بھی۔ مگر ہنستا ہوں نہ روتا ہوں۔ ہنستا اس لئے نہیں کہ میری شہید بیوی کو روح کو تکلیف نہ ہو اور روتا اس لئے نہیں کہ عائشہ کے دل کو تکلیف نہ ہو۔ رات جو گزر گئی ہے، چوڑا کی لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر گیت گاتے گزرا، مٹی ہے۔ میں باہر نکلا گیا تھا۔ کھیتوں میں جا کے

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



جتنا پیارا لگتا ہے۔  
عائشہ کا رنگ روپ نکھر آیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تیر  
کہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت ہے۔

## 25 اپریل 1948ء

چوٹہ واسلے پیسے نوکری کی ملاقات میں ختم ہو گئے  
تھے۔ چار روز چولہا ٹھنڈا رہا۔ آخر ایک پرائیویٹ فرم  
میں چڑا سی کی جگہ مل گئی۔ پچاسی روپے کوئی بڑی تنخواہ  
نہیں مگر انسان بہت بُرے ملے۔

ہو ایوں کہ پہلی تنخواہ ملنے میں ابھی پورا مہینہ باقی  
تھیں۔ میں نے دفتر کے ایک آدمی سے بیس روپے اور چار  
لے لئے۔ پچھلے پہر گھر آیا تو عائشہ کو ساتھ لے کے بازار  
چلا گیا۔ راستے میں دفتر کا مالک مل گیا۔ اس نے عائشہ کو  
دیکھا تو بڑے انس سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے  
بتایا تو اس نے کہا ہے۔ "اگر تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے تو بیوی  
کو میرے گھر بھیج دیا کرو۔ تم مہاجر ہو، میں چاہتا ہوں کہ  
اسی بہانے تمہاری کچھ اور مدد کروں۔ صرف تھانہ پر ٹیڈ کا  
کام ہوگا۔"

میں عائشہ سے یہ کام تو نہیں لیرا چاہتا تھا لیکن  
عائشہ نے مجھے کہا کہ میں سارا گھر بنانا ہے۔ گھر میں چند  
ایک برتنوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پچاسی روپوں میں  
ہم کیا کچھ بنا سکیں گے۔ اس نے ایسے انداز سے بات کی  
کہ میں مان گیا اور عائشہ میرے آقا کے گھر جانے لگی۔  
پہلے روز کام کر کے واپس آئی تو اس نے مجھے بتایا کہ  
صاحب کے بیوی بچے لاہور گئے ہوئے ہیں اور اس نے  
یہ بھی بتایا کہ صاحب بہت نیک اور دردمند آدمی ہے۔  
مجھے کہتا تھا کہ کام کاج کو چھوڑ دو، میں تو کیا بہانے تمہاری  
مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے پاس لٹھا کر میری چٹا سنتا رہا  
اور افسوس کرتا رہا۔

عائشہ نے مجھے دس روپے کا نوٹ دے کر کہا۔ "یہ

سے بیس میل دور سے چلے تھے۔ راستے میں انور بھوک  
ست مر گیا۔ عائشہ ننھے کی لاش کو سینے سے لگائے چلتی  
رہی۔ اگلے روز اکرم کو ابکاٹی آئی اور وہ بھی مر گیا۔ اس  
کے باپ نے لاش کو اٹھا لیا۔ وہ اپنے بچوں کو پاکستان کی  
مٹی کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ مگر راستے میں ان پر  
ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر دیا۔ یہ ایک سو سے زیادہ  
افراد کا قافلہ تھا۔ عائشہ کا خاوند شہید ہو گیا اور بھی کئی  
مسلمان شہید ہوئے۔ رات آگنی تھی۔ اندھیرے نے  
عائشہ کو چھپا لیا اور ہندو سکھ چلے گئے۔

عائشہ دو روز چھپی رہی۔ تیسرے روز اس نے ایک  
نرم جگہ ہاتھوں سے مٹی بنا کر تین گڑھے کھودے اور اپنے  
سہاگ اور ماما کو ہندوستان کی مٹی میں دفن کر دیا۔ جب  
وہ پاکستان کی سمت روانہ ہوئی تو گھوم پھر کر ان تین  
ڈھیر یوں کے پاس جا بیٹھی۔ اسے یاد نہیں کہ کتنی بار وہ  
چل پڑی مگر راستے سے لوٹ گئی اور قبروں پر ہاتھ  
پھیرنے لگی۔ جب میں نے اسے دیکھا، اسے وہاں  
دشواں یا گیارہواں روز تھا۔

میں نے بھی اسے اپنی بیوی اور بچوں کی شہادت کی  
تفصیل سنائی ہے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کے  
زخموں کو سہانا شردہ کر دیا ہے۔

## یکم دسمبر 1947ء

تین روز گزرے کسی کے بتانے پر ہم دونوں  
سیالکوٹ آ گئے ہیں۔ سر چھپانے کو چھوٹا سا مکان مل گیا  
ہے چوٹہ کے میزبانوں نے ہمیں دو بستر اور کپڑے  
دیئے تھے۔ ضرورت کے برتن بھی ایک بوری میں باندھ  
دیئے تھے۔ مگر وہ وقت کی روٹی مسئلہ بن گیا ہے۔ چوٹہ  
والوں نے میری بیوی کو جو "سلمیٰ" کے پیسے دیئے تھے۔  
وہ بیس روز کے لئے کافی ہیں۔ میں چوٹہ کی مٹی کو ہمیشہ  
آنکھوں سے لگاؤں گا۔ یہ گاؤں مجھے سارے پاکستان

READING  
Section



لاہور  
حکایت  
ماہنامہ

ستمبر 2015ء

کا شمارہ

قیمت: 100 روپے

# نمبر سالانہ

اپنی سابقہ روایات کے ساتھ شائع ہوگا

کھڑی اپنی پسند کا کوئی مضمون کھڑے آپ جتنی کھڑے یادگار واقعہ کھڑے ناقابل فراموش  
کھڑے پاک بھارت جنگ کھڑے جرم و سزا کھڑے شکاریات کھڑے دین اسلام وغیرہ  
کھڑے کشمیر کی جنگ آزادی کھڑے جتنی کھڑے خفیہ کہانی کھڑے افسانہ کھڑے مہم جوئی

اپنی تحریریں 20 جولائی تک ارسال کریں۔ صرف وہی تحریریں ناقابل اشاعت ہونے  
کی صورت میں واپس بھیجی جائیں گی جن کے ساتھ واپسی ڈاک ٹکٹ ہوں گے۔

ماہنامہ حکایت 26- پٹیاں گراؤنڈ لاہور

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



آنکھیں غم اور غصے سے لال ہو گئیں۔ کہنے لگا۔ ”اسلامی مملکت میں ایسے آدمی کو سنگسار کر دینا چاہئے۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔“

## 14 اگست 1948ء

پورا ایک سال گزر گیا ہے۔ پٹھانکوٹ کی طرف سے سیاہ گنائیں اٹھتی ہیں اور سیالکوٹ پر چھا جاتی ہیں۔ ایک سال پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ دل ڈوبنے لگتا ہے۔ عائشہ بھی گم مسم ہو جاتی ہے لیکن کسی مؤذن کی مقدس آواز یا کسی طرف سے حق اللہ ہو کی صدا یا کہیں سے کلمہ شریف کی آواز سنائی دیتی ہے تو دل سرور ہو جاتا ہے۔ یادیں دھل جاتی ہیں اور گٹھائیں برس کر آگے نکل جاتی ہیں۔

میں اسی آزمحی کی نوکری کر رہا ہوں اور میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔ پڑھنے کی عمر تو نہیں لیکن بوڑھا بھی نہیں ہوں۔ پٹھانکوٹ کے ایک سائنس دھرم سکول میں آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں پھر کاشتکاری کرنے لگا۔ زمین بہت تھی۔ اب کہیں زمین ملے گی تو قلع نہیں۔ ایک ہی راستہ ہے کہ میٹرک پاس کر کے ایف اے پھر بی اے کر لوں۔ میں کر لوں گا۔

## 11 ستمبر 1948ء

مجھے یاد نہیں کہ میں اور عائشہ اپنے اپنے کمرے میں کتنے کچھ روئے تھے مگر جتنا آج رور ہے تو شاید اتنا بھی نہ روئے ہوں گے۔ دل میں قائد اعظم کو دیکھنے کی اتنی خواہش تھی جتنی ہر مسلمان کو حج کی ہوتی ہے۔ آج خواہش دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہے اور قائد اعظم اس جہاں سے اٹھ گئے ہیں۔

ہم دونوں رور ہے ہیں۔ بازار بند ہو چکے ہیں۔ پاکستان کا نظام دم بخود ہو کر رک گیا ہے۔ جسے دیکھ کر ہر

صاحب نے دیا ہے۔ میری نگاہ میں پاکستان فرشتوں کی سرزمین تھی۔ میں اپنے صاحب کو بھی فرشتہ سمجھتا رہا۔ وہ مجھ پر بھی بہت مہربان ہو گیا تھا۔ مگر دس بارہ روز بعد میں دفتر سے گھر آیا تو عائشہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کا سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں لال سرخ تھیں جیسے روتی رہی ہو۔ میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ”صاحب کی نوکری چھوڑ دی ہے۔“ پوچھا کیوں تو کہنے لگی۔ ”وہ بہت بُرا آدمی ہے۔ بڑی مشکل سے عزت بچا لائی ہوں۔“

میرا خون کھول اٹھا۔ ایک صدمہ یہ کہ اس آدمی نے میری بیوی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور دوسرا صدمہ یہ کہ اس نے یہ گناہ پاکستان میں کیا تھا۔ میں ساری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن دفتر گیا۔ صاحب آیا تو جو منہ میں آیا اسے کہہ دیا مگر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”تم دیہاتی بہت سیدھے ہوتے ہو۔“ اس نے ایسے پیار سے باتیں کیں کہ میں اسے اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھا۔ گھر آ کر عائشہ سے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تو اس نے تفصیل سے سنا دیا کہ اس مردود نے اسے کس طرح باتوں باتوں میں چنگ پر گرا لیا تھا۔ یہ تو عائشہ کی ہمت تھی کہ اس کے چنگل سے نکل آئی۔

میں نے دوسرے دن اپنے آقا سے کہا کہ جتنے دن نوکری کی ہے وہ تنخواہ دے دو۔ اس نے ہنس دیکھ کر کہا تو میں نے دانت نہیں کرا سے کہا۔ ”میں ہندوؤں اور سکھوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ یاد رکھو تمہیں قتل کر دوں گا۔“ گناہگار بزدل ہوا کرتے ہیں۔ وہ ڈر گیا اور مجھے چیتا لیس روپے دے کر فارغ کر دیا۔

آج اس واقعہ کو چار مہینے گزر گئے ہیں۔ ایک آزمحی کے ہاں ساٹھ روپے پر نوکری مل گئی ہے۔ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔ اسے یہ واقعہ سنایا تو اس کی

READING  
Section



ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب ہے جو معلوم نہیں کب ختم ہو گا۔

## یکم جنوری 1949ء

قائد اعظم کی وفات کا غم اور حیدر آباد دکن پر ہندوستانوں کی فوج کشی اور قبضے کا دکھ ابھی تازہ تھا کہ کشمیر ہاتھ آیا نکل گیا۔ کہتے ہیں فائر بندی ہو گئی ہے۔ رات کے وقت اپنی توپوں کے دھماکوں کی جودہلی دہلی آوازیں سیالکوٹ میں سنائی دیتی تھیں خاموش ہو گئی ہیں۔ سیالکوٹ کی فضا میں ایک ہی سوال گونج رہا ہے۔ ”کیوں؟ ہماری توپوں کے دہانے کس نے بند کر دیئے ہیں؟ ہمارے مجاہدین جو برف پوش پہاڑوں اور چٹانوں کو روندتے چلے جا رہے تھے، کیوں روک لئے گئے ہیں؟“ کوئی جواب نہیں ملتا ہر کوئی اداس ہے۔

## 11 فروری 1949ء

میرا اور عائشہ کا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔ پٹھانکوٹ کے زخم بھرنے لگے ہیں۔

## 6 ستمبر 1965ء

میرا اور عائشہ کا پہلا بچہ سوالیہ سال کا ہو گیا ہے۔ ان سولہ سالوں میں خدا نے ہمیں چاروں بچے دیئے دیئے ہیں۔ دو میرے، دو عائشہ کے۔ ہم نے ان کے وہی نام رکھے ہیں جو پہلے بچوں کے تھے۔ ساجد، ماجد، انور اور اکرم۔

یہ سولہ سال کس طرح گزرے؟ اگر روزمرہ کی کہانی سنائے لگوں تو سننے والے اکتا جائیں گے۔ اس سال گزرے، ہم سیالکوٹ سے پسرور آ گئے ہیں۔ سرحد کے قریب تھوڑی زمین مل گئی ہے۔ میں نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ زمینیں مزارعوں کے پاس ہیں اور خدائے برائی کرتا ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں۔

ان سولہ سالوں میں وہ پاکستان میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے جس کی خاطر ہم نے اپنے بچے کٹوائے تھے اور جس کی خاطر ہزاروں اور لاکھوں گلہلوں ہان ہو کر اپنے عزیزوں کی لائیں پاکستان کے راستے میں بکھیرتے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تھے۔

میں بھوک اور غربت کی بات نہیں کرتا۔ ہر سچا پاکستانی پاکستان کی خاطر بھوکا اور نگارہ سکتا ہے۔

میں فلک بوس عمارتوں کے سائے میں ان جھکیوں کی بات نہیں کرتا جہاں انسان اور انسانوں کے بچے کیڑوں اور کمزوروں کی طرح رہتے ہیں۔ ہر سچا پاکستانی پاکستان کے نام پر کھلے آ۔ ان تلے مورچے کھود کر ان میں رہ سکتا ہے۔

مجھے اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ میری بیوی جوان اور میں بے روزگار تھا تو صرف سیالکوٹ والے پاکستانی صاحب نے ہی نہیں جانے کتنے پاکستانیوں نے میری بیوی پر جال پھینکے، اسے ارغلائے کی کوشش کی اور گلیوں میں اس پر آوازے کئے۔ یہ سب پاکستانی تھے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ جس عورت کو پراگندہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں وہ انہی کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے اپنا خاوند، اپنے بچے اور اپنی سرزمین ہندوستان کی مٹی میں دفن کر آئی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو پاکستان کے راستے سے بھٹکے ہوئے ایک مرد کو اپنی پیٹھ پر اٹھالائی تھی۔ جب کہ وہ خود چلنے سے معذور تھی۔ عائشہ کا قصور یہ تھا کہ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، غریب اور پناہ گزین تھی۔

مجھے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے گلہ یہ ہے کہ پاکستان کی ہر بچی کے ساتھ یہی سلوک ہو رہا ہے۔ بہت سی بیٹیاں شرم و حجاب کو ہسماندگی کی علامت سمجھ کر مستور ہونے کے بہ جودنگی ہو گئی ہیں۔ پاکستان کے سپوت اپنی بہنوں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یورپ کی تہذیب نے، پاکستانی فلمیں بنائے والوں نے، ان فلموں کے لئے گیت لکھنے

READING  
Section



والے شاعروں کے اور مجلسی کہانیاں لکھنے والے ادیبوں اور انہیں شائع کرنے والے ایڈیٹروں نے پاکستان کی بیٹیوں کی عصمت پاکستان کے بیٹوں کے ہاتھوں لٹا دی ہے۔

عریانی..... فحاشی..... بے حیائی..... مذہب سے بیزار..... چوری..... رشوت خوری..... خویش پروری..... آبروریزی اور اغوا کی دیرانہ وارداتیں..... اخبار ناچازہ تعلقات کی خبروں سے بھرے ہوئے..... عورت..... ہر طرف نیم عریاں عورت کی تصویر..... کوئی مجھے یقین دلاوے کہ قرآن کی سرزمین پر جو کچھ ہو رہا ہے، یہی فرمان خداوندی ہے تو میں دل پرسل رکھ کر تمام مہاجرین سے اپیل کروں گا کہ ان بچوں کو بھول جائیں جو انہوں نے پاکستان کے نام پر کفار کے ہاتھوں ذبح کرائے اور زندہ جلائے تھے اور ان بچوں کو بھول جائیں جو بھیڑیوں کے ہاتھ چڑھ گئی تھیں اور شرمناک اذیتیں سہ سہہ کر اس سرزمین پر قربان ہو گئیں۔ کیونکہ یہی فرمان خداوندی ہے۔

آج چھ ستمبر 1965ء کا دن ہے۔ پسرور کی زمین لرز رہی ہے۔ سیالکوٹ کی فضا ہندو کی توپوں کے دھومیں سے سیاہ گھٹا بن گئی ہے۔ ہمارے بچوں کا قاتل پاکستان کی آبرور پر ٹوٹ پڑا ہے۔ سرحد سے دیہاتی اسی طرح بھاگے چلے آ رہے ہیں جس طرح ہم تھلیاں سے بھاگے تھے مگر ہم نے انہیں دور نہیں جانے دیا۔ ہم پسرور والوں نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ سینے کے پٹ کھول دیئے ہیں۔ سرحد سے جو پاکستانی بچے، بوڑھا، مرد، عورت ذری سبھی ہوئی آتی ہے۔ ہم اسے اپنے گھر بٹھا کر اپنے سینے میں سمیٹ لیتے ہیں۔

کفار کے لشکر بڑھے آ رہے ہیں۔ آگ، ہلوان، تیزی سے چلا آ رہا ہے۔ ہم نہیں بھاگیں گے۔ پٹھا کھمبے نہیں ہم نہ جرتے تھے۔ پسرور میں ہم نستے نہیں۔

آئے دو۔ پاکستان اور اسلام کے ارنی دشمن کو اور آئے آئے دو۔

میں اپنے ساجد اور احمد ہوجوٹا ہا ہوں۔ مزاح سول سال کا ہے اور ماجد مارہ سال دار اس نے بتایا ہے کہ وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ٹھکانا یہاں اور انھیں لٹا کر سرحد کی طرف پٹے گئے ہیں۔

میں جانتا ہوں سرحد دور ہے۔ وہ وہاں ٹٹ نہیں پہنچ سکیں گے۔ پہنچ بھی گئے تو سوائے مرگے بے فائدہ بھیج سکیں گے۔ کلہاڑیاں اور لٹھیاں بیٹوں کا یہاں لٹھیاں ہیں لیکن میرا رداں رداں سرور ہو گیا ہے۔ سرور اس کے کہ میرے بچے اور پسرور کے بچے اپنے دشمن کو بچھا رہے ہیں۔

میں نے درست ذرے عائشہ کو بتایا ہے کہ ماجد اور ماجد سرحد کی طرف چلے گئے ہیں۔ آخر میں ہے تو قحط تھی کہ بلبل کر مجھے کہے گی کہ بھاگ کے جاؤ انہیں گھر لے آؤ۔ گولا باری میں نہ چلے جائیں لیکن اس کی آنکھیں خلاؤں میں کہیں دور دیکھنے لگی ہیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں عائشہ کی نظریں انھارہ برسوں کے پردے چاک کر کے سرحد پار ان تین قبروں کو دیکھ رہی ہیں جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھیں اور وہ مسکراتی اس لئے ہے کہ اس کے بیٹے اپنے ننھے ننھے شہید بھائیوں کے خون کا انتقام لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

## 7 ستمبر 1965ء

جنگ ابھی پسرور سنہ دور ہے۔ جنرل کے پل پر سنا ہے۔ بڑا خونریز مہر کیڑا جا رہا ہے اور سرحد میں پر حق اور بطل کی بھیاٹک جنگ ہو رہی ہے۔ خون تو بہہ رہا ہے۔ ماؤں کے جیسے بیٹے شہید ہو رہے ہیں لیکن خوش اس بات کی ہے کہ مجھے وہ پاکستان نظر آنے لگا جس کی خاطر میں

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



RTM: 71114

N.B.S

FANS

سب اچھا لگا مگر  
بات ان سے بنی



U.I INDUSTRY

184-C, Small Industries State  
Gujrat PAKISTAN.

PH: +92 53 3535901-2, 3523494-5

Fax: 053-3513307

E-mail: nbsfans@gmail.com

سے اور ہمارے سب سے پہلے ان کے لئے تھے۔ اگرچہ ان  
کی فائبر گلاس موٹیوٹس ہیں۔ لیکن ان کے پورے اور پورے  
گرتے ہیں۔ ان کے لئے تو اسے سنائی دے رہا ہے۔ ان کے  
اور ان کے لئے تو اس کے لئے اپنے اپنے پورے پورے  
تھے۔ ان کے لئے تو اس کے لئے اپنے اپنے پورے پورے  
بھائی میں ان کے لئے رہتے ہیں یا گاؤں کے قریب سے  
گرتے تو ان کے لئے پانی پلاتے ہیں۔

8 ستمبر 1965ء

پانچ توپوں اور نینکوں کی زد میں آ گیا ہے۔  
میرے دل پر چوٹ پڑی ہے۔ میرا اور عائشہ کا ایک ٹکڑا  
سفر چوتھا۔ میں نے تمہارا اور دوہرا سفر وہیں سے شروع ہوا  
تھا۔ چوتھے دن ان کے لئے ان کے لئے کی طرح سینے سے لگایا  
تھا اور ہمیں بیاہ کر رکھتے کیا تھا۔ آج چوتھے دن کی دیواریں  
نررز کر پھٹ رہی ہیں۔ گتے ہیں دشمن پھر سو ٹینک لایا  
ہے۔ سب گیب باتیں ہیں۔ آج ہی ہیں۔ ہم پرورد  
بہت سے آدمی آئیے تو ان کے لئے۔ ملے ہیں اور  
پیشکش کی ہے کہ اگر سینے سے لیا ہوا ہوتا تو نہ کر مینوں کو  
دے دیتے تو ان کے لئے چوتھے دن کے لئے ان کے لئے  
کہ ان کے لئے زندہ ہیں۔ ان کے لئے ٹینک پرورد تک پہنچے  
تو ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
پھر ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

اپنے۔ یہ یوں ہے۔ یہ ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ہے۔ ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے  
ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

READING  
Section



## یکم جون 1971ء

جس پاکستان کو ہم سنے اپنے بچوں کے خون میں ذبور  
حاصل کیا تھا وہ آج فحاشی، بے حیائی اور جرم و گناہ میں زوب  
گیا ہے۔ آج سرحد پر آن بیٹھا ہوں۔ کاغذ قلم ساتھ لے  
آیا ہوں۔ عائشہ سے کہہ آیا ہوں کہ کھیتوں پر جا رہا ہوں۔  
طبیعت پارنے لگی ہے۔ شاید یہ بڑھاپے کے آثار ہیں کہ ذرا  
سی بے حرکی سے طبیعت پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

آج سرحد پر بیٹھے ہوئے 17 اگست کا ایک ایک  
لحہ یاد آ رہا ہے اور لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ یہ نہ سمجھ لیتا کہ یہ  
ذاتری ساتھ ساتھ لکھتا رہا ہوں۔ نہیں۔ یہ آج لکھ رہا  
ہوں۔ چوبیس سال بعد۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بہت سی باتیں  
بھول گیا ہوں مگر ذہن قدم قدم کی واردات اٹکا جا رہا ہے  
اور میں لکھتا جا رہا ہوں۔ لکھنے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ

آپ مجھ سے ہمدردی کریں اور پڑھ کر یہ کہہ دیں کہ یہ  
ایک مہاجر کی داستان ہے جو پنھاں کوٹ سے ہجرت کر کے  
پسرور میں آباد ہوا تھا۔ میں کہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ  
میری نہیں ہر مہاجر کی آپ جتنی ہے اور یہ بھی کہ ہمیں  
پاکستان مفت نہیں ملا تھا۔

عزیز پاکستانو! میں جس پاکستان کو یاد دہا رہا ہوں  
وہ ہمارے قدموں میں پڑا سسک رہا ہے۔ ہم قرآن کی  
سرزمین کو پاؤں تلے روند رہے ہیں۔ ذرا سر ہٹا کے تو  
دیکھو۔ تمہیں پاکستان نظر آ جائے گا۔ نہ نظر آئے تو پرسہ  
آ جاؤ۔ میں تمہیں چوٹہ لے چلوں گا۔ وہاں سے ساری  
سرحد پر پھراؤں گا۔ وہاں سے مٹی کے کسی ڈھیلے کو اٹھا کر  
سوکھنا تمہیں پاکستان پر قربان ہونے والوں کے لبو کی عطر  
بیز بو آئے گی اور اس بو میں تمہیں پاکستان نظر آئے گا اور  
یہ ہو گا وہ پاکستان جس کی خاطر ہم سب نے بچے ذبح  
کروائے تھے۔



## 23 ستمبر 1965ء

سترہ دن اور راتیں پسرور کے در و دیوار اپنی  
بڑی توپوں سے لرزستے کانپتے رہے ہیں۔ آج فضا  
خاموش ہے۔ ماحول گہری نیند سو گیا ہے۔ دشمن کا مان  
نوٹ گیا ہے۔ پاکستان کا پرچم بڑی شان سے مجھوم رہا  
ہے۔ چوٹہ، جسٹ، ہانا پور، برکی اور قصور، بدر، خٹین،  
احد اور قادسیہ کی لڑی میں پرودے گئے ہیں۔ یہ ہے  
پاکستان۔ وہ پاکستان جسے قرآن کی سرزمین کہتے  
ہیں۔ میری کھیتیاں جو میرے بچوں کو اناج دیتی ہیں  
میری نہیں، میرا گھر میرا نہیں، میرے بچے میرے  
نہیں۔ سب کچھ پاکستان کا ہے۔ جو شہید ہو گئے ہیں  
وہ میرے بچے تھے۔ جو شہید ہوں گے وہ میرے بچوں  
ہوں گے۔

## 10 جنوری 1966ء

نعرے جو پاکستان کی سرحد پر سنائی دے تھے،  
ہمارے بادشاہوں نے تاشقند کی پرانی مٹی میں چاؤن  
کئے ہیں۔ شعلے جو پاکستان کے دل سے اٹھے تھے، تاشقند  
کی برف سے بجھا دیے گئے ہیں۔ پاکستان کی ماؤں کے  
جن بیٹوں نے پاکستان کی آن پر اپنی ٹانگیں شہید کرائی  
تھیں وہ آج لنگڑے ہو گئے ہیں۔

ہم مر گئے ہیں۔ نہیں، میرے اندر سے آواز اٹھی  
ہے۔ کفر نہ بکو۔ ہم مرے نہیں۔ ہمارے گلے دبائے گئے  
ہیں۔ یہ بادشاہوں کا دستور ہے۔ رعایا اسٹھے تو اسے بٹھا  
دو۔ بیٹھے تو اسے لٹا دو۔ لیٹے تو اس پر گھوڑے دوڑا کر روند  
ڈالو۔ ہم زندہ ہیں بادشاہ آتے ہیں، جاتے ہیں، پیدا  
ہوتے اور مرتے ہیں۔ قومیں زندہ رہتی ہیں۔ تم زندہ ہو۔  
اپنے آپ کو زندہ رکھو۔ اپنے بچوں کی آنکھوں پر چوٹہ  
کی مٹی پھونکا کہ ان کی رو میں روشن رہیں۔





کبھی ماں جوان ہوئی تھی، آج اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے  
جس نے ماں کو ایک دور ہے پر لا کھڑا کیا ہے.....

### ☆ نسیم سیکڑہ صرف

ایف اے کوئی خاص تعلیم نہیں سمجھی جاتی لیکن میں نے ان  
دفتروں میں ایف اے کیا تھا جب میٹرک تک پڑھنا بھی  
بڑا کام سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کی وجہ سے میرے اندر روشن  
خیالی پیدا ہو گئی۔ میں مطالعہ اور لکھنے کی شوقین ہوں۔ نوٹی  
پھونی شاعری لکھ لکھتی ہوں لیکن صرف شوق کی حد تک،  
میں نے شاعری کو جنون نہیں بنایا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے  
کہ تعلیم نے میرے اندر خود اعتمادی اور خیالوں میں پختگی  
پیدا کر دی تھی اور یہی خود اعتمادی میں نے اپنی بیٹی میں بھی  
پیدا کر دی تھی۔

میں نے بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کی بات کی اور  
اس کے رشتے کے امیدوار گھرانوں کے متعلق تفصیل سے  
بتا کر کہا کہ وہ ان میں سے جہاں پسند کرے وہاں میں  
ہاں کر دوں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اطمینان سے دو چار

ہی ایسا آن پڑا تھا کہ میں پریشان ہو گئی۔ مسئلہ  
کا تعلق میری بیٹی سے تھا جو ایم اے میں پڑھ  
رہی ہے۔ اس مسئلے نے میری نیند حرام کر دی۔ بیٹی جوان  
ہو جائے تو ماں باپ کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ اگر میرا  
خاندان زندہ ہوتا تو مجھے اتنی فکر اور پریشانی نہ ہوتی۔ جب  
سے میری بیٹی جوان ہوئی تھی اس کے رشتے آرہے تھے  
اور یہ سب امیر خاندانوں کے لڑکوں کے رشتے تھے۔ ان  
میں سے پسند امیدواروں کو میں نے صاف انکار کر دیا تھا  
کیونکہ یہ اونچے اور شوباز قسم کے لالچی لوگ تھے اور ان کی  
نظریں ہماری جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک دوا تھی اور  
پروقتار گھرانے مجھے پسند تھے اور میری خواہش تھی کہ ان  
میں سے کسی ایک کے ہاں بیٹی کو بیاہ دوں۔

میں ایف اے تک پڑھی ہوئی ہوں۔ آج کل

READING  
Section







لڑکی ہے زبیر اتنا ہی بے وقار اور سنجھا ہوا نظر آتا تھا۔ دو تین بار میں بھی ان دونوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔ سچ پوچھئے، میری خاندانی حیثیت ایسی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہوٹل میں کھانے کھانا اور آئس کریم کھانا خواب لگتا تھا۔ یہ دونوں اپر کلاس کے اور میں مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ ایسی عیاشی تو میں صرف خواب میں دیکھ سکتی تھی۔

کبھی کبھی رضی کا بھائی جو کالج میں پڑھتا تھا، اسے لینے آ جاتا تھا۔ وہ بھی رضی کی طرح شوباز تھا بلکہ کچھ اونچا بھی تھا۔ وہ خواہ مخواہ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا لیکن میں نے اسے کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ میں دو چار بار رضی کو اپنے گھر بھی لے کر گئی اور اپنے ابا سے ملوایا۔ ماں تو فوت ہو چکی تھی اس لئے میں اپنے ابا سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ کسی بات کی اہمیت ہونی یا نہ ہونی، میں ان کو ضرور بتاتی۔ اسی طرح کبھی کبھی میں ابا کی اجازت سے رضی کے گھر بھی چلی جاتی۔

رضی نے مجھے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے زبیر کی اور اس کی مشکلی ہو جائے کیونکہ دونوں کے گھر والوں کا کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔ دونوں کے گھر امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ زبیر کا باپ کچھ زیادہ ہی دولت مند تھا۔ ان کی نظر میں لڑکی لڑکے کا اکٹھے گھومنا پھرنا مذہب نہیں تھا۔

ایک دن رضی کالج نہیں آئی۔ چھٹی کے وقت میں گھر جانے کے لئے نکل تو زبیر کی گاڑی نظر آئی۔ اس نے ہارن بجا کر مجھے متوجہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج رضی نہیں آئی اور وہ انتظار نہ کرے۔

”مجھے پتہ ہے وہ آج نہیں آئی“ زبیر نے اطمینان سے کہا۔ ”اس نے مجھے کل ہی بتا دیا تھا۔ میں آپ کی وجہ سے آیا ہوں۔“

”میری وجہ سے!“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔  
”کیوں؟“

ہا۔۔۔ نوکر وغیرہ جیسے الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ اس کے برعکس میں سنجیدہ اور سادہ رہتی تھی اور میری طبیعت میں شوخی بالکل نہ تھی۔ پھر بھی ہماری دوستی ہو گئی حالانکہ مزاج کے لحاظ سے ہم دونوں الٹ تھیں۔ دوستی بھی ایسی ہو گئی کہ ہم کالج میں ہر جگہ اکٹھی نظر آنے لگیں اور ہماری دوستی کالج میں مشہور ہو گئی۔

چھٹی کے وقت رضی کا ڈرائیور لینے آتا تو وہ مجھے اپنی کار میں بٹھالیتی اور ہمارے ملاقاتے کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر اتار دیتی۔ وہاں سے ہمارا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ مجھے کالج جاتے چار پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ ایک دن چھٹی کے وقت میں رضی کے ساتھ کالج سے باہر نکلی اور حسب معمول اس کے ساتھ اس کی کار کی طرف بڑھنے لگی۔ رضی کی کار سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور سرخ رنگ کی نئی کار کھڑی تھی۔ ہم دونوں رضی کی کار میں بیٹھنے لگی تھیں کہ سرخ کار کا ہارن زور زور سے بجنے لگا۔ ہم دونوں نے اس طرف دیکھا۔ سرخ کار میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہماری طرف دیکھا کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر رضی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہلا کر کچھ اشارہ بھی کر رہی تھی۔

”یہ میرا کزن زبیر ہے۔“ رضی نے مجھے پریشان دیکھ کر نوجوان کا تعارف کرایا اور کہا۔ ”یہ میرا دوست بھی ہے اور مجھے لینے آیا ہے۔ تم ایسا کرو میرے ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ میں زبیر کے ساتھ گھوم پھر آؤں۔“ پھر اس نے اپنے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ رضی اپنے کزن کے ساتھ چنی گئی اور اس کا ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ اس کا کزن آتا اور وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی۔ رضی نے زبیر کے ساتھ میرا بھی تعارف کرا دیا۔ چند ملاقاتوں میں ہی میں نے نوٹ کر لیا کہ رضی جتنی شوباز اور چلبلی

READING  
Section



”آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“  
اس نے کہا۔ ”براہ کرم گاڑی میں بیٹھ جائیں، یوں  
کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے میرے لئے پچھلا  
دروازہ کھول دیا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی فیسٹی سینٹ پر بیٹھ گئی۔  
گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کیا چلی، میرے دماغ میں  
اندیشوں اور دوسووں نے یلغار کر دی۔ کہیں ایسا نہ ہو  
جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو کوستے لگی  
کہ میں کیوں ایک غیر آدمی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔  
میں اسی کشمکش میں تھی کہ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک  
گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ  
گیا۔ گاڑی ایک اعلیٰ اور امیرانہ درجے کے ریسٹوران  
کے سامنے رکی تھی۔

زیر مجھے لے کر فیملی کیمن میں بیٹھ گیا اور کھانے کا  
آرڈر دے دیا۔ کھانا آ گیا اور ہم کھانا کھانے لگے۔  
کھانے کے دوران ہی میں نے زیر سے کہا کہ اس نے  
جو بھی بات کرنی ہے جلدی سے کرے کیونکہ مجھے گھر بھی  
پہنچنا ہے۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تو تھی ہی لیکن اصل  
بات یہ تھی کہ میں یقین کر رہی نہیں سکتی تھی کہ زیر مجھے  
خلو میں نیت اور شرافت سے یہاں لایا ہے۔ میری سوچ یہ  
تھی کہ یہ اپنے مقابلے میں مجھے غریب اور سادہ لوح لڑکی  
سمجھ کر درغلانے گا اور یہ اتنے امیرانہ کھانے سے میرا  
دماغ خراب کرنا چاہتا ہے۔

”آپ نہ اندمانے۔“ زیر نے کہا۔ ”میں سیدھا  
سادہ آدمی ہوں اس لئے بغیر کسی تمہید باندھے بات  
کروں گا۔ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں آپ سے  
شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس میں سب حد سنجیدہ ہوں۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رضی مجھ  
سے زیادہ خوبصورت تھی اور امیر بھی اور پھر ان دونوں کی  
شادی بھی متوقع تھی۔ دونوں ایک ہی خاندان اور طبقے

سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی شادی میں بظاہر کوئی  
رکاوٹ نہیں تھی۔ میرا یہ خدشہ صحیح ثابت ہونے لگا کہ یہ  
مجھے درغلانے گا۔ شادی کا خواب دکھا کر میری عصمت کو  
کھلونا بنائے گا۔

”آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں  
نے پوچھا۔

”جو کچھ کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔“ اس  
نے فیملی کن لےج میں کہا۔ ”شادی آپ ہی سے کروں  
گا۔“

”لیکن آپ کی اور رضی کی۔۔۔“

”میں رضی سے شادی نہیں کروں گا۔“ اس نے  
میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میں اسے بیوی کی حیثیت سے  
برداشت نہیں کر سکتوں گا۔ اس کے ساتھ رشتہ داری اور  
دوستی ایک الگ چیز ہے۔“ اس نے رضی سے ہیزاری کا  
اظہار شروع کر دیا۔

”رضی کیا سوچے گی؟“ میں نے کہا۔  
”کوئی کیا سوچتا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔“ زیر  
نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے اور اس کے سوشل  
سٹینس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے یہ بھی کہا  
کہ رضی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے اور دو تہند بھی ہے  
اور اسے وہاں سے جہیز بھی اس کے شایان شان ملے گا۔

ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔ اس کے جواب میں اس  
نے بڑی لمبی بات کی جو مختصر ایوں تھی کہ اسے رضی کا  
ماڈرن ہونا اور آزادانہ مردوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔ اسے  
شوہاری اور اچھی حرکتوں سے نفرت تھی۔ اس نے یہ بھی  
بتایا کہ اسے جہیز یا دولت کی پروا نہیں ہے۔ اسے میری  
سنجیدگی اور منانیت اچھی لگی تھی۔

زیر نے مجھے کہا کہ رضی کے گھر میں ضرورت سے  
زیادہ آزادی ہے۔ رضی کا بھائی لڑکیوں سے دوستیاں

READING  
Section



لگانے میں بدنام ہے اور ان کے گھر میں شادی بیاہ اور دوستوں وغیرہ میں کھلے عام شراب بھی پی جاتی ہے۔ ابے راہروی، یہ لوگ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

قد رتی را سوال تھا جو میں نے اس سے کیا کہ اسے رشی میں اتنی خامیاں نظر آتی ہیں تو اس کے ساتھ ایسی گہری دوستی کیا مطلب؟

”اپنے والدین کی عزت کی خاطر“ زبیر نے جواب دیا۔ ”والدین کی خوشی کی خاطر میں نے رشی کو قبول کر لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ بے تکلف کر کے حقیقی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے مایوسی ہونے لگی تھی۔ میں جو اوصاف اس میں پیدا کرنا چاہتا تھا وہ تم میں نظر آ گئے۔ میں نے اپنا سوشل سٹینس دیکھ رہا ہوں نہ تمہارا۔ میں جو چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔“

میں نے زبیر کی جو صلب افزائی نہیں کی اور کشمکش میں پڑ گئی کہ اسے کیا جواب دوں۔ زبیر نے یہ بھی کہا کہ میں ابھی رشی کے ساتھ اس سلسلے میں بات نہ کروں، ہو سکتا ہے وہ میری دشمن ہو جائے۔ زبیر نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو کہا کہ آرام سے گھر جا کر سوچ لینا اور ہفتے میں دس دن تک مجھے اپنی رائے دے دینا۔ اس کے بعد زبیر نے ایک مناسب جگہ پر مجھے فوراً پکڑ دیا اور میں وہاں سے رکشہ لے کر گھر آ گئی۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ابا سے کوئی بات چھپائی اور انہیں کچھ نہیں بتایا۔ بتاتی بھی کیسے! زبیر نے رشی کے متعلق اور اس کے گھر والوں کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں میرا باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ رشی سے بات کروں یا نہ کروں۔ وہ جیسی کیسی بھی تھی، میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اسے دھوکے میں رکھوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ یہی بات اسے کسی اور سے پتہ چلے، میں خود اسے سب کچھ بتا

دول گئی۔

اگلے دن کانٹ سے چھٹی تھی۔ میں نے ابا جان سے رشی کے گھر جانے کی اجازت لی اور رشتے میں بیٹھ کر کونھوں کے علاقے میں پہنچ گئی۔ رشی کی کونھی میں پہنچی تو اس کا بھائی مل گیا۔ میں نے اس سے رشی کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھوں اور وہ رشی کو بھیجتا ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور کہنے لگا رشی سو رہی تھی۔ میں نے اس کو جگایا ہے وہ نہا دھو کر ابھی آ جاتی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی کا اظہار کرنے لگا۔ میں سرگ کر ذرا پر سے ہٹ گئی۔ وہ ڈھیچوں کی طرح میرے قریب ہو گیا اور باتوں باتوں میں مجھے دوستی کرنے کی ترغیب دینے لگا۔ دوستی ہے اس کی مراد نا جائز تعلقات ہی ہو سکتے تھے۔

میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے میرا جود سینے لگا تھا۔ اب مجھے زبیر کی باتیں سچ معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں اس گھر میں پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی اور رشی کے کمرے سے واقف تھی۔ میں سیدھی رشی کے کمرے کی طرف گئی اور اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور رشی آنکھیں ملتی ہوئی نکلی۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئی اور اندر لے گئی۔ ہم دونوں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

”تم ابھی تک سو رہی تھیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں، کیوں کیا بات ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”چھٹی والے دن میں دوپہر کو ہی اٹھتی ہوں۔“

”تمہارے بھائی نے تمہیں جگا کر میرے متعلق نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“ اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”آخر بات کیا ہے؟“

میں نے اسے اس کے بھائی کی حرکت سنائی تو وہ

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



اس نے ایسا ہی کیا۔ پہلے میرے ابا سے مل کر بات کی پھر زبیر کے ماں باپ کو ہمارے گھر لے آئی۔

ابا جان نے ان کو کہا کہ مجھے اس رشتے سے انکار نہیں لیکن ہم مل کلاس لوگ ہیں اور وہ بہت دولت مند ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل کلاس میری بیٹی کو طعنے سننے پڑیں۔ زبیر کے ماں باپ بہت شریف لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ امیر غریب سب اللہ نے بنائے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے بس آپ ہمیں بیٹی عطا فرمادیں۔ اس مسئلے پر بڑی باتیں ہوئیں اور آخر کار زبیر کے باپ نے میرے ابا کو قائل کر لیا۔

پھر ایک ماہ کے اندر اندر میری شادی زبیر سے ہو گئی۔ زبیر اور اس کے والدین اتنے دولت مند ہونے کے باوجود بہت نیک اور شریف لوگ ثابت ہوئے۔ میری زندگی خوش باش گزرنے لگی۔

میری شادی کے تین ماہ بعد رضی کی بھی شادی ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ لڑکا اس نے خود پسند کیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتیں کم ہونے لگیں اور کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئیں۔ میری شادی کو چار سال گزرے تھے اور میری ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ جب مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ رضی کو طلاق ہو گئی ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔

میں رضی سے افسوس کا اظہار کرنے اس کے گھر جا پہنچی۔ وہ بڑی خوشی سے ملی۔ اس کی حرکتوں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے طلاق کا کوئی افسوس ہے بلکہ وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو کہنے لگی دفع کرو اس حرامی کو، میرے لئے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ جب دل کرے گا شادی کر لوں گی۔ اس سے پتہ چلا کہ اس کا ایک بیٹا ہے جو اس کا خاوند اس کے پاس چھوڑ گیا ہے۔

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا خاوند کسی

غصے میں آنے کی بجائے ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ وہ کچھ زیادہ ہی شرارتی ہو گیا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ میرا خون ابھی تک کھول رہا تھا اور وہ بڑے مزے سے اس بے ہودگی کو شرارت کہہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے رضی سے کہا کہ میں ایک خاص بات کرنے کے لئے آئی ہوں اور پھر میں نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ توقع تو یہ تھی کہ وہ غصے میں آ کر زبیر کو گالیاں بکے گی اور میرے ساتھ بھی ناراض ہوگی لیکن اس کا رد عمل کچھ اور ہی تھا۔ پہلے تو اسے یوں دھچکا لگا جیسے میں نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیے ہوں۔ حیرت اور حسم سے اس کی آنکھیں نمبر گئیں اور منہ کھل گیا۔ میں ڈر گئی کہ اب میری خیر نہیں لیکن ایک آدھ سنٹ گزر گیا تو اس نے مجھے یوں حیران کر دیا کہ اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی کہ زبیر بہت اچھا لڑکا ہے اور میں ہاں کر دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا کیا بنے گا کیونکہ تم زبیر کو پسند کرتی ہو اور زبیر کے ساتھ تمہاری دوستی بھی ہے۔

”دوست کی حیثیت سے تو زبیر ٹھیک تھا۔“ رضی نے کہا۔ ”لیکن شوہر کی حیثیت سے وہ مجھے سوت نہیں کرتا۔ وہ بڑا شکی مزاج ہے۔ ہر وقت پابندیاں لگا رہتا ہے۔ فلاں سے ملو فلاں سے نہ ملو۔ فلاں نے ہنس کر بات کیوں کی وغیرہ۔ میں یہ پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے لئے لڑکوں کی کمی نہیں، میں اپنے مطلب کا لڑکا پسند کر لوں گی۔“

اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر زبیر کے والدین میرے گھر رشتہ مانگنے آتے ہیں تو میری پوزیشن خراب ہوتی تھی، ابا جان کو کچھ شک ہو جاتا تھا۔ میں نے یہ مشکل رضی کے آگے رکھی تو اس نے کہا کہ یہ رشتہ میں خود کراؤں گی۔ پھر

READING  
Section



## ضرورت رشتہ

امریکن پشٹلی RUTGER یونیورسٹی سے  
سائنس کالوجی میں گریجویشن، پابند صوم و صلوة  
کنواری لڑکی کے لئے لاہور کے رہائشی اہلسنت  
پنجابی/اردو سپینگ لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکا  
ڈاکٹر، انجینئر، فارماسسٹ یا اکاؤنٹینٹ ہو۔  
سید/راجپوت فیملی کو ترجیح دی جائے گی۔

(میرج بیورو والے رجوع نہ کریں)

رابطہ: 0323-4329344

خط و کتابت: ماہنامہ ”حکایت“  
پشمالہ گراؤنڈ لاہور (پاکستان)

- \* چھتیس بھوجی ہسٹروگ۔ (ہندی کماوت)
- \* جسم کی راحت طعام کی کمی میں ہے۔ (فارسی کماوت)
- \* کھانے سے غرض ہے کہ تو جیتا ہے اور نیک کام کرے۔
- \* مگر تو خیال کرتا ہے کہ زندگی صرف کھانے کے لیے ہے۔ (الذکر کماوت)
- \* انسان کا پیت اس کا دشمن ہے۔ (عربی کماوت)
- \* گو طعام بیکار تھا تو مزہ کو اپنا تھا۔ (پشتو۔ افغانی کماوت)
- \* بھرا ہوا پیٹ نصیحت نہیں سنتا ہے۔ (روسی کماوت)
- \* تھوڑا کھادو عیش سدا۔ (ہندوستانی کماوت)
- \* آدمی اور احمق جو انسانوں کو لاحق ہوتے ہیں ایسی غذا کھ  
نظموں سے پیدا ہوتے ہیں جن سے پنچا لکھن ہے۔
- (ڈاکٹر میر جیتر تھامس)
- \* مستقبل میں ازلہ مرض کے لیے جو چیز ہم برصغیر کو بتائیں گے  
وہ وہاں نہیں غذا ہوگی۔ علاج کا تعلق وہاں سے نہیں غذا سے ہوگا۔

رشتے دار سے ملنے لگھینڈ گیا تھا، وہاں اس کی ملاقات  
ایک انگریز لڑکی سے ہوئی اور وہ اسے ساتھ ہی پاکستان  
لے آیا اور اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ میں نے اعتراض کیا تو  
اس نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں اس کے معاملات  
میں ٹانگ نہ اڑاؤں۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی  
اپنے دوستوں کو گھر بلانا شروع کر دیا۔ اس سے بات بڑھ  
گئی۔ وہ پہلے ہی انگریز لڑکی سے شادی کرنے پر ٹکلا بیٹھا  
تھا۔ اس نے مجھے طلاق دے دی اور لگھینڈ چلا گیا۔

پھر رضی نے دوسری شادی کر لی مگر یہ شادی بھی  
زیادہ دیر نہ چلی اور صرف ایک سال بعد ہی اسے طلاق ہو  
گئی۔ اس کا دوسرا شوہر کوئی غیرت مند آدمی تھا جو اس کی  
بے راہروی کو برداشت نہ کر سکا اور رضی اس کی لگائی ہوئی  
پابندیاں برداشت نہیں کر سکی۔ اس کا نتیجہ طلاق کی  
صورت میں نکلا۔

پھر بہت سارا وقت گزر گیا۔ میری بیٹی جوان  
ہونے لگی۔ جب بیٹی کی عمر پندرہ سال کو پہنچی تو زبیر کا  
انتقال ہو گیا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال تک جانے  
کی مہلت ہی نہ ملی۔ زبیر کے انتقال پر رضی اور اس کے  
گھر والے بھی آئے تھے۔ یہ رضی سے میری آخری  
ملاقات تھی۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میرے لئے  
بڑا مشکل وقت آ پڑا تھا لیکن میرے ساس سسر نے مجھے  
اور میری بیٹی کو سنبھال لیا۔ روپے پیسے کی فراوانی نے بھی  
کوئی خاص مسئلہ نہ پیدا ہونے دیا۔ اس کے بعد رضی کا  
اور میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع رہا۔

آج میری بیٹی جوان ہو گئی ہے اور اس نے اپنی  
زندگی کے سفر کے لئے جس ہم سفر کو پسند کیا ہے وہ میری  
سہیلی رضی کا بیٹا ہے۔ میں اس شش و پنج میں ہوں کہ کیا  
کروں۔ حالات نے مجھے عجیب دور ہے پر لا کھڑا کیا  
ہے۔ میرے سامنے یہ مسئلہ سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔



READING  
Section



## ڈاکو سے انٹرویو

راجہ مہدی علی خان

انتخاب: حبیب اشرف صہوجی

جی اس بندے کو دیسے تو ابو واؤد کہتے ہیں  
 بہت سے مہرباں لیکن ابوالمردود کہتے ہیں  
 مرے والد فرید آباد کے مشہور ڈاکو تھے  
 خدا بخشے انہیں، اپنے زمانے کے ہلاکو تھے  
 فرنگ آباد کا تھانہ مرے ماما نے ٹوٹا تھا  
 وہ گیارہ سیر کا تالہ اسی بندے سے ٹوٹا تھا  
 نہیں تھا چور کوئی شہر میں دادا کے پائے کا  
 چرا کر گھر میں لے آئے تھے کتا دانسرائے کا  
 مرے ماموں کے جعلی نوٹ امریکہ میں چلتے تھے  
 ہزاروں چور ڈاکو ان کی نگرانی میں پلتے تھے  
 مرے پھوپھا پھٹے ”بد معاش“ تھے اپنے زمانے کے  
 خدا بخشے بہت شوقین تھے وہ جیل خانے کے  
 مرے خالو کبھی نیویارک میں جیسیں کترتے تھے  
 لب ساحل وہ گیارہ عورتوں سے عشق کرتے تھے  
 لکڑ ماما ولی اللہ تھے سونا بناتے تھے  
 حبیبیں بیواؤں کو رو رو کے سینے سے لگاتے تھے  
 خسر صاحب سخاوت پور کی رانی بھگا لائے  
 مرے ہم زلف اس کی تین بہنوں کو اٹھا لائے  
 بچا میرے بہت مشہور تھے فن رذالت میں  
 ”مقدمہ“ ہار کے وہ ننگے ٹاپے تھے عدالت میں

READING  
Section



مرے بھائی نے کی تھی فور ٹوٹنی چیف جسٹس سے  
وہ جب بگڑا جلا دیں اس کی مونچھیں اپنی ماہس سے  
بڑے وہ لوگ تھے لیکن یہ بندہ بھی نہیں کچھ کم  
خدا کا فضل ہے مجھ پر نہیں مجھ کو بھی کوئی غم  
اجازت ہو تو اب بندہ اشارے ہی اشارے میں  
بتا دے آپ کو تفصیل سے کچھ اپنے بارے میں  
میں راجوں اور مہاراجوں کی جیسیں بھی کترتا تھا  
چرس، کوکین اور افیون کا دھندا بھی کرتا تھا  
مرے معمولی شاگردوں نے چودہ بینک لوٹے تھے  
مری کوشش سے باعزت بری ہو کر وہ چھوٹے تھے  
عدالت مانتی تھی میری قانونی دلیلوں کو  
کرایا میں نے اندر شہر کے پندرہ وکیلوں کو  
مسافر تین عدد پھینکے تھے ایروپلین سے میں نے  
ہوابازوں کو بھی پٹا تھا جا کر کین سے میں نے  
”اٹھارہ“ ڈاکوؤں کی پگڑیاں میں نے اتاری تھیں  
کمر سے تھوڑا نیچے ٹھوکریں بھی ان کے ماری تھیں  
نہ انکم ٹیکس دیتا تھا نہ سوپر ٹیکس دیتا تھا  
میں الٹا اپنی سب انکم پہ ان سے ٹیکس لیتا تھا  
جو دن میں نے گزارے، شان و شوکت سے گزارے ہیں  
ذرا کچھ ان دنوں ہی میرے گردش میں ستارے ہیں  
مجھے کر لیں جو شامل چوریوں میں اور ڈاکوں میں  
یقیناً چند دن میں آپ سب کھیلیں گے لاکھوں میں

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



آئیے، جشن آزادی منانے کی بجائے اس بات کا عہد کریں کہ دشمن کی سازشوں کو ناکام بنانا اور اپنی صفوں میں نفاق پیدا نہیں ہونے دینا!



## ”راہِ کورسی آگے کی پاکستان کے خلاف مخالفت کی

0345-8599944

☆ گلزار اختر کا شیری

چاہتے ہیں لیکن ہم اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا مسئلہ کشمیر حل کے بغیر خطے میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کی خواہش کو کمزوری نہ سمجھا جائے۔ دہشت گردوں کے خلاف آخری ضرب لگانے کی ضرورت ہے تاکہ خطے میں پائیدار امن قائم ہو سکے۔

پاکستان کے خلاف بھارتی قیادت آج کل بڑے شراکینز بیانات جاری کر رہی ہے اور پاکستانی سیاسی قیادت کی طرف سے اسے اس طرح کا منہ توڑ جواب نہیں ملا جس سے اس کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ آرمی چیف نے اس سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے حالات کا تاریخی تناظر میں درست تجزیہ کرتے ہوئے حقیقت پر مبنی خیالات کا مکمل کرا اظہار کیا۔

آرمی چیف جنرل راجیل شریف نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان دوسرے ممالک میں پراکسی وار لڑنے کے خلاف ہے اور کسی کو بھی پاکستان میں پراکسی وار لڑنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جنرل راجیل شریف نے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں خطاب کے دوران کہا کہ مستقبل میں لڑی جانے والی جنگوں کے نقش و نگار بدل گئے ہیں۔ ہمارے دشمن پاکستان میں دہشت گردوں کی حمایت کر کے مسلح تصادم کو ہوا دے رہے ہیں اور پاکستان کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دشمن کے عزائم کو شکست دینے کے لئے ہمارا پختہ عزم ہے۔

انہوں نے کشمیر پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر ہندوستان کا نامکمل ایجنڈا ہے۔ پاکستان اور کشمیر کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ ہم خطے میں امن اور استحکام

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



قتل ہو سکتے ہیں، پکڑی گئیں۔ سابق وزیر داخلہ رحمن ملک نے سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلہ میں انکشاف کیا کہ کچھ بیرونی ایجنسیاں اور سفارت خانے وزیراعظم ہاؤس سمیت پاکستان کے اہم اداروں اور شخصیات کے فون ٹیپ کرتے تھے۔ موبائل کمپنیوں کو موبائل سموں کے بارے میں سختی سے متعلقہ اداروں کی جانب سے پاکستان سے کاروبار بند کر کے واپس جانے کی دھمکی دی گئی تھی گزشتہ دور حکومت میں دو غیر ملکی سفارت خانے ٹیلی فون ٹیپ کرنے میں ملوث رہے۔ کابینہ اجلاسوں کی جاسوسی بھی کی جاتی تھی۔ ایک بار مانیٹرنگ اتنی سخت تھی کہ کابینہ کا اجلاس ہی مؤخر کرنا پڑا۔ رحمن ملک کا کہنا تھا کہ ان کے اپنے فون کے ساتھ ساتھ صدر آصف زرداری اور میاں نواز شریف کے فون بھی ٹیپ ہوتے رہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ سابق وزیر داخلہ کو اپنے اقتدار میں ان سفارت خانوں کے بارے میں معلومات تھیں تو ان ممالک کے ساتھ سفارتی سطح پر صدر اور وزیراعظم نے بات کر کے یہ معاملہ کیوں نہیں اٹھایا۔ گزشتہ حکومت کے دور میں بیرون ممالک سے سفارتی سامان کی آڑ میں کون کون سے جاسوسی آلات لائے گئے اور کن کن مقامات پر نصب کیا گیا۔ ہمارے ملک کی ایجنسیوں کو بھی ہا خبر رہنے کی ضرورت ہے اور حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسا نظام وضع کرے تاکہ ملکی مفادات اور معاملات میں غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کی یہ کھلی مداخلت رک سکے۔ امریکہ میں داخلے کے وقت رپورٹ پر پاکستانی اہم شخصیات حتیٰ کہ وزراء تک کی تلاشی لی جاتی ہے اور ہمارے ملک میں سفارتی سامان کی آڑ میں جاسوسی کے آلات درآمد کئے جاتے ہیں مگر ہم ان کو چیک ہی نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے غیر ملکی سفارت خانوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

ذیل میں بھارت کی ایجنسی "را" جو پاکستان میں

کوئی پس پردہ رہ کر کسی دوسرے ملک کے خلاف خفیہ طریقے سے جنگ کرے اسے پراکسی وار کہتے ہیں۔ اس تناظر میں اپنے خطاب میں آرمی چیف نے ان ہی خفیہ لڑائیوں کا حوالہ دیا ہے۔ بھارت اس بات کو جتنی جلد سمجھ لے یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ آرمی چیف کا یہ بیان سب کے لئے حوصلہ افزاء ہے اور پوری قوم کی امنگوں کا ترجمان ہے۔ افواج پاکستان دشمن کے ناپاک عزائم کو شکست دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ پاکستان اور کشمیر لازم و ملزوم ہیں، یہ کسی صورت جدا نہیں ہو سکتے۔ دوسری طرف آرمی چیف نے جو اشارہ کیا ہے پراکسی وار کی طرف تو اس وقت غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیاں پاکستان میں دہشت گردی کو ہوا دے رہی ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر امریکن سی آئی اے اور بھارت کی ایجنسی "را" زیادہ سرگرم ہیں۔

بعض این جی اوں بھی در پردہ پاکستان کی سلامتی کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ ان میں ایک امریکی این جی او سیوڈی چلڈرن پر وزارت داخلہ نے نامناسب سرگرمیوں کی وجہ سے پابندی لگائی۔ ملک میں اس کے دفاتر بند کر دیئے گئے اور اس کے پندرہ غیر ملکی ملازمین کو ملک چھوڑنے کا حکم ملا۔ مگر امریکہ کی مداخلت کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے دفاتر پھر کھل گئے اور اس کے غیر ملکی ملازمین بھی بدستور ملک میں موجود ہیں۔

راڈپنڈی میں اڈیالہ روڈ پر پر طویل عرصہ سے غیر ملکی امداد سے چلنے والے ایک بڑے جاسوسی مرکز پر چھاپہ مارا گیا۔ سنسنی خیز انکشافات ہوئے کہ پاکستان کی کابینہ اور اہم سرکاری اور خفیہ حساس اداروں کی اہم رازدارانہ بات چیت کا ریکارڈ شدہ مواد باہر بھیجا جاتا تھا، پکڑا گیا۔ پچھلے عرصہ میں امریکہ کی طرف سے جدید ترین فیکس مشینیں حکومت کو تحفے میں ملیں۔ جن میں جاسوسی کی چپ لگی ہوئی تھیں جس سے پاکستان کے راز بیرون ملک



ضروری سمجھی گئی۔ آرپی چیف جنرل راجیل شریف اپنا غیر ملکی دورہ ملتوی کر کے کراچی آئے اور فوری طور پر اجلاس بلا کر ضروری اقدامات کی ہدایات دیں۔ پرنس کریم آغا خان سے فون پر رابطہ کیا اور تعزیت کی اس سانحہ میں ابتدا میں ہی را کے ملوث ہونے کے شواہد مل گئے جس پر تفتیشی اداروں نے دو افراد کو گرفتار کر لیا۔ ”را“ نے اس واردات میں کراچی کے اپنے انتخابی ماہر نامہ گٹ کلر کو استعمال کیا۔ ذرائع نے انکشاف کیا ہے کہ یہ دہشت گرد نائن زیرو پر پھاپے کے بعد زیر زمین چلے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں روک دی تھیں جس کے سبب وہ گرفتاریوں سے بچ گئے تھے۔ صفورہ گوٹھ میں ”را“ نے پھر ان کو استعمال کر لیا۔

### سانحہ مستونگ اور بلوچستان

بلوچستان کے ضلع مستونگ میں دہشت گردوں نے دو بسوں سے مسافروں کو اتارا جن کی تعداد ستر سے زائد تھی۔ ان کے شناختی کارڈ چیک کئے اور ان میں سے 25 افراد کو الگ کر کے باقیوں کو بس پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ان بچیس افراد کو اندر پہاڑی علاقے میں لے گئے۔ ان میں سے 19 افراد کو قتل کر دیا۔ یہ بس پشین سے کونڈہ کی طرف جا رہی تھی، ان کے ساتھ تیسری بس بھی تھی مگر ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی اور بھاگ کر جان بچائی۔ دہشت گردوں کی تعداد 25 تھی اور انہوں نے سکیورٹی فورسز کی وردیاں بہن رکھی تھیں۔ اس دوران لیویز فورس کو اطلاع مل گئی انہوں نے بروقت کارروائی کی لیویز کی فائرنگ کی وجہ سے دو بھست گرد ایک زخمی سمیت چھ منوی افراد کو پھوڑ کر فرار ہو گئے۔ صوبائی وزیر سرگرمز بگٹی نے پریس کانفرنس میں کہا کہ یہ حملہ بھارت کی ایجنسی ”را“ نے کیا ہے، اس میں صرف پشتون لوگوں کو الگ کر کے اغوا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ بلوچی اور پشتون کی

دہشت گردی میں ملوث ہے، اس کے کچھ حقائق رکھ رہے ہیں جو اخبارات میں بھی آچکے ہیں۔

### سانحہ گیارہ میں بھارتی ہاتھ

تین سال کے بعد حقائق سامنے آئے کہ سانحہ گیارہ میں بھارت کا خفیہ ہاتھ تھا۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں دہشت گردی کی وارداتوں کی طرح گیارہ میں بھی بھارت ملوث تھا۔ اس کا انکشاف بھارت کے بابا انا مک ریسرچ سینٹر کے ایک اہلکار نے کیا کہ بابا انا مک اینڈر ریسرچ سینٹر کے ذریعہ تمام ”آپریشن وائٹ واٹس“ نامی ایک ہتھیار کا تجربہ سیاحین میں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے گلشیر نیچے تک پھٹ گیا اور ایک بہت بڑا تودہ سلائیڈ کر کے پاکستانی فوجی کیمپ پر گرا جس میں 135 فوجی جوانوں سمیت 139 افراد کی شہادت ہوئی تھی۔ بھارتی میڈیا کی رپورٹ کے مطابق 2012ء کے اوائل میں بھارت نے دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ سیاحین گلشیر میں ایک منصوبہ بندی کے تحت اس خفیہ ہتھیار کا تجربہ ایسی جگہ پر کیا جہاں پاکستانی فوجی کیمپ اس کی زد میں آ سکتا تھا۔

### سانحہ صفورہ کراچی

کراچی میں دہشت گردی کے افسوسناک واقعے میں 45 سے زائد لوگ مارے گئے۔ دہشت گردوں نے صفورہ چورنگی پر اسماعیلی کیونٹی کی بس میں گھس کر اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں خواتین اور بچوں سمیت 45 بے گناہ لوگ مارے گئے۔ اس میں سب مشین گن اور ٹائٹ ایم ایم ہسٹول استعمال ہوئے۔ یہ کارروائی بھی ”را“ نے کی۔ اسماعیلیوں کو مارنے کا مقصد ایک تو کراچی میں کارروائی تھا جبکہ گلگت بلتستان میں اسماعیلی کیونٹی کے کافی لوگ آباد ہیں۔ ان کو ناراض کر کے پاک چین اقتصادی شاہراہ کے معاملے میں مداخلت

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



پر ختم لہر اس نے کی عوامی تحریک کے جواب میں بلوچستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور بلوچی اور پنجتون فسادات شروع کرانے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ مسافروں کے قتل اور اغوا کے بعد ایف سی نے دہشت گردوں کا تعاقب شروع کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مستونگ کے پہاڑی علاقوں دیگر چھوٹے موٹے گروپوں کے ساتھ ساتھ بلوچ ریپبلکن آریم (B.R.A) کے دہشت گرد کمانڈر عبدالغنی ہنگوئی کا کیمپ بھی موجود ہے۔ یہاں سے وہ دائیں بائیں کے علاقوں میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اس کارروائی میں مستونگ کے پہاڑوں میں روپوش ہونے والے دہشت گردوں کے خلاف فورسز نے آپریشن شروع کر دیا ہے۔ فورسز نے پہلی کاپڑوں کی امداد بھی حاصل کی جن کی مدد سے پورے علاقے کو گھیرے میں لے کر دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ فورسز کو ہدایت ملی ہے کہ دہشت گردوں کے خاتمے تک ان کے خلاف آپریشن جاری رہے گا۔ ان علاقوں میں اللہ نذر کی B.L.F اور لشکر بلوچستان کے خلاف کارروائی شروع ہوئی ہے۔ مستونگ میں جو کارروائی ہستوں کے خلاف ہوئی وہ ”را“ نے B.R.A کے ذریعے کردائی ہے۔ B.R.A براہدراخ بگٹی کی تنظیم ہے جسے براہدراخ کی غیر موجودگی میں عبدالغنی ہنگوئی نام کا دہشت گرد کمانڈر کر رہا ہے۔ اس کا مرکز مستونگ کی پہاڑیوں میں ہے۔ اس علاقے میں اس سے قبل بی ایل اے کا ایک گروپ اسلم گروپ عرف اچھو اور ازبک گروپ بھی کام کرتے رہے ہیں لیکن ”را“ کی نئی تقسیم کے مطابق مستونگ کا علاقہ اب بی آراے کے پاس ہے۔ بی آراے کا سربراہ براہدراخ اس وقت لندن میں ہے۔ جب سے برطانیہ سے بحر موموں کے جالے کا معاہدہ ہوا ہے اس وقت سے براہدراخ کا فون بند ہے۔ براہدراخ بھارت میں کئی دفعہ جا چکا ہے۔ وہ کافی عرصہ

لڑائی شروع کرائی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں ”را“ کے ملوث ہونے کے شواہد مل گئے ہیں۔ سانحہ تربت کے بعد حساس اداروں کی تحقیق کے مطابق ان سے کارروائیوں میں ”را“ پوری طرح ملوث ہے۔ جن میں دہشت گردوں سے بڑی تعداد میں کرن بھی بڑا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھاری تعداد میں بھارتی کونسل خانے سے لایا گیا تھا۔ بلوچستان میں بد امنی پھیلانے میں بھارت امریکہ اور اسرائیل تینوں ملوث ہیں۔

بھارت ایک دہشت گرد ملک ہے اس نے اپنے بڑی ملک سری لنکا میں 25 سال تک تامل ٹائیگر کو عسکری تربیت دے کر دہشت گردی کرائی تھی اور سری لنکا بڑی طرح متاثر ہو گیا تھا۔ بالآخر سری لنکا نے پاکستان سے مدد مانگی۔ پاکستانی افواج کے تعاون سے سری لنکا میں تامل ٹائیگر کا صفایا ہوا تھا۔ بھارت کی دہشت گردی کی ایک اور مثال میانمار میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے تمام مظالم کے پیچھے بھی بھارت کا ہاتھ ہے۔ بھارت کو اپنی ان ظالمانہ کارروائیوں پر بڑا فخر ہے۔

بھارت کے موجودہ وزیراعظم مودی نے گجرات میں ترین کو آگ لگوا کر سینکڑوں مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ بد قسمتی سے پاکستان کے ہمسایہ ملک افغانستان نے بھارت کو کھل گھیلنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ افغانستان میں بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے واقعات اور مستونگ کا حالیہ واقعہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مستونگ میں اس واقعہ کے بعد فورسز نے کارروائی تیز کر دی ہے۔ اس کارروائی میں مستونگ سے دو افراد گرفتار ہو گئے ہیں۔ جو دہشت گردی نے ان واقعے میں شامل تھے انہیں تفتیشی مرکز منتقل کر دیا گیا ہے، کچھ دہشت گرد فرار ہونے کی کوشش میں مارے گئے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ ”را“ نے مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی

READING  
Section



مودی گئے۔ وہاں ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش کا قیام ہر بھارتی کی خواہش تھی۔ انہوں نے یہ بات اس تقریب میں کہی جس میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بھاری واجپائی کو بنگلہ دیش کے قیام میں فعال کردار ادا کرنے پر اور دونوں ممالک کے تعلقات مضبوط بنانے پر ”بنگلہ دیش لبریشن وار آفیز“ کا ایوارڈ دیا گیا۔ نریندر مودی نے یہ ایوارڈ بنگلہ دیشی صدر عبدالحمید سے لیا۔ نریندر مودی نے اس موقع پر کہا کہ جب بنگلہ دیش کے لئے لڑائی لڑنے والے بنگلہ دیشی اپنا خون بہا رہے تھے 1971ء میں جب بنگلہ دیش کی حمایت میں بھارت کے اندر ”ستیا گرد“ تحریک چلی نوجوان رضا کار اس میں بھرتی ہونا شروع ہوئے تو میں بھی ذاتی طور پر اس تحریک میں شامل تھا اور بھارت سے عسکری تربیت حاصل کر کے بنگلہ دیش کے ساتھ مل کر جنگ میں شامل رہا ہوں۔ بنگلہ دیش نے پاکستان توڑنے اور غیر مستحکم کرنے کے اعتراف میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بھاری واجپائی کو فرینڈ آف بنگلہ دیش لبریشن وار ایوارڈ دیا جو موجودہ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے ایک تقریب میں وصول کیا۔

اس سے قبل بھی 2012ء میں بنگلہ دیش کی جانب سے پاکستان کو دلچست کرنے کی سازش میں اندرا گاندھی کو فرینڈ آف بنگلہ دیش لبریشن وار ایوارڈ دیا گیا تھا جسے بھارتی کانگریس پارٹی کی رہنما سونیا گاندھی نے وصول کیا تھا۔ بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد نے پاکستان توڑنے پر سابق بھارتی فوجی آفیسران کو بھی تاریخی اسناد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ نریندر مودی بار بار پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے بے سرو پا الزامات لگاتے ہیں جبکہ دوسری طرف بھارت اب بھی پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے لئے ”را“ کو استعمال کر رہا ہے۔ پاکستان میں ہونے والی پچانوے فیصد وارداتوں میں بھارت طوٹ ہوتا ہے جس

افغانستان میں ”را“ کے مرکز اور بھارتی کونسل خانوں میں بھی جاتا رہا ہے۔ اس کا سارا ریکارڈ ملکی سلامتی کے اداروں میں موجود ہے۔ پاکستانی وزارت داخلہ نے برطانیہ سے بلوچ دہشت گردی میں طوٹ لوگوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا ہے لیکن عمران فاروق قتل کیس میں پاکستان سے حد درجہ تعاون کا طلبکار برطانیہ اپنے ملک میں بیٹھے علیحدگی پسند بلوچوں کے خلاف کارروائی سے فی الحال گریزاں ہے۔ پاکستانی وزارت داخلہ اسی حوالے سے عمران فاروق قتل کیس میں طوٹ معظّم علی کو برطانیہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ اس شرط پر کرے گی کہ برطانیہ بھی جبریا زہری خان آن قلات اور براہہ مرخ کو پاکستان کے حوالے کرے۔

پاکستان کو مطمئن کرنے کے لئے برطانوی حکومت کہہ رہی ہے کہ ان تینوں افراد کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر کسی بھی طرح پاکستان کے خلاف کسی دہشت گردوں کا کارروائی میں شامل ہوئے تو ان کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مگر ان دہشت گردوں کی تنظیموں نے اپنی کارروائیاں کم کرنے کے بجائے تیز کر دی ہیں۔ بی ایل اے کے سربراہ براہہ مرخ مری اور اس کا معاون خیر بیار مری لندن میں لگژری لائف گزار رہا ہے۔ پاکستان نے کافی عرصہ پہلے سے ان تینوں افراد کے بارے میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رکھا تھا کہ ان کو پاکستان کے حوالے کیا جائے مگر برطانوی حکومت پاکستان کو مشورہ دیتی تھی کہ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی طریقے سے حل کریں۔ امریکہ بھی چونکہ بلوچستان میں دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے۔ برطانیہ کو مجرموں کو حوالے کرنے والے معاملے پر امریکہ سے بھی اجازت لینی ہوگی۔

**بنگلہ دیش بنانے میں ”را“ کا کردار**

بنگلہ دیش کے دورے پر بھارتی وزیراعظم نریندر

READING  
Section



بھارت کے ایجنڈے کو آگے بڑھائیں گی۔  
حسینہ واجد نے اقرار کیا کہ حالیہ الیکشن میں ”را“  
نے حسینہ واجد کی بھرپور مدد کی۔ حسینہ واجد کی ”را“ نے  
ویسے ہی مدد نہیں کی بلکہ اس کے بدلے میں بہت کچھ منوایا  
گیا۔

بعض پاکستان صحافی جنہوں نے 1971ء کے  
حوالے سے پاکستانی فوج کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی  
کہانیاں گھڑی تھیں وہی اب بھارت کے حق میں ”امن  
کی آشا“ کے گیت گارہے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم نے  
بنگلہ دیش کی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کو  
بھی وارننگ دی کہ پاکستان بھارت کو سلامتی کونسل کا  
مستقل رکن بننے کی کوششوں میں روزے اٹکا رہا ہے۔  
اس موقع پر بنگلہ دیشی وزیراعظم نے مزید مودی کو وہ  
تصویر بھی پیش کی جس میں پاکستانی فوج کے کمانڈر امیر  
عبداللہ خان نیازی اور جگجیت سنگھ اردو کو دستخط کرستے

نے پاکستان میں کچھ ننگ وطن اور ننگ دین لوگوں کو خرید  
رکھا ہے۔ یہی حال افغانستان کا ہے۔ جہاں سے بھارتی  
کیپوں میں تربیت پانے والے دہشت گرد پاکستان میں  
آ کر تباہی پھیلا رہے ہیں۔

پاکستان میں ایک لابی جو سیاستدانوں میں بھی ہے  
اور میڈیا میں بھی ہر وقت بھارت کے گیت گاتی ہے اور وہ  
اہل وطن کی برین واشنگ کرتا چاہتے ہیں اور ان کو  
بھارت کا ہموا بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ کشمیر میں  
بھارتی فوج کا کشمیری مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم  
مسلمان خواتین کی عصمت درزی کے کھلے واقعات کو  
نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حسینہ واجد نے برطانوی ”را“ کی  
ایجنٹ ہونے کا اعتراف کیا۔ اس پر فخر کرتے ہوئے اس  
نے بتایا کہ وہ کس طرح باغی میں ”را“ کے لئے کام کیا  
کرتی تھی اور ”را“ نے شہر قی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے  
میں کیا کردار ادا کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ

ISO 9001:2008

# النورین

رجسٹرڈ

النور الیکٹرک انڈسٹریز 75-B، سال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447 , 0300-9702203 , 0345-6333393

<http://www.alnoorfans.com>



ہونے دکھایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی بنگلہ دیشی وزیراعظم نے کھل کر "را" کا ایجنٹ ہونے کا اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ بنگلہ دیش بھارت اور "را" کی کوششوں سے وجود میں آیا۔

## اجیت کمار دوول

بھارت کی قومی سلامتی کا مشیر اجیت کمار دوول جسے ڈیول بھی کہا جاتا ہے، نریندر مودی کو پاکستان کے خلاف اور پاکستان کو توڑنے کے حوالے سے مشورے دیتا ہے۔ اجیت کمار عالمی دہشت گردی کی شناخت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی دہشت گردی کا دائرہ کار پاکستان، چین، افغانستان اور ایران تک ہے۔ اس کا اعتراف امریکہ کے ڈیفنس سیکرٹری چک ریگل نے بھی کیا۔ اس نے کہا کہ بھارتی اجیت کمار نے امریکہ کو بھی پاکستان کے خلاف اپنی گھناؤنی سازش میں استعمال کیا۔ افغانستان کو پاکستان کے خلاف کرنے میں اس شخص کا بڑا کردار ہے۔ جنوبی ایشیا میں دہشت گردی پھیلانے والا یہ سابقہ پولیس آفیسر سپاہی ماسٹر اور جاسوس اجیت کمار ہی ہے۔ اس خطرناک دہشت گرد نے پاکستان کے خلاف داعش اور طالبان کا مشترکہ محاذ بنانے کی بڑی کوشش کی۔ اس شخص نے اپنی چالاکی سے بعض جگہ سی آئی اے کو بھی استعمال کیا۔ اجیت کمار نے تحریک طالبان پاکستان لی بی پی اور داعش کی قیادت کی ایک ملاقات قندھار کے بھارتی کنسل خانے میں کرائی اس کے بعد پاکستان میں طالبان لیڈروں نے شاہد اللہ شاہد کی کمان میں داعش میں شامل ہونے کا اعلان کیا تھا مگر ضرب عضب کی وجہ سے طالبان یہاں پر تک نہ سکے۔ اس طرح یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اس منصوبے کو ناکام بنانے میں سی آئی اے کی بھی بڑا کردار ہے۔ آج بھی داعش کی باقاعدہ شاخ بھارت میں موجود ہے جبکہ پاکستان میں اس کا قلع قمع کر دیا گیا۔

اجیت کمار نے 1990ء میں سرینگر میں غیر ملکی سیاحوں کا ڈرامہ رچایا تھا۔ حضرت بل میں جن لوگوں کو مجاہدین کے روپ میں داخل کر کے سکیورٹی ایجنسیوں نے ڈرامہ کیا تھا۔ وہ سارا پلان اجیت کمار کا تھا۔ اسی اجیت کمار نے ترہنہ پالی کی مدد سے پاکستان میڈیا میں "اسن کی آشا" اور "سیفا" کے منصوبے بنائے جو ابھی بھی چل رہے ہیں۔ یہ اجیت کمار بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کا سکیورٹی ایڈوائزر ہے۔

اب بھی بلوچستان میں تمام علیحدگی پسند تنظیموں کے لیڈروں سے اس کے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ اس نے ستمبر میں بھارتی ایجنسیوں کے افسران سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ بھارتی سکیورٹی اداروں کو چاہئے کہ وہ پاکستان کے خلاف زور و شور سے سرگرم ہو جائیں۔ وہ پاکستان کے خلاف سرگرم قوتوں کو فئڈز اور اسلحہ مہیا کریں، انہیں عسکری تربیت مہیا کریں۔ پاکستانی قوم میں فرقہ وارانہ اور نسلی اختلافات کو ہوا دیں تاکہ پاکستان میں ابتری پیدا ہو اور نفسیاتی پھیل جائے۔ ہر پاکستانی دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھے۔ بھارت اس وقت کامیاب ہو گا جب پاکستان تباہ ہو جائے، چین خاموش ہو جائے اور کچھ قوم مٹ جائے تب بھارت دنیا میں عالمی قوت بن کر ابھرے گا۔

آئیے، آزادی کے جشن منانے کی بجائے اس بات کا عہد کریں کہ ہم نے دشمن کی ان سب تدابیر کو ناکام بنانا ہے۔ آپس میں محبت اور یگانگت پیدا کرنی ہے، فوج کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہے، وطن دشمن قوتوں پر نظر رکھنی ہے اور بھارتی ایجنٹوں کو پہچان کر ان کو رسوا کر کے پاکستان پہچانا ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، ان شاء اللہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا!

\*\*\*



اس خاندان اور قوم کا خدائی حافظ ہے جس کے احساسات مرنے لگیں اور احساسِ زیاں ہی جاتا ہے۔ یہی ہماری اس قوم کا الیہ رہا ہے کہ اس نے اپنی اعلیٰ اقدار کھو ڈالی ہیں اور اس کی رہنمائی اتھمالی طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، جس نے قوم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

ماہ اگست کے لئے ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی خصوصی تحریر "تاریخ" "حکایت" کی نذر

## بھٹکے ہوئے راجہ

خصوصی تحریر



SCANNED BY AMIR

Section



## پہلا باب... تعارف

برصغیر کی تقسیم سے قبل مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں مسلمانوں کے چار قبائل آباد تھے۔ جو مال و دولت، جاہ و شہرت اور اپنی اپنی برادری کی تعداد کے پیش نظر ایک دوسرے کے مساوی تھے۔ اول، پٹھان جو تعداد کے لحاظ سے تو غالباً دوسروں سے کم تھے مگر اپنی شان و شوکت اور روایتی دلیری میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سمجھتے تھے۔ دوسرا قبیلہ راجپوتوں کا تھا، جن کی گوت گھوڑے واہ، اس امر کی نشاندہی کرتی تھی کہ ان کے بزرگ شمشیر زنی اور گھڑ سواری کے مدہنی تھے۔ تیسرا قبیلہ گجروں کا تھا۔ یہ نہ تو تعداد میں کم تھے اور نہ ہی زمین اور مال مویشی کی ملکیت کے لحاظ سے اپنے آپ کو کسی سے کمتر گردانتے تھے۔ جہاں تک خاندانی وجاہت کا تعلق تھا تو وہ اپنا شجرہ نسب سلاطین گجرات اور قنوج کے راجاؤں گرجاردوں سے جوڑتے تھے۔ چوتھا یہ ہے کہ اس قبیلے کی جزری اور محنت کی عادت نے سردانہ وقار دور زمانہ حسن کے ساتھ مل کر انہیں دوسروں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے ممتاز بنادیا تھا۔ چوتھا قبیلہ رانیوں کا تھا، جو اچھے اور محنتی کا شکار ہونے کے باعث دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھے۔ ان میں ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کرتے تھے بلکہ خاموشی، سنجیدگی اور دانائی سے اپنی بہتری کی تک و دو میں مصروف رہتے اور دوسروں کی چھوٹی موٹی زیادتیوں کو بھی نظر انداز کر دیتے، کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا۔ آخر میں بیت بھی انہیں کی ہوتی۔

ملک کی تقسیم کا عمل شروع ہوا تو قبائلی شناختیں اور مصلحتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ اب تو سوال صرف ہندو مسلمان کا تھا۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اگر لٹ ریت تھے، گاؤں کے گاؤں جلائے جا رہے تھے۔ سب کا

نیاں تھا کہ جائیداد و بیڑن، پاکستان میں شامل کیے جائے گا۔ جب سرحدی کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہوا تو سرحد کی لکیر دھڑکنے لگی اور لاہور کے درمیان میں ٹھنچ دی گئی۔ سب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ باقی نہ تھا کہ گھریاں چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچا جائے۔ یوں یہاں بھی ہجرت کا عمل جاری ہوا۔

ہوشیار پور کے گاؤں ٹانڈہ سے ہجرت کر رہے تینوں میں گجروں کا ایک کنبہ بھی شامل تھا جو تین سالہ میجر یعقوب علی خان، ستائیس سالہ بیگم زبیدہ یعقوب، تین سالہ بچی ماریہ یعقوب اور ایک سالہ شیر خوار مطلوب علی یعقوب پر مشتمل تھا۔ تقسیم برصغیر کے چھپے ہوئے تو میجر یعقوب علی اپنی پٹنن کے ہمراہ سنگا پور میں مقیم تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مسلمان فوجیوں کو اس انداز میں مقیم رکھا جائے کہ پاکستان وجود پاتے وقت کمزور اور نہتہ رہے۔ میجر یعقوب علی نے دور اندیشی سے کام لیا اور وسط جون میں دو ماہ رخصت کی درخواست دے دی جو تک و دو کے بعد یکم جولائی 1947ء سے منظور ہو گئی۔ اس طرح وہ جولائی کے پہلے ہفتے میں اپنے گاؤں ٹانڈہ پہنچ گیا۔ اس تاریک دور میں اس کی گاؤں میں موجودگی اپنے خاندان، دیگر اصحاب بلکہ گاؤں کی تمام آبادی کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔ ہر کوئی یہ خیال کرتا تھا کہ میجر یعقوب علی اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر ستم رسیدہ مسلمانوں کی جانیں بچا لے گا۔ پھر ہوا بھی اسی طرح۔ اتفاق سے ہوشیار پور چھاؤنی میں مقیم ڈوگرار جنت کا کرنل آئی، ایف سکاٹ اس کا پرانا رفیق کا رٹنل آیا۔ دونوں 1943ء کے دور میں چنا گیا تھا چھاؤنی کے ایک ہی ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں سٹاف ڈیوٹی پر متعین رہے تھے۔ اسی طرح ٹانڈہ کے مسلمانوں کے لئے جو الوداعی کیمپ لگا، اس کا انچارج میجر ہنگارہ سنگھ

READING  
Section



کیمپوں میں رہا کارنامہ خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس کی ذیونی والٹن کیمپ میں لگی ہوئی تھی مگر اسے اتفاق آجھنے کہ جس دم ہوشیار پور کا قافلہ والٹن پہنچا، وہ اپنے فرائض مکمل کر کے گھر جا چکا تھا۔

انسپکٹر محبوب علی اپنے خاندان کے بارے میں پریشان رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے مختلف قافلوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کیمپ سے معمولی خبر کی بھی آس ہوتی تو وہ اسے حاصل کر کے رہتا۔ بھائی، مرغوب علی سے بھی کیمپوں اور قافلوں کی ذہنی یاد جاننے کی کوشش کرتا مگر کسی مایوسی کو گناہ خیالی کیا کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ اپنے بھائی سے کیمپ کی روئیدار سن رہا تھا کہ اس کا اردلی دوزادہ آ آیا اور اطلاع دی کہ دفتر میں والٹن مہاجر کیمپ کے افسران کا قون آیا ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ ”میجر یعقوب علی بچوں سمیت بحفاظت لاہور پہنچ گئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ جو وہاں جا کر انہیں لے آئیں یا کسی مناسب سواری کا بندوبست کر دیں، جو انہیں آپ تک پہنچا دے۔“

انسپکٹر محبوب علی کے پاس پولیس کی گاڑی موجود تھی۔ کئی مرتبہ رات کے وقت اسے مہاجرین کے کیمپوں میں جانا پڑتا تھا مگر میجر یعقوب علی کو گھر آنا اس کی سرکاری ذیونی کا حصہ نہیں تھا۔ لہذا وہ سڑک پر نکل گیا اور تین تانگے اکٹھے کر لئے، پھر انہیں کچھ پیچلی رقم بھی ادا کر دی۔ مہاجرین اور پولیس کے لئے کام کرتا رہے تانگے والے اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ مرغوب علی کو تانگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا گیا۔

مہمانوں کی آمد کا سننا تھا کہ تمام گھر خوشی سے چمک اٹھا۔ کئی روز سے بے یقینی اور بے اطمینانی کی جو کیفیت طاری تھی، وہ ختم ہوئی۔ یہ خاندانی اتحاد اور یگانگت کی روشن مثال تھا۔

مرغوب علی ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ والدین

الہوالیا، جس کا تعلق پانچویں سکھ برائین سے تھا، میجر یعقوب علی کی ڈہردون میں ٹریننگ کا دیرینہ ساتھی نکلا آیا۔ اس وقت کی نصائے پیش نظر کسی سکھ افسر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اس کے علاوہ چارہ کار بھی کیا ہو سکتا تھا؟ ادھر میجر الہوالیا نے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کے باعث دوسرے اور شکوک جنم پاتے۔

دوران سفر معاملات البتہ مختلف رہے۔ اس قافلے سے بھی موت نے اپنا خراج وصول کیا۔ بھوک، بیماری، قدرتی آفات، ہر قسم کی بندوقیں اور سکسوں کی کرپائیں، کبھی اپنا حصہ پاتی رہیں، پھر بھی یہ قافلہ دوسروں کی نسبت خوش نصیب رہا۔ جانی نقصان خاصا کم ہوا۔ گو نقدی اور زیور، جو پاس موجود تھا، راستے میں چھین گیا مگر جوان بچیوں کی حفاظت کا مرانی سے ہمسکار ہوئی۔ لاہور پہنچ جانے پر اس قافلے کو والٹن کے مہاجر کیمپ میں جگہ دی گئی۔

اس قیامت خیز دور میں لاہور کی مقامی آبادی نے انصار مدینہ کی روایت نازہ کر دی تھی۔ جتنا کسی سے بن پڑا اس نے کئی لڑکی۔ مہاجرین نے ان خدمات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بھائی چارے کی یہ عظیم مثال تاریخ میں تابناک دکھائی دیتی ہے۔

میجر یعقوب علی کے خاندان کو ایسی مراعات کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے دو بھائی پہلے ہی لاہور میں مقیم تھے۔

بڑا بھائی چوہدری محبوب علی خان محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا اور ان دنوں کارِ خاص سے وابستہ تھا۔ یہ افسر اپنی کارکردگی اور حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور تھا اور وسیع حلقے میں جانا جاتا تھا۔ بعد ازاں اعلیٰ عہدوں تک پہنچا۔

چھوٹا بھائی چوہدری مرغوب علی خان اسلامیہ کالج میں ایم اے انگریزی کا طالب علم تھا۔ اس نے بی اے کے بعد تعلیم کے دو سال مکمل کر لئے تھے اور اب مہاجر



یہی اس نے اپنے ماسٹر صاحب سے سنا تھا۔ سمجھنے اور دیکھنے کے فرکوش سے مطلوب کی بھلا کیا تربیت ہوگی؟ بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ اپنی امی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا، مگر امی تھی کہ باورچی خانے میں اس طرح جٹی ہوئی تھی کہ گویا کھانوں کا ڈھیر اگا دے گی۔ نوکر اور اردلی انیسٹم محبوب علی کے ساتھ گھر درست کر رہے تھے اور نوکرانی دوڑ بھاگ اور کام کاج کے ساتھ جیگم صاحب کی جھڑکیوں اور گھر کیوں میں اس طرح دبی ہوئی تھی کہ سبے چاری خواہ ایک کھلوہ بنی نظر آتی تھی۔ ان حالات میں عمران اور سلطان کا مشوروں میں کون شریک ہوتا؟ الغرض گھر کا ہر شخص اپنے اپنے کام میں اس طرح منہمک تھا کہ چاند رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

بالآخر مہمان گھر پہنچ گئے۔ خوشی کے اظہار کے ساتھ ساتھ غم کا مظاہرہ بھی ہوا۔ دونوں بھائی بھگتے ملے تو جھپٹیں نکل گئیں۔ دہرائی جیٹھانی کا بھی یہی حال تھا۔ ایک دوسروں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ خوشی اور مسرت کے حد و انہاں ختم ہو رہی ہیں اور غم کا سیلاب کہاں سے شروع ہو رہا ہے؟

بارت طوفان تھا اور قدرے سنوٹا ہوا تو میجر محبوب علی سے راستے کی تکالیف، برادری و رشتہ داروں، دوست احباب اور واقف کاروں کے حالات اور کوائف کے متعلق پوچھا گیا۔ ان حالات پر بھی بات ہوئی تو راستے اور گھروں میں خوش آئے تھے۔ یہ گفتگو جائے کے دور پر شروع ہوئی وہاں سے کھانے کی میز پر منتقل ہوئی اور پھر ڈرائنگ روم میں آدھی رات تک جاری رہی۔

بب نصف رات کا گھر بجا تو سب چونک اٹھے، کہا کہ آج اتنا بہت ہے، ہر کوئی آرام کرے، یہ باتیں تو شاید سب باقی عمر میں ختم نہ ہو سکیں۔

اس کی خوشیوں کی تمنا دلوں میں لئے دنیا چھوڑ چکے تھے۔ محبوب علی ہی بڑے بھائی ہوئے کے ٹاسٹے خاندان کا سربراہ تھا اور اس طور روایتی عزت کا حقدار بھی۔ اس نے غلامت کے دوران جانہ مر کے ایک متمول اراکین خاندان میں اپنی پسند مگر والدین کی رضامندی سے شادی کر لی تھی۔ ذات پات کے حوالے سے اس کی دلہن دوسرے خاندان سے آئی تھی۔ اب وہ چار بچوں کا والد تھا۔ لڑکے دونوں بڑے تھے جبکہ لڑکیاں چھوٹی۔ دونوں لڑکے عمران اور سلطان ہائی سکول میں پڑھتے تھے جبکہ لڑکیاں عفت اور عصمت پر انٹرمی سکول میں۔ سناٹا سب سے پریشاں کا رواج تھا۔ یہ بدداشت نہیں کیا جاتا تھا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی کلاسنگ پر اپے اپنے مدارس جائیں۔ تمام کزن البتہ ان کے عمروں میں تھے کہ بڑے بچوں کے سامنے سبے بچوں کا ایک دوسرے سے مل سکیں۔

مہمانوں کی آمد پر گھر میں سچے سچے والی اہل غیر معمولی تھی۔ محبوب علی تو اپنے بھائی اور بھانجے کا شیدائی تھا علی، اس کی جیگم سیکند بھی اپنے دیور اور چھوٹی بھانج سے کم محبت نہ کرتی تھی۔ جب تک مرغوب علی مہمانوں کو بالکل کمپ سے سبے کر گھر پہنچتا، گھر میں بچوں کے جوش مٹنے ایکسٹنشن کی صورت پیدا کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنی اپنی گزریاں میں نکالی کہ بیٹھ گئیں اور ان میں سے گزریاں میں چن کر طیخہ و کزلیں جو انہیں اپنی پچازاد مار یہ کو پیش کرنا تھیں۔ لڑکوں کا مسئلہ البتہ دوسرا تھا۔ ایک سال مطلوب کے لئے کون سے کھلونے مہیا کئے جاتے؟ ان کے اپنے کھیلوں کا سامان مطلوب کے لئے سبے معنی تھا۔ آپس میں بحث و مباحثے اور مشورے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک بھائی جس کھلونے کا نام لیتا، دوسرا اسے یہ نہ کر رہ کر دیتا کہ یہ بڑی عمر کے بچوں کے لئے ہے۔ دوسرے کی تجویز کو پہلے یہ کہہ کر نامنظور کر دیتا کہ کھلونے کا مفاد دل چاہا ہے کے علاوہ تربیت بھی ہوا کرتی ہے۔

READING  
Section



## دوسرا باب..... خاندانی اقتدار میں رخسہ

مرغوب علی ایم اے انگریزی کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ پھر مہاجرین کے لئے پٹے قافلے لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہ قافلے دیکھی لوگوں کا مجموعہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے ہمراہ مریض بھی ہوتے اور زخمی بھی۔ کئی اعزاء و اقرباء کی روح فرسا اسوات پر ہندو حال نظر آتے۔ ان کے ذہنوں میں توقعات بڑی ہوتیں اور اس کی چند گز نہیں بھی۔ نومولود ریاست کے لئے ان کی حتی الوسع دیکھ بھال انتہائی لازم تھی۔ نوجوان طالب علموں نے ان کی چارہ جوتی کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا تھا۔ مہاجرین کے کھانے پینے اور علاج معالجے کے مراحل ہر روز کوہ پیائی کے مترادف ہو کر رہتے تھے۔ سہولیات کی تقسیم بسا اوقات بڑا مسئلہ نظر آتی تھی۔ جن لوگوں کو شمالی اور مغربی اضلاع کی طرف روانہ کیا جاتا، ان کے لئے ٹرانسپورٹ کی بہم رسانی دوسرا بوجھ بن جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے دور میں مقامی نوجوانوں نے اخوت اور درددل بٹانے کی لازوال داستانیں رقم کی تھیں۔ مرغوب علی بھی کسی غور و سرور سے کم نہیں رہا تھا۔

ان دنوں تعلیم اور امتحانات کا ہوش بھلا کسے تھا؟ کار و تجارت کا مرحلہ جو جون کے پہلے ہفتے میں شروع ہوا۔ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اکتوبر آ گیا مگر مہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ حکومت نے رضا کار طالب علموں کو یہ رعایت دی کہ جو طلباء و طالبات ایم کا سلیپس ختم کر چکے تھے اور مہاجرین کی دیکھ بھال کے لئے مہاجرین کی کمیوں میں خدمات انجام دے رہے تھے، انہیں اعزازی سندات بغیر امتحانات کے جاری کر دیں۔ اسی ضمن میں مرغوب علی کو بھی اعزازی سند مل گئی۔

اگر امتحان ہو بھی جاتے تب بھی مرغوب علی ضرور

پاس ہو جاتا اور اچھے نمبر حاصل کرتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جو بھی ملک میں سکون رونما ہوا، وہ مقابلے کا امتحان ضرور دے گا۔ اس بچے وقت گزارنے کے لئے اس نے صحافت کا پیشہ منتخب کیا تھا۔ روزانہ چھ سے آٹھ گھنٹے مہاجرین میں کام کرتا، پھر وہیں سے سائیکل پر سیدھا ایک روزنامے کے دفتر چلا جاتا اور نصف اللیل تک اخبار کی ترتیب و تزئین میں مصروف رہتا۔ گاہا تھک جاتا۔ آدمی ذہین تھا، اس لئے ادارے کے کربا و مربتا اس کے کام اور متعلقہ شعبوں سے بے حد غور و فکر کرتے۔ اخبار کی وساطت میں بہت سے ریلوے والوں سے اس کی شناسائی ہوتی تھی۔ اُسے ریلوے پر وگرام بھی ملنے لگے۔ کبھی کوئی کہانی لکھتا، کبھی تبصرہ، کبھی کسی ڈرامے میں اداکاری کے جوہر دکھاتا اور کبھی کوئی سدا کی پروگرام کر لیتا۔ یہ سارے کام ویسے ہی تھے جیسے آج کی صحافتی ذمہ داریاں۔ حقیقت یہ ہے کہ محنت، ذوق و شوق اور ذہانت کے مل جلنے پر اس نے اخبار اور ریلوے دونوں جگہ اپنا مقام بنا لیا تھا۔ یوں اسے شہرت بھی ملی اور اوق کی تسکین بھی ہوئی۔

ریلوے میں ان دنوں ایک عیسائی لڑکی میں زلیخا زلیخا رام کے بڑے چمپے تھے۔ اس نے مشین کے خرچ پر ایف سی کان لگایا اور کی معرفت انگریزی میں ایم اے مکمل کیا تھا۔ باب ایک مشین ہسپتال میں کپاؤنڈر تھا۔ لاہور کے لوگ اب بھی خوش اخلاق زلیخا رام کپاؤنڈر کو بھولے ہوں گے، جو مریضوں سے ایسا اچھا برآؤ کرتا کہ لوگ ڈاکٹروں کی بجائے اس کی طرف رجوع کرنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ مسٹر زلیخا رام کے خاندانی پس منظر سے کوئی واقف نہ تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ 1882ء کے قریب میو ہسپتال کی ایک ہندو ہمدرداری کے ہاسپٹل پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد اس کی پیدائش سے پہلے ہی مر گیا تھا، یا لاہور پھوڑ کر چلا گیا تھا۔ خاتون بے چاری محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتی تھی، بچے کو کیسے سنبھالتی؟ اس



میں اُس کی نسوانی آواز مرغوب علی کے ساتھ سنائی دے گی۔ سچ ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ مرغوب علی ٹریا کی طرف پہلے تھوڑا تھوڑا راغب ہوا، پھر مائل ہوا اور بالآخر یہاں تک جا پہنچی کہ

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ  
کیا جائے تُو نے اُسے کس آن میں دیکھا

مرغوب علی کوئی سادہ دل نوجوان نہیں تھا کہ ٹریا کی چال میں آ گیا۔ اس نے سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا۔ اگرچہ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ تقسیم کے عمل اور خاندانوں کے مختلف جگہوں پر بٹ جانے کے باعث جو عمومی خلا واقع ہوا، اس نے قوم کی مجموعی نفسیات پر یہ اثر ڈالا تھا کہ لوگ جذباتی خلا کو پورا کرنے کے لئے مصنوعی سہارے تلاش کرنے لگے تھے، مگر مرغوب علی ٹریا کی محبت میں اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ مصنوعی سہارے کی بجائے مستقل تعلقات اور حقیقی روابط کی واضح شکل و صورت رکھ رہا تھا۔ اب صرف دو خاندانوں کے سربراہوں کی رضامندی سے چاہنے والوں کا رشتہ ازدواج میں بندھ جاتا ہی باقی رہ گیا تھا۔

ٹریا نے جب اپنے والد زلیا رام سے اپنے جذبات اور پروگرام کا اظہار کیا، تو بوزھا کپاؤ نڈر دھک سے رہ گیا۔ وہ مقامی عیسائی معاشرے میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مشن والے بھی اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ تو یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اُس کی اکلوتی لڑکی ایک مسلمان سے شادی کر لے، جس کے نتیجے میں ممکن ہے، کہ اُسے اپنے باپ کا مذہب بھی چھوڑنا پڑ جائے۔ اس کی نظر میں اسی مسئلے کا صرف یہی حل تھا کہ مرغوب علی عیسائی ہو جائے یا ٹریا اُس لڑکے کا خیال چھوڑ دے اور کسی عیسائی لڑکے سے شادی کر لے۔

ادھر مرغوب علی کو اپنے بڑے بھائیوں سے اپنے جذبات کے اظہار کی جرأت نہ ہو رہی تھی۔ اس کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں بڑوں کے سامنے

سنے یہ بچہ یونگ صاحب کے حواس لے کر دیا، جن کے نام پر مال روڈ پر یونگ ہال ابھی تک موجود ہے۔ پادری یونگ نے بڑی دلچسپی سے بچے کو پالا، پڑھایا اور کپاؤ نڈری کی تربیت دلائی۔ یہ پادری صاحب ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زلیا رام میں انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

زلیا رام کی صاحبزادی مس ٹریا، جب کالج سے ایم اے انگریزی کر کے نکلی تو اس کی ذہانت، چال ڈھال اور ادنیٰ ذوق و شوق کی دھوم ہر طرف مچ گئی۔ کسی نے اُسے دیکھ کر شرارتیہ شعر کہہ دیا جو پہلے تو کالج کے لڑکوں کی زبان پر چڑھا اور پھر علاقے کے طول و عرض میں پھیل گیا۔

اگر میں ممتحن ہوتا تو نمبر سو کے سو دیتا  
لیاقت کے الگ دیتا ذہانت کے الگ دیتا  
بعد میں لوگوں نے دوسرے مصرعے میں ذہانت کی بجائے ”نزاکت“ لگا کر شعر میں ترمیم کر لی اور اس طرح اسے جا بجا استعمال کرنے لگے لیکن جہاں تک مس ٹریا زلیا رام کا تعلق تھا، نہ تو اُس میں نزاکت کا عنصر تھا اور نہ ہی زنانہ حسن کی فراوانی تھی۔ بس واجبی سی شکل و صورت تھی، جسے تعلیم اور لباس نے گوارا بنا دیا تھا، مگر چال و حال میں ایک خاص انداز ضرور تھا۔ اٹھتے ہوئے شباب، سادگی اور پُر کاری نے اُس میں ایک مخصوص انفرادیت پیدا کر دی تھی، جسے دیکھ کر اکثر لوگ جوش مرحوم کا یہ شعر پڑھ دیتے۔

مہترانی ہو کہ رانی مگنٹائے گی ضرور  
کوئی ہو عالم جوانی، مسکرائے گی ضرور  
کچھ دنوں سے مرغوب علی اور ٹریا کو باہم دیکھا جا رہا تھا۔ ٹریا اب وقت نکال کر مہاجرین کے والٹن کیمپ میں بھی جانے لگی تھی۔ کبھی کبھی مرغوب علی کے ساتھ اُس کے اخبار کے دفتر میں بھی جاتی تھیں۔ کبھی ریڈیو ڈراموں

READING  
Section



چھوٹے اس قسم کی بات بھل کر نہ کر سکتے تھے۔ اسے صرف روشنی کی ایک ہی کرن نظر آتی تھی۔ اس کے بڑے بھائی محبوب علی نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور والدین نے اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔ چنانچہ ایک دن وہ موقع نکال کر سیکند بھابی کے پاس جا بیٹھا اور اظہارِ مدعا کے لئے مناسب تمہید سوچنے لگا۔

بڑی بھابی ماں کی جگہ تھی، بیگانی برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے خاندان میں اپنا وقار مقام بنالیا تھا۔ وہ محبت اور شفقت کی پتلی تھی۔ مرغوب اگرچہ اس کا چھوٹا بھائی تھا مگر سیکند محبوب اسے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح چاہتی تھی۔

اس نے جب دیکھا کہ مرغوب علی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اسے جرأت نہیں ہو رہی، تو اس نے خود بات کا آغاز کرتے ہوئے اس سے پوچھ لیا کہ وہ متذبذب کیوں ہے؟ مرغوب علی نے بھابی کے رویے اور گفتگو کے انداز سے حوصلہ پایا اور اپنے دل کی بات بیان کر دی، ساتھ ہی بھابی سے مدد کی خواہش کی۔

بھابی، بیگم سیکند محبوب کو جب صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بہت متفکر ہوئی۔ اس نے مرغوب علی کو پیار سے سمجھایا کہ ”تمہیں اپنی خاندانی روایات کا علم ہونا چاہئے۔ میرے خاندان والوں اور تمہارے ماں باپ نے میری اور انسپکٹر محبوب علی کی شادی کی اجازت اس لئے دے دی تھی کہ وہ کمر تھے تو ہم اراکین۔ دونوں ہی زمیندار خاندانوں کے افراد تھے، مگر اس پر بھی دونوں طرف سے بہت لے دے ہوئی تھی لیکن جو بات تم کہہ رہے ہو، اس میں صرف قوم ہی نہیں بلکہ مذہب کا مسئلہ بھی ورثیش ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لڑکی کے دور یا نزدیک کے رشتہ دار کسی ایسے پیشے سے منسلک ہوں، جنہیں معاشرہ احترام کی نظر سے نہ دیکھتا ہو۔ بہر حال یہ باتیں تو بہت بعد کی ہیں۔ فی الحال تو لڑکی کے اسلام قبول کرنے کا مسئلہ ہے۔“

تم اس بارے میں اس سے پوچھ لو اگر وہ مان گئی تو میں تمہارے بڑے بھائی سے بات کروں گی لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر تم نے سول میرج کر لی تو خاندان اور قبیلے کے لوگ تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے۔“

دوسرے دن مرغوب علی ٹریسا سے ملا تو اس نے اپنے اور بھابی کے درمیان ہونے والی بات چیت ٹریسا کو بتائی اور اسے کہا کہ ”اگر وہ عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لے، تو شاید وہ دونوں زندگی کے سفر میں ساتھ ہی بن سکیں، ورنہ خاندانی رکاوٹیں انہیں کبھی متحد نہ ہونے دیں گی۔“ ٹریسا گھر سے نیت کر کے آئی تھی کہ وہ مرغوب علی کو عیسائی ہونے کے لئے کہے گی۔ اس طرح شادی میں کوئی رکاوٹ وارد نہ ہوگی اور باپ بھی راضی رہے گا۔ مرغوب علی کے معاملات میں کچھ اور بھی پیچیدہ گیاں تھیں۔

اگر وہ اپنے خاندان سے بغاوت کرتا تو وہ اس بے شمار جائداد سے بھی محروم ہو جاتا، جس کے کلیم اب داخل ہونے والے تھے اور مشرقی پنجاب میں چھوڑے ہوئے املاٹوں اور زمین و مکانات کے بدلے میں اسے ملنے والی تھی۔ جس ٹریسا زلیا رام اگرچہ ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن مذہب پر اس کا اپنا ایمان بڑا کمزور تھا۔ اسے صرف اپنی اہمیت تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا معاشی اور معاشرتی مقام بلند ہو جائے۔ جس محبت اور نگاہِ محبت کا اظہار وہ مرغوب علی سے کر رہی تھی، اس کی تہہ میں بھی یہ تمام مقاصد پوشیدہ تھے۔ مرغوب علی کے ساتھ اسے معاشرتی مقام اور معاشی خوش حالی بھی حاصل ہونے کی توقع تھی، اس نے والد کو یہ باور کرا دیا۔ مسٹر زلیا رام کپاؤ غدر کے پاس سوائے نیک نامی کے اور کچھ نہیں تھا۔ لہذا اس نے جلد ہار مان لی۔ اس طرح ٹریسا اسلام قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔

صبح مرغوب علی سیکند بھابی کو ناشتے کی میز پر ملا تو بہت خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ٹریسا نے



اسلام قبول کر کے کوئی بڑی قربانی دی تھی۔ اس نے ساری گفتگو بھابی کو سنائی اور اس کا رد عمل جاننے کی کوشش کی۔

ابھی سیکہ بھابی نے مرغوب علی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سارا خاندان یعنی چوہدری محبوب علی، میجر یعقوب علی، بیگم زبیدہ یعقوب اور محبوب علی کے چاروں بچے ناشتے کی میز پر پہنچ گئے۔ بچے چونکہ چھوٹے تھے، اس لئے ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے۔ اس خاندان میں ناشتے کا اہتمام روایتی انداز میں کیا جاتا تھا، جس میں اکثر خاندان کے تمام افراد شرکت کیا کرتے تھے۔

انسپیکٹر چوہدری محبوب علی نے اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کو کسی معاملے میں سنجیدہ پایا، تو جس کر پوچھا۔ ”آج دیو، بھابی کس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرغوب کے مستقبل کے بارے میں پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ آیا مرغوب کو ہمیں سے مستقل ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے؟ یا پھر کسی خاندان سے رشتے کا پیغام آیا ہے؟ آخر دیو بھابی دونوں اتنے سنجیدہ کیوں ہیں؟“

سیکینہ نے اس پر جواب صادر کیا کہ ”آپ کی تحقیق کرنے کی عادت اتنی لگی ہو گئی ہے کہ آپ گھر کے معاملات میں بھی سوالات کی سلسل بو چھاڑ کر دیتے ہیں۔ بہر حال بات اہم ہی ہے۔ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو گئے تو اطمینان سے اس پر غور کریں گے۔“ میجر یعقوب علی اور اس کی بیگم نے تقریباً بیک آواز ہو کر کہا کہ ”اگر کوئی اہم بات ہے تو پھر انتظار کیسا؟ معاملہ کہہ دیں۔ ناشتہ ہوتا رہے گا اور گفتگو بھی ساتھ چلتی رہے گی۔“

سیکینہ محبوب نے مسکراہٹ کا سہارا لے کر ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ”آپ کے پھوٹے بھائی نے اپنے لئے دلہن کا انتخاب کر لیا ہے اور اب یہ

آپ لوگوں کی رونا مندی کا منتظر ہے۔“ میجر یعقوب علی نے فوراً اعتراض کیا، کہا کہ ”یہ یا بات ہوئی؟ انتخاب خود کر لیا ہے اور اب ہماری رضا بھی پوچھی جا رہی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مرغوب علی ہمیں اپنی پسند کی خیر سانا چاہتا ہے اور ہم سے توقع رکھتا ہے کہ تمام لوگ بغیر دیکھے بھالے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیں گے؟“

انسپیکٹر محبوب علی، جو بات چھڑ کر خود خاموشی سے ناشتے میں مشغول ہو گیا تھا، سر اٹھا کر کہنے لگا کہ ”مرغوب کا کسی خاتون کو پسند کر لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام معاملے میں وہ ہماری رائے کا احترام نہیں کرے گا یا تفتیش و تحقیق کرنے کے حق سے ہمیں دست بردار ہونے کے لئے کہے گا۔ شادی تو اس کی ہوئی ہے اور اس کی پسند، ناپسند کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ کیوں نہ اس کے انتخاب پر سنجیدگی سے غور کر لیا جائے؟“

زبیدہ یعقوب نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ ”آخر وہ محترمہ ہیں کون؟ ہنہوں نے ہمارے دیور کا دل لوٹ لیا ہے۔ اُن کا حدود دار بھہہ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔“

سیکینہ محبوب پھر ہنسنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ناشتے کی میز کا ماحول خوشگوار رکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ بات پوری طرح کھلی، تو شاید گفتگو تلخی کا رنگ اختیار کر لے گی۔ وہ اثناء وقت لینا چاہتی تھی کہ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو جائیں۔ پھر غی اس موضوع کو چھیڑا جائے۔

میجر یعقوب علی نے جب بھابی کو مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ دل میں کچھ کالا ہے۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مرغوب علی نے کوئی بہت بڑا تیر مارا ہے۔ جو آپ غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔ چلو ناشتے کے بعد ہی سہی، ہمیں پتہ بھی تو پڑے کہ آخر معاملہ ہے کیا؟“ سب لوگ چائے کی پیالیاں



مرغوب علی نے جب دیکھا کہ سیکنہ بھابی اب آگے بڑھ کر ذہال بننے کے لئے تیار نہیں تو خود ہی آہستہ آہستہ مس ٹریا سے اپنی محبت، قول و قرار اور اس کی اسلام قبول کرنے پر آمادگی کی ساری کہانی بیان کر دیا اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ ٹریا کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا اور یہ بھی کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے میں اپنے آپ کو آزاد اور حق بجانب سمجھتا ہے۔

چوہدری محبوب علی نے جب اپنے چھوٹے بھائی کی گفتگو سنی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے سخت روحانی صدمہ پہنچا ہے مگر اس نے صرف اسی قدر کہا: ”کیا تم اپنی گرل فرینڈ کو کچھ وقت کے لئے یہاں لا سکتے ہو؟ اگر ممکن ہو تو مجھے اس کے تمام کوائف بھی بتا دو تا کہ میں اس کے پس منظر، حالات اور چال چلن کے متعلق اپنے طور پر تصدیق کروا لوں۔ بہتر ہے کہ اسے آج ہی رات کھانے پر بلوا لوں۔“

اس پروگرام میں سنجیدگی کا عنصر براہمانے کے لئے اس نے اپنی بیگم پر بھی بوجھ ڈالا۔

”بیگم! آج ذرا اپنی باورچی گیری کے پرانے کمالات دکھاؤ، مہمان خاص آ رہا ہے۔“

مرغوب علی، جو ہر حال میں اپنے پروگرام کو مکمل کرنے پر جلا ہوا تھا، مس ٹریا رلیا رام کو اپنے رشتہ داروں سے ملوانے پر راضی ہو گیا اور اُس کا پتہ بھی دے دیا۔

انسپکٹر محبوب علی جلد ہی تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ اس نے وہاں جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ایک ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل اپنے دفتر میں بلائے اور انہیں حکم دیا کہ تحریر کردہ نام اور پتے پر موجود لڑکی کے پورے کوائف شام ہونے سے پہلے اسے مل جائیں۔ اگر اسے کوئی سرپرست بھی موجود ہو تو اس کے متعلق بھی پوری

باتھوں میں لئے ڈرائنگ روم کی طرف ہو گئے۔ محبوب علی جو بظاہر جلدی میں تھا، کہنے لگا۔

”اگرچہ مجھے دفتر جانا ہے کیونکہ آج کئی اہم کیس زیر تفتیش ہیں۔ بہر حال یہ معاملہ بھی اہم معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیلات کا ادراک بھی ضروری ہے، ورنہ دن بھر کام میں یکسوئی میسر نہیں آئے گی، دھیان اسی طرف لگا رہے گا۔“

دوسرے دن میں لئے سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ زبیدہ مرکز نگاہ تھی، مگر دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ کب سے آس لگائے بیٹھی تھی کہ مرغوب تعلیم ختم کر لے تو وہ اپنی خالہ زاد بہن سلٹی کے رشتے کی بات چلائے۔ سلٹی اور مرغوب کا جوڑ کتنا اچھا ہوتا۔ کیا لڑکی ہے سلٹی، بی اے تک تعلیم، زمانہ حسن میں یکتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سکھڑ، خالہ نے اس کی تربیت میں کتنی محنت کی تھی۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زمانہ دستکاری سکول میں بھی پڑھایا اور سلائی کڑھائی سکھلائی تھی۔ طرح طرح کے کھانے اُس کے ہاتھ سے پکوائی رہیں۔ میں بھی کتنی کوڑھ مخزن ہوں کہ خاموش انتظار کرتی رہی۔ قبل از وقت بات نہ چلائی مگر کیا خبر تھی؟ کہ کوئی ذائقہ مرغوب کو یوں اچانک اُچک لے گی۔

نشستوں پر بیٹھے ہی محبوب علی نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بیگم! کیا بات ہے، ذرا جلدی سے بتاؤ تا کہ دفتر جانے میں تاخیر نہ ہو۔ ابھی مجھے وردی بھی پہننا ہے۔“

بیگم محبوب پھر ہنسنے لگی اور مرغوب کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”ہاں بھئی! کہو، میں نے تو بات چلا دی ہے۔“

مرغوب علی نے سر جھکا لیا، جیسے وہ شرمسار رہا ہو۔ میجر یعقوب علی نے خاموشی کی فضا توڑتے ہوئے کہا۔

”مرغوب! عشق بازی میں نہیں شرمائے اور اب جبکہ اس عشق کی تکمیل کا موقع آیا ہے تو اس انداز کا کیا فائدہ؟“

READING  
Section



تحقیق کر لیں۔

مبصر یعقوب علی اور بیگم یعقوب آٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بیگم چھوٹے بچوں کو جگا کر انہیں ناشتہ کرانے اور کپڑے پہنانے لگی جبکہ مبصر تیار ہو کر چھاؤنی چلا گیا تاکہ جی ایچ کیو میں فون کر کے یہ پتہ کر سکے کہ رخصت کے خاتمے پر اسے کہاں حاضر ہونا ہے؟ بیگم محبوب نے بچوں کو تیار کر کے سکولوں کی طرف روانہ کیا اور اپنے دن بھر کے کام میں مصروف ہو گئی۔

مرغوب نے سائیکل پکڑی اور اخبار کے دفتر کی طرف چل دیا۔ وہ راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ خدا جانے خاندان کے لوگ اب کیا رویہ اختیار کریں گے؟ اگر انہوں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ مگر وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ٹریا کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ وہ خاندان والوں سے تعلقات منقطع کرے گا مگر ٹریا سے نہیں۔ اگر مناسب ہو تو شہر بھی چھوڑ دے گا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ خاندان کے لوگ مستقل طور پر ناراض نہیں رہ سکتے۔ چند سال گزر جائیں گے تو وقت کا مرہم سب کے زخم بھر دے گا۔ تب یہ بھی ممکن ہو گا کہ یہ لوگ ٹریا کو اپنے خاندان کے فرد کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ اسی ادھیڑ میں وہ دفتر پہنچا۔ جاتے ہی اس نے وسیع القلمی کے حق میں اور خاندانی تعصب کے خلاف ایک بھرپور کالم لکھا اور اسے فخر سے دیکھنے لگا۔

اتنے میں مس ٹریا بھی اخبار کے دفتر میں پہنچ گئی۔ اس نے پہلے تو کالم پڑھا، جو ضروری نظر عانی کے بعد کاتب کو جا رہا تھا اور پھر مرغوب علی سے کہنے لگی۔ ”اگر وقت ہو تو آؤ، باہر کسی خوشگوار جگہ چل کر بیٹھیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

کالم کی کاپی کاتب کو گئی تو مرغوب علی ایڈیٹر سے بات کی۔ ”تو کیسی بھاری کاتب کو گئی تو مرغوب علی ایڈیٹر سے بات کی۔“

آہستہ آہستہ مال روڈ پارکر کے اکہلی ہال کے لان میں جا بیٹھا۔

دونوں ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ ٹریا نے روانہ شروع کر دیا۔ مرغوب علی بجائے اس کے کہ اپنی بات شروع کرے، جس کے سنانے کے لئے وہ بہت بے تاب تھا۔ ٹریا کی بے وقت اور اچانک آمد و زادی سے پریشان ہو گیا۔ پیار سے بولا۔ ”ٹریا! کیا کر رہی ہو؟ حوصلہ کرو اور مجھے بتاؤ کہ تمہاری یوں بڑھتی ہوئی پریشانی کا سا جوا کیا ہے؟“

ٹریا نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے اور بدستور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح ناشتے کی میز پر ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے رنگ محل مشن ہائی سکول کے ایک بچہ کے ساتھ میرا رشتہ بنے کر رہا ہے اور اس سلسلے میں پادری عرفان نے ان کی بہت مدد کی ہے۔“ (پادری عرفان رنگ محل مشن ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، جنہوں نے پاکستان بننے کے چار پانچ سال بعد یونگ ہال سے چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی تھی) بات سن کر مرغوب علی سنانے میں آ گیا۔

ٹریا جو ابھی تک سسکیاں بھرے جا رہی تھی، مزید بولی۔ ”میں نے ڈیڈی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور اپنی مرضی سے مرغوب علی کے ساتھ شادی کر رہی ہوں۔ اس پر ڈیڈی کہنے لگے کہ بیٹی! جب تم صرف پانچ برس کی تھیں تو تمہاری ماں مر گئیں۔ میرا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ یہی مشن اور اس کے کارکن میرے رشتہ دار ہیں۔ امریکن پادری اور مقامی عیسائی حلقوں میں میرا بہت بھرم ہے۔ میں چاہتا تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا، مگر میں نے تمہاری خاطر ایسا نہ کیا اور تمام زندگی اسی خیال میں گزار دی کہ بیٹی جوان ہو کر کسی بہتر گھرانے میں آباد ہو جائے، میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے یہ انتظام کر لیا ہے

READING  
Section



ذرائع سے معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ البتہ ضرور کہا گیا کہ محترمہ کا تعارف اپنے خاندان سے کردادوں میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس ضمن میں تم سے وقت کا تعین کروں گا۔ کیا تم آج رات کے کھانے پر ہمارے ہاں آ سکتی ہو؟“

ٹریسا جو بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی، کہنے لگی۔ ”مجھے تم جہاں چاہو، لے جا سکتے ہو۔ کیوں کہ مجھے اب گمراہی کا راستہ نظر نہیں آتا۔ اچھا ہونا کہ تم عیسائی ہو جاتے، خواہ وقتی طور پر ہی کسی۔ ہم ملک سے باہر چلے جاتے، پھر تم اپنی مرضی کرتے۔“

مرغوب علی نے جواباً کہا۔ ”نہ میں کوئی مذہب آدمی ہوں، نہ ہی تم۔ تم رسمی طور پر اس لئے عیسائی ہو کہ تمہارے والد عیسائی ہیں اور وہ اس لئے عیسائی ہیں کہ ان کی ماں نے انہیں بچپن ہی میں مشن کے حوالے کر دیا تھا۔ در نہ وہ کیا ہوتے؟ کوئی نہیں جانتا، راما کی یا کچھ اور؟ میں اس لئے مسلمان ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوا۔ میرا ایک خاندان ہے، میری جائداد ہے۔ معاشرتی مقام ہے۔ میں اس مقام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تم مجھے خواہ مخواہ ایک ایسی صورت قبول کرنے کے لئے کہہ رہی ہے، جس میں ہم اپنی معاشرتی حیثیت بالکل کھو دیں گے۔ ہم پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تم اسلام قبول کر لو گی۔ اب محض اپنے والد کی خودکشی کرنے کی خالی خولی دھمکی سے متاثر ہو کر تم اپنا فیصلہ بدل رہی ہو۔ ایسا نہ کرو اور آگے بڑھو، آج رات کا کھانا ہمارا جیون سنوار سکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم تمام لوگوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔“

ٹریسا نے بے چہن ہو کر پوچھا۔ ”اگر ہم ان کا تعاون حاصل نہ کر سکے تو پھر کیا ہوگا؟“

مرغوب علی نے اعتماد جمع کرتے ہوئے معاملہ سلجھایا۔ ”اس صورت میں ہم دونوں آزاد ہوں گے نہ اسلام قبول کر دو گی اور ہم نکاح کر لیں گے۔ اگر تم اتفاق کر

تہماری شادی ہو جائے اور میں تم دونوں میاں بیوی کو امریکہ بھجوادوں تاکہ تم دونوں وہاں سے پی ایچ ڈی کر لو۔ جی چاہے تو واپس آنا ورنہ وہیں بس جاتا۔ میں نے جب سمجھا کہ ڈیڈی کی طور بھی میرے اور تمہارے اتحاد پر راضی نہ ہوں گے، تو میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جو بھی چاہیں کر لیں، میں جو پروگرام بنا چکی ہوں، اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا، خواہ کچھ بھی ہو میں مرغوب علی کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

اس پروڈی کی کہنے لگے کہ تم مرغوب علی سے ایک بار پھر یہ کہہ کر دیکھ لو کہ وہ عیسائی ہو جائے تو میں مشن والوں کو کہہ کر تم دونوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھجوادوں گا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے امید نہیں کہ مرغوب ایسا کر سکے گا۔ ڈیڈی نے کہا کہ پھر تیسری صورت یہی ہے کہ تم اپنی مرضی کرو اور میں خودکشی کر لوں۔ یہ کہہ کر ڈیڈی رونے لگے اور میں بھی روتی ہوئی تمہاری طرف نکل آئی۔ ”ہائے ڈیڈی آپ کتنے اچھے ہیں مگر کتنے ضدی۔“

مرغوب علی نے بات سنی تو محل سے گویا ہوا۔ ”اسی مشکلات تو بہر حال ہوں گی۔ خودکشی کوئی نہیں کرتا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں، یا ذرا نہ کا حربہ، وقت کا مرہم سب زخم بھر دیتا ہے۔ جو باتیں بظاہر ناقابل برواشت معلوم ہوتی ہیں، جب حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں تو سب انہیں برواشت کر لیتے ہیں۔“ مرغوب علی نے تھوڑا سا توقف کیا پھر بولا۔ ”اب میں تمہیں بتاؤں کہ میرے راتھ کیا گزری۔ میں نے جب اپنا سارا پروگرام اور تمہارے مسلمان ہو جانے پر رضامندی کے متعلق اپنے خاندان والوں کو بتایا تو انہوں نے اپنے چہروں سے کسی بھی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ یوں لگا، جیسے یہ سب لوگ پتھر کے بت ہو گئے ہوں اور ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو چکے ہوں۔ صرف بڑے بھائی جان نے چہرہ پر اپنے متعلق اپنے خفیہ



لوتے آج شام ریڈ پوشیشن سے میں تمہیں سیدھا اپنے گھر لے چلوں؟“

ثریا کچھ اور پریشان ہو گئی۔ ”مجھے تمہارا یہ پروگرام اچھا نہیں لگا۔ یقین ہے کہ جب میں تمہارے خاندان والوں سے شادی سے پہلے یوں ملوں گی تو وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میرے منہ پر ہی میری مخالفت کا اظہار کریں اور میری بے عزتی بھی کر دیں لیکن تمہارے ساتھ میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہوں کہ اب ہر قسم کے حالات برداشت کرنا پڑیں گے۔ تم جو بھی کہو گے میں کر لوں گی، جہاں لے جاؤ گے چلی جاؤں گی۔“

مرغوب علی نے جواباً سے باور کرایا۔ ”ہمارے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ کسی کو اپنے گھر بلا کر اس کی بے عزتی کی جائے۔ ہاں، اگر وہ لوگ نہیں بطور میاں بیوی دیکھنا پسند نہیں کریں گے تو جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں مختار ہیں۔ اگر تم اپنے والد سے بغاوت کر سکتی ہو تو مجھے بھی اپنے بھائیوں سے بغاوت کرنے اور انہیں کچھ وقت کے لئے چھوڑ دینے میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ایسی ناراضگیاں دیر پا نہیں ہوتیں۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ خاندانی راویات، بلاوجہ تفاخر اور ذات پات کا غرور زیادہ دیر تک قائم رہنا مشکل ہیں۔“

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ شام دونوں ریڈ پوشیشن سے انسپکٹر محبوب علی کے دولت خانے پر تعارف اور کھانے کے لئے اکٹھے جائیں گے، وہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ مرغوب علی والٹن کیمپ میں رضا کارانہ خدمات سرانجام دینے چلا گیا اور ثریا ریڈ پوشیشن پروڈن کے پروگرام میں ڈاؤن لوڈ کے لئے روانہ ہو گئی۔

کوئی دس بجے کے قریب بیگم زبیدہ یعقوب اور بیگم سکندر محبوب تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئیں

باورچی دن بھر کی ضرورت کا سامان خریدنا تھا، جس میں دوپہر کے سادہ لंच اور رات کے پُر تکلف کھانے کی تیاری کی ساری اشیاء شامل تھیں۔ بیگم سکندر محبوب نے سامان کا سرسری جائزہ لیا اور نوکرائی کو مناسب ہدایات دے کر ساری اشیاء اس کے حوالے کر دیں۔ دونوں دیورانی، جیٹھانی وقت نکال کر گپ شپ میں مشغول ہو گئیں۔

زبیدہ یعقوب نے کہا۔ ”سکندر بہن! ہمارے خاندان میں پہلے اس روایت کی بڑی پابندی تھی کہ نہ تو باہر سے رشتہ لیا جائے اور نہ ہی دیا جائے ایک محاورہ مشہور تھا کہ اگر شیر بن کر جینا چاہے ہو تو گجری کا دودھ پیو۔ ہمارے بزرگ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم نے گجری کا دودھ پیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کاغزہ کے راجہ نے بغاوت کی تو متعل فوج کا پلہ دبے لگا تھا۔ معلوم کی فوج میں گجروں کا دستہ بھی شامل تھا۔ اس وقت کسی نے غرہ لگایا کہ آج گجری کے دودھ کی آزمائش کا وقت ہے۔ یہ لکار سنتے ہی گجروں کے مختصر دستے نے اس زور سے یلغار کی کہ ڈوگرہ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔“

بہن! جب آپ کی شادی بھائی محبوب سے ہوئی، اس وقت میں اس گھر میں نہیں آئی تھی مگر قرابت داری کی وجہ سے مجھے سب حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ برادری میں بڑا طوفان اٹھا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر محبوب بھائی نے یہ شادی کر لی تو انہیں برادری سے باہر کر دیا جائے گا۔ مگر کسی نے یہ کہہ کر پانسہ پلٹ دیا کہ ان لڑائیوں کے ساتھ ہم مدت سے بڑے رہے ہیں۔ اگر وہ اب رشتہ دے کر ہار ماننا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہے؟ یہ دلیل خواہ جذباتی بے معنی اور خلاف واقعہ ہی تھی، کام کر گئی اور ہر کوئی اس رشتے پر راضی ہو گیا مگر اب جو مرغوب اس خاندان میں کرنی کا بیونہ لگا رہا ہے اسے کون پروا دے گا؟“

سکندر محبوب خاموشی سے بات سن رہی تھی۔ اسے

READING  
Section



سوچ رہی تھی کہ اُسے بیاہ لائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

سیکنڈ جواب تک صرف سنے جا رہی تھی، کہنے لگی۔  
”رہیدہ! تم اپنے خاندان والوں کی ضد سے تو واقف ہو۔  
میں چاہتی ہوں کہ کسی طرح موجودہ معاملہ خوش اسلوبی  
سے سلجھ جائے اور اب کوئی بھی بلا جواز ضد نہ کرے۔  
جہاں تک سٹیلی کا تعلق ہے تو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ  
سٹے کرائی۔ اگر مرغوب علی کی منگنی ہو چکی ہوئی تو شاید وہ  
ٹریسا کے جال میں نہ پھنستا۔“

انسپیکٹر جوہدری محبوب علی اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دو  
سپاہیوں کو مس ٹریسا کے حالات کے متعلق کھوج لگانے  
کے لئے بھیج کر اپنے معمول کے کام کاج میں مصروف ہو  
گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی اسے قریبی ریسٹوران سے منگواتا  
پڑا۔ کوئی تین بجے کے قریب اُس کے تینوں اہلکار واپس  
آئے اور اسے بتایا۔ ”مسٹر زلیا رام کہاؤ نذر ایک شریف  
اور محنتی آدمی ہے۔ اس کا اس شہر میں کوئی رشتہ دار نہیں  
ہے۔ ٹریسا اُس کی اکلوتی لڑکی ہے۔ لڑکی کی ماں اُس کے  
بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی، اس لئے ٹریسا کی صحیح تربیت  
نہیں ہو سکی۔ وہ بہت زیادہ آزاد خیال اور ضدی ہو گئی  
ہے۔ اگرچہ اس کے چال چلن میں کسی برائی کا علم نہیں ہو  
سکا لیکن اس کی آزاد خیالی اور نوجوانوں کے ساتھ  
آزادانہ میل جول پر لوگ بالعموم حرف گیری کرتے ہیں۔  
مسٹر زلیا رام کے باپ کو کوئی نہیں جانتا، مگر اس کی ماں  
رامہ اسی ہندو تھی اور اپنے مذہب ہی پر مری۔ زلیا رام کو  
مشن والوں نے پالا اور اُسے عیسائی بنالیا۔ اب وہ عیسائی  
برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ اس کا جرائم پیشہ لوگوں  
کے کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں پایا گیا، تاہم اگر افسران  
بالا کی خواہش ہو تو اسے رات کو تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ  
کی جاسکتی ہے تاکہ وہ خود ہی بول پڑے۔“

آخری جملوں پر انسپیکٹر محبوب علی ہنسے بغیر نہ رہ سکا

رہیدہ یعقوب کی بات، جس میں اراچیوں کو بچا دکھانے  
والی اعلیٰ کا ذکر تھا، بالکل انہی نہ لگی تھی، مگر محض اس لئے  
چپ ہو گئی کہ رہیدہ یعقوب مہمان تھی۔ اگر اس نے اس  
کی بے معنی گفتگو کو نظر انداز نہ کیا تو اس کی دل شکنی ہوگی۔  
وہ ایسے بھی وہ جب سے اس خاندان میں آئی تھی، یہ بات  
کئی دفعہ سن چکی تھی۔

دوسرا سوال جو رہیدہ یعقوب نے اٹھایا تھا۔ وہ  
بہت اہم تھا۔ اسے مرغوب علی سے بہت ہمدردی تھی۔  
بڑی بھالی ہونے کے باطنی وہ اپنے آپ کو خاندان کا  
سربراہ بھی سمجھتی تھی۔ دس بارہ سال سے اس خاندان میں  
فریض نبھا رہی تھی۔ اسے خاندان کی روایات کا علم تھا  
اور احترام بھی۔ دوسری طرف وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ  
مرغوب علی ٹریسا کی محبت میں بہت آگے بڑھ چکا تھا۔  
اسے باز رکھنا اتنا آسان نہ تھا، جتنا برادری سمجھ رہی تھی۔

اسے وہ وقت یاد آ گیا، جب محبوب علی اُس کے  
علاقے میں بطور تھانیدار تعینات ہوا تھا۔ گھر میں اس کا  
تعارف بھائیوں کی وجہ سے ہوا تھا، پھر اس کا وہاں آنا جانا  
ہوا۔ ایک دن اتفاق سے وہ اس کے سامنے بھی آ گیا۔  
اس دم دونوں نے دلوں میں نہ جانے کیا کیا محسوس کیا۔  
پھر محبوب علی کا آنا جانا بڑھ گیا۔ بھانے بھانے سے تحفے  
تحائف بھی آنے لگے۔ وہ کبھی دوبارہ اس کے سامنے نہ  
آئی۔ مگر اسے کسی نہ کسی طرح علم ہوتا ہوا کہ محبوب علی نے  
مختلف ذرائع سے رشتے کی بات چلا دی ہے۔ ہر ایک  
نے اسے بالکل پن قرار دیا مگر جو اللہ کا لکھا تھا، وہ ہوتے  
رہا۔

سیکنڈ محبوب انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ  
رہیدہ یعقوب نے دوبارہ اسے مخاطب کر لیا۔ ”سیکنڈ  
بھن! مرغوب علی کا معاملہ خاندان کے لئے بڑا خطرناک  
ہے۔ اسے خاندان میں لڑکیوں کی کیا کی تھی؟ میری خالہ  
زادہ بہن سٹیلی کیا موزوں نہیں تھی؟ میں بڑی مدت سے



حفاظت امن اور سلامتی کے لئے بے پناہ امکانات مہیا کئے ہیں، وہاں معاشی ترقی کے بھی بے شمار سامان بخشنے ہیں۔ خدا کے فضل سے میری ترقی بطور لیفٹیننٹ کرنل ہو رہی ہے اور میرا تقرر بھی ایچ کیو کی اسے جی برانچ میں دارالحکومت کراچی کر دیا گیا ہے۔ بس اب ایک دو روز میں جو نئی ریل گاڑی میں نشست مل جاتی ہے، چلا جاؤں گا۔ زبیدہ اور بچے فی الحال آپ کے پاس رہیں گے۔ وہاں جا کر مکان کے حصول کی کوشش کروں گا۔ جیسے ہی مکان مل گیا، زبیدہ اور بچوں بھی وہاں بلوا لوں گا۔

تمام لوگ یعقوب علی کی ترقی کے امکان پر بہت خوش ہوئے۔ گھر میں اچھل سی مچ گئی۔ سیکٹ نے کہا: ”چلے، ایک بہانہ مل گیا۔ میں ٹریڈ کو براہ راست یہ کہنے کی بجائے کہ ہم لوگوں نے تمہیں پسند یا ناپسند کرنے کے لئے بلایا ہے، یہ کہیں گے کہ مرغوب علی سے تمہاری راہداری میں شامل کر کے اپنے خاندان کی خوشیوں میں شریک کیا گیا ہے۔ یہ بات زیادہ ڈھب کی معلوم ہوتی ہے۔“

میجر یعقوب علی نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا: ”ہاں، یہ بات ٹھیک ہے، مگر ٹریڈ بھی جانتی ہے کہ اسے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟ اور غالباً ایسی خاتون کے لئے، جو اپنے آپ کو ایسے حالات میں ڈھال لے کہ خود چل کر ایک انجمنی خاندان میں آجائے اور بظاہر ناگوار صورت قبول کر لے، ایسے بہانے بیکار ہیں۔ وہ بہکا دے میں نہیں آئے گی۔“

انسپکٹر محبوب علی کہنے لگا: ”ہنچموں کو بازار میں بھیجنے سے پہلے ان پر سے مٹی دھو لی جاتی ہے، ورنہ سب جانتے ہیں کہ فلیم زمین کے اندر پردان چڑھتے ہیں۔“

زبیدہ یعقوب کو مس ٹریڈ کا مرغوب علی سے میل جول بڑھانا اور پھر خاندان کی دعوت میں شریک ہو جانا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ ابھی تک وہ اس ناگوار

اور کہنے لگا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے جس قدر معلومات درکار تھیں، وہ مل گئیں۔ اس تفتیش کی باقاعدہ فائل نہ کھولی جائے۔ یہ کہہ کر وہ گھر کو روانہ ہو گیا۔

میجر یعقوب علی نے کراچی آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ٹیلیفون کیا تو اسے حکم ملا کہ وہ پہلی گاڑی پر کراچی پہنچ جائے۔ اس کی تقرری جی ایچ کیو کی اسے جی برانچ میں کر دی گئی ہے۔ اس کے بطور لیفٹیننٹ کرنل پروموشن کا نوٹیفکیشن بھی ایک آدھ دن میں ہونے والا ہے۔ یعقوب علی یہ خوشخبری سنانے سے تابا نہ گھر پہنچ گیا۔

شام چار بجے تک انسپکٹر محبوب علی، میجر یعقوب علی اور گھر کے دیگر افراد ڈرائنگ روم میں جمع تھے اور اپنی اپنی دن کی کارگزاری بیان کر سنے کے لئے تیار تھے۔ مرغوب علی کے باعث حالات میں کچھ تناؤ پیدا ہو چکا تھا گو گھر داری کے عمومی مسائل حسب معمول تھے۔ باورچی خاصانہ سے پلاؤ، کبابوں اور روست کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی۔ اب مرغوب علی کا انتظار تھا، جس کی واپسی شام نو بجے سے پہلے متوقع نہ تھی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زبیدہ یعقوب نے ایک دفعہ پھر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اپنی خاندانی روایات اور سسٹمی کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ انسپکٹر محبوب علی نے سب کچھ سن کر حائل سے کہا: ”آج کی رات گزر جائے دیں۔ اب مرغوب علی کو آہستہ آہستہ ہی راہ پر لایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی دھن کا بہت پکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جلد بازی کر کے کچھ نقصان کر لیں۔“ یہ کہہ کر کچھ بات کا رخ بد لئے اور بنیاد طور پر یعقوب علی اور زبیدہ یعقوب کا پروگرام جاسنے کے لئے اس نے میجر یعقوب علی سے سوال کیا کہ اسے کراچی سے کیا جواب ملا ہے؟ یعقوب علی، جو پہلے ہی سے اپنے پروموشن اور نئی پوسٹنگ کی خوشخبری سنانے کے لئے بے تاب تھا، کہنے لگا:

”بھائی جان! پاکستان کے قیام سے جہاں ہمیں

READING  
Section



R-TM 121987

MASTER

# گاسٹر

## موٹر سائیکل پیسی



ذیب ویل پیپ

مونوبلاک پیپ

ٹوکی پیپ

کلاسک س آبد

جی۔ ٹی روڈ گوجرانوالہ

055 3252468  
055-3483695

مہمان بنی طور پر بھی قابو نہ پاسکی تھی، پھر بولی پڑی۔ اس بار اس کا مخاطب انسپکٹر محبوب علی تھا۔ کہنے لگی۔ ”بھائی جان! آپ نے کل اس کرنی کے متعلق تحقیقات کر سنے سنے لئے کہا تھا، کیا اس تحقیقات کا کوئی نتیجہ نکلا۔ محبوب علی نے جواب دیا۔

”ہاں، مجھے سب معلومات مل چکی ہیں۔ لڑکی تعلیم یافتہ تو ہے ہی، اس کا چال چلن بھی داغ دار نہیں مگر بات جہاں بٹھکتی ہے وہ اس کا خاندانی پس منظر ہے جو میرے اندازے کے مطابق ہی نکلا لیکن جس مقام پر مرغوب پہنچ چکا ہے وہ اس فارسی شعر کے مصداق ہے کہ اس راستے میں فلاں، ابن فلاں کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا (کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیز ہے نیست)“

منیجر یعقوب جواب اپنے آپ کو پھینٹ کر مل ہی سمجھے ہوئے تھا۔ بات کا رخ بدلتے کے لئے کہنے لگا۔ ”بھائی جان! ہندو افسران کے چلے جانے کے بعد آپ نے مجھے میں بھی بہت سی آسامیاں نکلی ہوں گی۔ آپ کے پردھوشن کی توقع کب تک ہے؟“

انسپکٹر محبوب علی نے اپنے فطرتی دھیمے پن کے مطابق زندگی سب جواب دیا۔ ”اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے مزین فرمایا ہے تو اس کی بے شہرہ برکتوں کا نزول بھی ہو رہا ہے۔ میرے ڈی اے این پی ہونے کے کاغذات تقسیم سے قبل ہی چل پڑے تھے۔ تقسیم کے بنگالے نے بہت سے کام ٹھپ کر دیے اور پولیس کے کام میں اچانک بہت برا اضافہ ہو گیا۔ اب متوقع ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں وائس کمشنر، ڈائریکٹر ان شاء اللہ تعالیٰ احکام صادر ہو جائیں گے۔“

نو بجنے میں ابھی پانچ دیں منٹ باقی تھے کہ باہر تاگر رکنے کی آواز آئی اور چند خوں میں مرغوب ملی ٹریڈ کو ساتھ لئے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ سب لوگ ٹریڈ نے احترام میں رہا کھڑے ہو گئے۔ سیکرٹری محبوب اور

READING  
Section



ضروری سمجھا۔ میجر یعقوب علی نے ساتھ کے ساتھ ہمد کسنا۔

”بھائی! بھائی جان ڈی ایس پی ہو رہے ہیں، یہ بات بھی تو کریں۔“

محبوب کہنے لگا۔ ”بھائی! جو خوشی پھوٹے بھائیوں کی ہوتی ہے اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ والد مرحوم تو سب توقعات دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے حصے کی خوشیاں بھی میری قسمت ہی میں لکھی تھیں۔“

کھانے کی میز پر صرف کھانوں کی لذت، بھائی سیکر کے سلیقے اور محبوب بھائی کی دانش مندی ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جائیداد کے کلیم، مکانوں اور زمینوں کی عارضی الاٹمنٹ وغیرہ کا ذکر بھی کسی نہ کسی طرح درمیان میں آ گیا۔ میجر یعقوب علی کے کراچی آبادی کے خاندان کو دوبارہ دو مختلف مقامات پر تقسیم کر دیا تھا۔ یہ ذکر بھی ہوا اب یہ بھی خطرہ تھا کہ ان کے خاندان کی تقسیم مسئلہ ہی نہ ہو جائے۔

ٹریسا کھانے کے دوران خاموش رہی۔ گھر کا ہر فرد بار بار اس کے سامنے کوئی نہ کوئی چیز رکھتا۔ ماحول کو کسی حد تک بے تکلف بنانے کی کوشش کرتا مگر ٹریسا نہ تو بے تکلف ہوتی اور نہ ہی اس نے جی بھر کر کھانا کھایا۔ بس میز پر ٹنڈی ایک فرض ادا کرتی رہتی۔ زبیدہ یعقوب نے است و د ایک دفعہ چھیننے کی کوشش بھی کی مگر ٹریسا نے اسے ناگواری سے مسکراتے دیا۔

کھانا ختم ہوا تو ٹریسا نے گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انسپکٹر محبوب علی نے اصرار کیا۔ ”تموڑی دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں، اس دوران چائے کی پیالی پی لیں، میں اردنی سے ٹانگ لائے کے لئے کہتا ہوں۔ مرغوب آپ کو چھوڑ آئے گا۔ رات کو اکیلے جانا مناسب نہیں۔“

ٹریسا نے بظاہر رنج بولا کہ مجھے رات کے کھانے پر

زبیدہ یعقوب نے آگے بڑھ کر مہمان سے ہاتھ ملائے۔ سیکر محبوب کے رویے سے گرجوٹی اور تپاک کا اظہار ہوتا تھا مگر زبیدہ کے چہرے پر بدستور ناگواری کی علامات نمایاں تھیں۔ غالباً وہ کوشش کے باوجود بھی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ دوسری طرف انسپکٹر محبوب علی نے ”خدا خوش رکھے، جیتی رہو“ کے دعائیہ کلمات ادا کئے، یوں اس غیر معمولی ملاقات کے ابتدائی مراحل کسی نہ کسی طرح طے ہوئے۔

ٹریسا پریشان تو تھی ہی مگر ہمت کر کے چلی آئی تھی۔ اب جو انجینی لوگوں سے یوں آنا سامنا ہوا تو اس کی پریشانی میں گھبراہٹ کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یونیورسٹی یا کالج میں ہم سبق لڑکوں سے ملنا اور ان سے گفتگو کرنا، ان کی سبے باک نگاہوں کا سامنا کرنا اور بے ہتھم جملوں کا برداشت کرنا اس صورت حال سے قطعاً مختلف تھا، جو اب پیش آئی تھی۔ بہر حال سیکر محبوب اور انسپکٹر محبوب علی کے مشفقانہ رویے نے اس کی مدد کی اور وہ جوں توں اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی، ورنہ ممکن تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ گھبراہٹ میں مرغوب علی کو یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ ٹریسا کا فرداً فرداً خاندان کے افراد سے تعارف کراتا۔ اب ذرا سکون ہوا تو اس نے اپنی بھابیوں اور بھائیوں کے نام پہلے پہلے کر ٹریسا سے انہیں متعارف کروایا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرغوب ٹریسا سے اپنے خاندان کے افراد کا اس تکرار سے تذکرہ کر چکا تھا کہ اس کی تعارف کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔

تعارف ختم ہوا تو سب لوگ خاموش کھڑے رہ گئے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہا جائے۔ اچانک سیکر محبوب نے ماحول کی سنجیدگی کو توڑا اور بولی۔ ”مس ٹریسا! آپ کے متعلق مرغوب بہت کچھ بتا چکا ہے۔ آج ہی میجر یعقوب علی کے متوقع پروموشن کی خبر آئی تو ہم نے آپ کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا



پائے کی عادت نہیں۔ تانگے کا انتظار بہر حال لازمی ہے۔

ملاقات کے آخر میں سب نے ٹریا کی حتی الوسع دلجوئی کی۔ اس کے آنے کا شکریہ ادا کیا لیکن کسی نے اشارہ بھی اس کے مستقبل کے متعلق نہ کیا۔ سوائے زبیدہ یعقوب کے، جس کی گفتگو میں مزاح کی بجائے استہزا کی کاٹ تھی۔ وہ وقفے وقفے سے جھلکتی رہی لیکن اس خاندان کی اٹھان کچھ ایسی تھی کہ کسی نے بھی نہ تو زبیدہ کے فقرات پر اور نہ ہی ٹریا کی خاموشی پر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار کیا۔

تانگہ آیا تو مس ٹریا نے سب سے شب بخیر اور الوداع کے رسمی کلمات کہے، خواتین سے ہاتھ ملائے، میجر یعقوب علی اور انسپٹر محبوب علی کو سلام کیا اور خاموشی سے جس طرح آئی تھی، اسی طرح باہر نکل گئی۔ مرغوب علی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا باہر کا گیٹ پار کر گیا۔ ابھی مرغوب اور ٹریا تانگے میں بیٹھے نہیں تھے کہ زبیدہ یعقوب نے اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر ہانک لگائی۔ "کالی میم! بے شرم کیسی کہیں کی رات کو غیر مردوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔" زبیدہ نے نادانستہ یہ جملے اتنی اونچی آواز میں کہے کہ ٹریا اور مرغوب علی نے صاف صاف سن لئے، مگر تانگے والے کی موجودگی کے پیش نظر دونوں خاموش رہے اور کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ تانگے میں بیٹھ کر بھی دونوں نے کوئی بات نہ کی، حالات اور شرافت کا تقاضا یہی تھا۔

گھر کے افراد انسپٹر چوہدری محبوب علی پیچھے پیچھے واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ سیکرٹری محبوب نے ہاتھ پیار سے بات شروع کی۔ "زبیدہ! ہمیں اذرا تانگہ چل تو لینے دیتیں۔ پھر جو چاہے کہہ لیتیں۔" اس معاملے میں سبے جذبات آپ سے قطعاً مختلف نہیں مگر مہمان نوازی و مرغوب علی کے جذبات کے پیش نظر ظاہر داری

سے کام لیتا پڑتا ہے۔

زبیدہ یعقوب ابھی تک شدت جذبات کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے ٹریا بالکل اچھی نہ لگی تھی اور رات ہی اس کا غیر مرد کے ساتھ اس طرح تنہا سفر کرنا بہت ہی معیوب معلوم ہوا تھا، اب سیکرٹری محبوب نے اسے ٹوکا تو وہ مزید رنجیدہ ہو گئی، پھٹ پڑی۔

"بھن! ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ گہری کا دودھ بچوں کو شیر کی طاقت اور جرأت عطا کرتا ہے اور اب نہ جانے اس خاندان کی آئندہ نسلوں کو کس کس کا دودھ پینا پڑے گا اور کس کس کا خون اس خاندان میں شامل ہو گا۔" وہ جوش جذبات میں یہ بھی بھول گئی کہ اس کی جیٹھائی بھی، جس سے وہ بات کر رہی ہے، اس خاندان میں باہر سے آئی تھی۔ سیکرٹری کو ظاہر ہے، زبیدہ کی گفتگو کا یہ انداز پسند نہ آیا مگر وہ بڑی مستحکم مزاج اور مدبر خاتون تھی، زور سے ہنسی اور نہایت خوشنودار لہجے میں گویا ہوئی۔

"زبیدہ! بھن! کاش تمہیں یہ مقولہ یاد رہتا اور تم بھی اپنے بچوں کو ذہنی کا دودھ نہ پلاؤ۔"

انسپٹر محبوب علی نے یہ محسوس کر لیا کہ گفتگو تلخی کا رخ اختیار کر سکتی ہے، اس لئے اس نے ایسا انداز اختیار کیا کہ لگا جیسے اسے بہت غینہ آ رہی ہے۔ کہا کہ اب غینہ کا غلابہ ہو رہا ہے، لہذا مجلس برخاست۔ سب لوگ بادل ننواستہ، اٹھ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

مرغوب علی نے ٹریا کو اس کے گھر کے سامنے اتارا اور اسی تانگے میں واپس چل پڑا۔ دونوں میں سے اب کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ صبح دوبارہ ملاقات ہوگی لیونک ان کی ملاقاتیں روزانہ کا معمول بن چکی تھیں۔

ٹریا گھر میں داخل ہوئی تو اس کا باپ اگرچہ جاگ رہا تھا مگر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بوڑھا کہاؤنڈر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ حد سے بڑے ہوئے لادچار نے ٹریا کو اس حد تک خود سر کر دیا تھا۔

READING  
Section



سب اس کی اصلاحات ممکن نہ تھیں۔ وہ اپنے آپ کو قصور وار سمجھتا تھا کہ تربیت کا حق ادا نہ کر سکا تھا اور اب بڑھا پے میں۔ اپنی غفلت کی سزا بھگت رہا تھا۔

نرپا سید مہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زبیدہ کے جملوں کی گئی اسے ذہن میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے دو صورتیں تھیں، ایک یہ کہ وہ مرغوب علی کا خیال چھوڑ دے اور اپنے باپ کو راضی کر لے۔ یا پھر یہ کہ وہ مرغوب علی کے خاندان کے افراد کی پروا نہ کرے اور اپنے پروگرام کے مطابق آگے بڑھے، کیونکہ اس کا تعلق صرف مرغوب علی سے تھا۔ سوچتی کہ باقی افراد خاندان آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ زبیدہ سے بھی بدلہ لے سکے گی۔ کسی کو معاف کر دینا ٹریا کی فطرت میں نہ تھا۔ بچپن ہی سے ماں کے مرجانے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور مختلف کالجوں میں خطوط تعلیم کے زیر اثر اس خود اعتمادی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اسے اپنی ذہانت پر بڑا ناز تھا اور وہ اس بات پر بھی مطمئن تھی کہ پہلی ملاقات ہی میں اس نے خاندان کے تمام افراد کا نفسیاتی تجزیہ کر لیا تھا اور ان کی طبیعتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے سب کی اوسط نکالی تو محسوس کیا کہ اوسط اس کے خلاف نہیں بلکہ حق میں تھی۔

مرغوب گھر پہنچا تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ راستہ بھر سوچتا رہا تھا کہ بھائی زبیدہ نے اچھا نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پہنچ کر وہ محک کرے گا مگر اب جو اس نے دیکھا کہ سب لوگ سونے کے لئے جا چکے تھے تو اس نے احتجاج کے خیال کو ذہن سے بھٹک دیا۔

یعقوب علی اور زبیدہ اپنے کمرے میں گئے تو زبیدہ یعقوب نے پھر بات شروع کر دی اور دھیمی آواز میں خاندان سے کہنے لگی۔ ”آپ کو بھی خاندانی روایات کا کوئی

خیال نہیں۔ آپ مرغوب علی کو اس کی حرکات سے متح کیوں نہیں کرتے؟ کوئی بات بھی تو ہوڑ کی میں۔ یہ صرف تعلیم ہی شادی کے لئے انتخاب کا معیار رہ گیا ہے؟ کیا مرغوب کو بجائے بیوی کے، استانی کی ضرورت ہے؟“ میجر یعقوب علی نے اکتا کر کہا۔

”مرغوب جوان ہے اور اپنا نفع نقصان بہتر سمجھتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی صحیح رہنمائی کریں۔ اسے فیصلے کے سانچے سے آگاہ کر دیں اور اگر وہ ہماری رائے کو کوئی اہمیت نہ دے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“ زبیدہ یعقوب یہ بات سن کر سوچ میں پڑ گئی۔

بڑا بھائی محبوب علی اور سکینہ اپنے کمرے میں گئے تو وہاں بھی دن کے واقعات کی صدا اے باز گشت سنائی دی۔ سکینہ نے محبوب علی سے کہا۔ ”آپ بڑے بھائی ہیں اور والد کی جگہ میں مگر آپ نے مرغوب کی قطعاً رہنمائی نہیں کی۔ مجھے یہ لڑکی، جسے وہ آج ساتھ لایا تھا، بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ ظاہری شکل و شبہت بھی واجبی ہے۔ میں تو اسے بد صورت ہی کہوں گی۔ اگر آپ بہت زیادہ رعایت بھی کریں تب بھی اسے اوسط درجے کی لڑکی ہی کہہ سکتے ہیں۔ رنگ تو بہت ہی گہرا ہے، جسے آپ حسن طبع کہا کرتے ہیں، وہ بھی نہیں کیونکہ نقوش بھی مونے اور بھدے ہیں۔ بس تعلیم ہی تعلیم ہے۔ کیا مرغوب اسے ملازم کرا کے اس کی کمائی کھانا چاہتا ہے؟“

انسپیکٹر محبوب علی کہنے لگا۔ ”میں بھی بالکل تمہاری طرح سوچ رہا ہوں۔ میں کھل کر بات اس لئے نہیں کرتا کہ بڑے اور چھوٹے بھائی کے رشتے میں ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے۔ زور دے کر اپنی بات کہنے کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ مرغوب گستاخی پر اتر آئے، جس کے نتیجے میں وہ بالکل ہی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ درحقیقت ہمیں بروقت پہنچ نہیں سکا۔ اب مرغوب علی ٹریا کے ساتھ بہت آگے جا چکا ہے۔ جب میں نے اسے کہا تھا



و حیات، ضرورت برادری کے اصول اور رسوم و رواج کی پابندی باہم مل کر کرتے تھے۔ اس طرح انداز کی حفاظت کا کام سرانجام دیتے تھے۔ تقسیم نے معاشرتی اکائیوں کو اطراف و جوانب میں پھیلا دیا تھا۔ قافلے اکٹھے آئے مگر جب پاکستان پہنچے تو ہر کوئی کلیسوں اور الٹ منٹوں کے چکر میں الجھ کر رہ گیا۔ رشتہ داریاں برادریاں بس منظر میں چلی گئیں اور معاشی منفعت اور دنیاوی اغراض مقدم ہو گئیں جہاں کہیں کسی کو فائدہ نظر آیا وہ وہاں چلا گیا۔ کسی نے اچھی زمین کا انتخاب کیا، کوئی کارخانوں کے پیچھے دوڑا تو کوئی دکانوں کی انٹرنٹ کے لئے دفاتر کے چکر کاٹنے لگا۔ حرم دہوانے قومی اخلاق پر ایسا حملہ کیا کہ ہر کوئی اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے میں لگ گیا اور اس دوڑ میں صبا جی اور مقامی کی بھی کوئی تفریق باقی نہ رہی۔

خاندان میں نفاق کے خدشے خصوصاً انسپکٹر محبوب علی کو اذیت دیتے تھے۔ "ہمارے خاندان جس امتحان سے گزر رہا ہے، وہ بہت ہی شدید ہے۔" محبوب علی سوچتا۔ "کرل یعقوب علی کا تبادلہ کراچی ہو گیا ہے۔ انسانی خواہشات کس میں نہیں ہوتیں؟ اسے وہاں بنگلہ الاٹ ہو گیا، تو وہ پنجاب واپس نہیں آئے گا۔ مرغوب علی ایک عیسائی لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا، جس میں جوانی اور تعلیم کے سوا کوئی خوبی نہیں تھی۔ یہ صورت حال منجیدہ بیوج بچار کی متقاضی تھی۔ مگر میں ایسے فرد کا اضافہ ہو رہا تھا، جس کے ہاٹ بجوں پر منفی اثرات پڑنے کا احتمال تھا۔ کیا ہمارے بچے بھی آگے چل کر یہی طرز عمل اختیار کریں گے، جو مرغوب نے کیا؟ کیا ہماری لڑکیاں ٹریا کے پیچھے پیچھے چلیں گی؟" یہ خیال آتے ہی محبوب علی کانپ گیا۔

ناشتہ کی میز پر بیٹھے تو مرغوب علی نے سب سے پہلے بات کا آغاز کیا۔ وہ زبیدہ بھابی کو مخاطب کر کے شکوہ کرنے لگا۔ "آپ نے تو رات کمال ہی کر دیا۔ تاغہ دو چار قدم آگے تو جا لینے دیتیں، آپ نے اس زور سے اس

کہ ٹریا کو یہاں لے آؤ یا رات کے کھانے پر بالالو تو میرا خیال تھا کہ اول تو مرغوب ہی کچھ شرم کر لے گا اور اس پر راضی نہ ہوگا اور اگر وہ یہ دلیری کر بھی گیا تو ٹریا رات کو اکیلی اس کے ساتھ نہیں آئے گی مگر میرے دونوں خیال لٹل لٹلے۔ اب صرف یہ صورت باقی رہ گئی ہے کہ کل صبح ناشتے پر تم پھر بات چھیڑو اور اسے سمجھاؤ کہ وہ اس لڑکی کے خیال سے باز آ جائے۔ مجھے یقین ہے کہ زبیدہ اور یعقوب علی بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے، پھر میں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ دعا کرو کہ وہ سمجھ جائے۔"

## تیسرا باب ..... بغاوت

صبح ناشتے کی میز پر پھر خاندان اکٹھا ہو گیا۔ میجر یعقوب علی کے بچے ابھی تک جاگے نہیں تھے مگر سیکڑنے اپنے بچوں کو سویرے سویرے ناشتہ کرا کے سکول جانے کے لئے تیار کروا دیا تھا۔ اس روز پھر زوردار بحث ہوئی۔ لڑکے اور لڑکیاں گھر سے ایک ہی تانگے پر نکلتے۔ تانگے والا پہلے لڑکیوں کے سکول جاتا، انہیں وہاں اتارتا اور پھر لڑکوں کو ان کے سکول پہنچا دیتا۔ چھٹی کے وقت وہ الٹا چکر لگاتا۔ یعنی پہلے لڑکوں کے سکول جاتا اور پھر واپسی پر لڑکیوں کو اپنے ہمراہ لے لیتا۔ محبوب علی یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں بھی لڑکیاں لڑکوں کے سکول کا چکر کاٹ کر آئیں یا ادھر جائیں۔

مگر یہ روایت پرست خاندان اب ایسے حالات سے دوچار ہو چکا تھا جو اس کی انداز پر براہ راست حملہ آور ہو رہے تھے۔ انسپکٹر محبوب علی عموماً کم بولتے تھے مگر سوچتے بہت تھے۔ وہ مسلسل سوچ و بچار کر رہے تھے کہ حالات کی تبدیلی صرف مرغوب تک محدود نہیں رہے گی بلکہ مزید پیچیدگی اختیار کرے گی۔ سب برادری ایک ہی علاقے میں رہتی تھی، اس ناطے افراد ایک دوسرے کی شرم

READING  
Section



بے چاری کو بڑا بھلا لہا کہ ام دونوں دم بخود رہ گئے۔ میں  
تو سمجھتا ہوں کہ وہ لڑکی بہت ہی عقل مند ثابت ہوئی،  
ورنہ مانگنے والے کے سامنے میرے ساتھ افسوس کرتا  
شروع کرو جی۔ میرے بچے کیا رہ جاتا؟

زبیدہ یعقوب پہلے ہی جلی ہوئی بیٹھی تھی۔ اسے  
موقع ملا تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ  
کر لیا۔ کہنے لگی۔ ”مرغوب! تمہارا باپ زندہ نہیں۔ محبوب  
بھائی گھر میں سب سے بڑے اور تمہارے باپ کی جگہ  
ہیں۔ اگر تمہیں شرم ہوتی تو ایک غیر عورت کو نکاح سے  
پہلے ان کے سامنے لے کر نہ آتے۔ جس کی تم بات  
کرتے ہو اور دنیا جہان سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہو، بھلا  
کیوں کر بولتی؟ جو عورتیں راتوں کو اپنے دوستوں کے  
ساتھ گھومنے پھرنے نکل پڑتی ہیں، ان کو ایسی باتیں  
برداشت کرتی پڑتی ہیں۔ میں تو بھائی محبوب کی وجہ سے  
رک گئی، ورنہ سب کے سامنے کہتی کہ ذات کی چھٹکی اور  
فہمیر پر بیسرا۔“

خاندان کے سب افراد مرغوب علی کو زری سے سمجھاتا  
چاہتے تھے اور اسے مزید آگے بڑھنے سے منع کرنے کا  
ارادہ رکھتے تھے مگر یہ کوئی نہ چاہتا تھا کہ گفتگو کو اور صورت  
اختیار کر لے۔ مرغوب علی اور زبیدہ یعقوب نے  
جلد بازی سے کام لے کر ماحول خراب کر دیا۔

سیکنہ نے اس موقع پر پھر ماحول کو خوشگوار بنانے  
کی کوشش کی اور کہا۔ ”زبیدہ! بہن! مرغوب سے ہم ہی  
نے کہا تھا کہ وہ ٹریسا کو رات کے کھانے پر لے آئے  
کیونکہ وہ اس کے ساتھ ریڈیو میں کام کرتی ہے۔ اس تعلق  
کی بناء پر آگئی، تو کیا ہوا؟ ہم سب مل کر مرغوب علی کو  
اونچ نیچ سمجھائیں گے تو یہ اس کا خیال چھوڑ دے گا۔ ابھی  
کون سی ان دونوں نے شادی کر لی ہے۔“

کرل یعقوب علی نے مرغوب کو بات کرنے کا  
موقع دیا اور خود بول پڑا۔ کہنے لگا۔ ”میں اس معاملے کو

مستقبل کے احتمالات کی روشنی میں دیکھتا ہوں۔ شادی کا  
منطقی نتیجہ بچے ہیں۔ نیا خاندان بنتا ہے تو نئے مسائل بھی  
پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب لڑکے لڑکیوں  
کے لئے رشتوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ان کے خون  
میں ملاوٹ ہو تو کوئی اچھا خاندان ان کو قبول کرنے پر تیار  
نہیں ہوتا۔ مرغوب نے ضرور ان احتمالات کو سوچ لیا ہو  
گا۔ اگر اب تک نہیں سوچا تو اسے وقت ملنا چاہئے کہ وہ  
سوچ سکے۔ ممکن ہے کہ ٹریسا ہی خاندان کے ماحول میں  
اپنے آپ کو نہ ڈھال سکے اور جذبات کا دیرپا اثر دے ہی  
علحدگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ایسی صورت میں وہ بچوں کو  
بھی ساتھ لے جاسکے گی۔ بچوں میں لڑکے بھی ہو سکتے  
ہیں اور لڑکیاں بھی۔ مجھے علم ہے کہ مشن والے ایسی  
خواتین و حضرات پر نظر رکھتے ہیں جو عیسائیت چھوڑ کر  
دوسرا مذہب اختیار کر لیں، پھر جب بھی انہیں موقع ملا  
ہے تو وہ انہیں دوبارہ عیسائی بنا لیتے ہیں۔ میرے ایک  
دوست ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے دور ان تعلیم ایک عیسائی  
ڈاکٹر خاتون سے شادی کر لی۔ اس میں سے تین لڑکیاں  
پیدا ہوئیں۔ کچھ مدت بعد میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی۔  
بیوی اپنی بچیوں کو لے کر ڈاکٹر مشن میں چلی گئی۔ ڈاکٹر  
صاحب نے عدالت سے مدد حاصل کرنی چاہی مگر مقدمہ  
ہار گئے۔ عدالت نے لڑکیوں کو ماں کی سرپرستی میں دے  
دیا اور ان کا خرچہ بھی مقرر کر دیا جو ڈاکٹر صاحب عمر بھر ادا  
کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنی لڑکیوں کو ناچ  
گھروں میں غیر مردوں کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے  
دیکھا۔ ماں نے انہیں ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ تم کی بات  
یہ تھی کہ وہ لڑکیاں ڈاکٹر صاحب کے نام پر قاضی سسرور  
کہلاتی تھیں۔ ڈاکٹر قاضی پر اسے وضع دار شخص تھے، یہ  
برداشت نہ کر سکے۔ پہلے ان پر قاضی گرا، ذرا سنبھلے تو کسی  
نے پھر یہ المیہ یاد دلایا، طعنہ دیا۔ قاضی صاحب نے  
حرکت قلب اسی دم بند ہو گئی اور رشتہ حیات مل جل میں



نوٹ گی۔ مرغوب! ان احتمالات پر بھی غور کر لو۔ تم اپنے آپ کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہو۔

مرغوب علی نے زبیدہ محبوب، سکیڈ اور یعقوب کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بڑے بھائی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”بھائی جان! میں آپ سب کو اس سے قبل بھی آگاہ کر چکا ہوں کہ میں اور ثریا نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ وہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ باقی جو کچھ یعقوب بھائی کہہ رہے ہیں، صرف احتمال کی حد تک درست ہے، کیونکہ جہاں تک ڈاکٹر قاضی کی قسم کے واقعات کا تعلق ہے کچھ حالتوں میں ایسا ضرور ہوا ہے مگر کچھ شادیاں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ کامیاب شادیوں کی اوسط زیادہ ہے۔ میں نے آپ سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اپنے بیوی بچوں کی ساری باتیں سن کر میرا ذاتی استحقاق ہے اور میں اس میں کسی کا دخل برداشت نہیں کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

انسپکٹر محبوب علی جواب تک چپ بیٹھے ہوئے تھے، نرمی سے بولے۔ ”ہمیں یقین ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ، ہمارے بچوں اور دیگر افراد خاندان کے ساتھ اتنی محبت ضرور ہے کہ تم ثریا کے لئے ہم سب کو چھوڑ نہیں سکتے۔“

مرغوب علی سمجھ گیا کہ بڑا بھائی پولیس کا تجربہ کار افسر ہے اور باتوں باتوں میں دھمکی دے رہا ہے کہ تمہیں خاندان اور ثریا میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مگر وہ اپنے دل میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ ثریا کے لئے خاندان چھوڑ دے گا۔ اسے یقین تھا کہ مزارعتیں سب وقتی اور جذباتی باتیں ہیں۔ وقت کا مرہم ان زخموں کو بھر دے گا اور چند سال بعد وہ ثریا کے ہمراہ دوبارہ خاندان میں شامل ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے کہہ دیا۔

”میں خود خاندان کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا

لیکن یہ خاندان کی مرضی ہے کہ وہ مجھے ساتھ رکھے یا چھوڑ دے۔ اگر میں آپ کا بھائی ہوں تو آپ سب کو زیر دے بھی قبول کرنا ہوگا۔ اگر آپ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تو پھر میری طرف سے بھی خدا حافظ۔ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک آپ میرے ساتھ ٹریا کو بھی قبول نہ کر لیں۔“

کسی کو امید نہ تھی کہ مرغوب علی اس حد تک جاسکتا ہے لیکن بعض اوقات زندگی کے حقائق جذبات سے زیادہ سخت اور تلخ ہوتے ہیں۔ پسند، ناپسند کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور صرف صورت حال کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ مرغوب علی اٹھا اور بغیر کچھ مزید کہے سنے، سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر کے تمام افراد ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

مرغوب علی اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ صبح کے اخبارات کا بنڈل اٹھا کر اپنی میز پر گیا، تاکہ تازہ کالم لکھنے کے لئے موضوع کا انتخاب کر سکے لیکن اسے نہ تو کوئی ایسی خبر ملی جس پر تبصرہ کر سکے، نہ کسی دوسرے اخبار کا کوئی کالم اسے موضوع بحث بنانے کے قابل نظر آیا۔ تقسیم کے مسائل، انتقال آبادی کشمیر، جونا گڑھ، حیدرآباد، ریاستوں کا الحاق، واجبات اور اثاثہ جات کی تقسیم اور اسی قسم کے روزمرہ کے موضوعات سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔

اسے ان موضوعات کی اہمیت کا احساس ضرور تھا لیکن وہ ہر روز ایک ہی بات کہتا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دماغ پر ایک ہی مسئلے نے قبضہ کر رکھا تھا جس کی جڑ وہ فرسودہ روایات، شخصی آزادی اور سماجی اقدار، قدامت اور جدیدیت کے تقاضے، نوجوان طبقے کی نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی پس منظر وغیرہ میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنا ذاتی مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں غم جاناں اور غم دوراں ایک ہی مسئلے کے دو پہلو تھے اور اس مسئلے کی جڑ خاندانی اور اور ثقافتی، ماحول اقدار میں



اور تم دونوں حقائق کی طرف سے آنکھ بند رکھتے ہوئے ہو۔ عورت جب شباب کی پٹری سے اترنے لگتی ہے تو اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہ سکتی اور وہ وقت عورت کی زندگی میں بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ دوسری شادی اور پہلی بیوی کو طلاق دینے کے واقعات بالعموم اس دور میں ہوتے ہیں۔ جب عورت اور مرد چالیس اور پچاس سال کی عمر کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس دور میں عورت میں جسمانی کشش باقی نہیں رہتی اور مرد ابھی جوان ہوتا ہے۔ عورت مرد کی بجائے بچوں کا خیال زیادہ رکھتی ہے اور مرد اس سے پہلی سی محبت کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہ وقت عورت کی زندگی میں بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ نہ تو گھر چھوڑ سکتی ہے اور نہ خاوند کو مطمئن کر سکتی ہے۔ بیٹی حقائق کا تجزیہ کرو۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچو اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرو۔ ابھی وقت ہے، وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر سوائے غم، پریشانی اور دکھ کے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

ٹریسا نے کہا۔ ”ڈیڈی! شادی ایک دوطرفہ معاہدہ ہے۔ ایک فریق اگر معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو دوسرا فریق اسے ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہے۔ یہی معاشی ضروریات کی بات تو ڈیڈی! میں آپ کی شہر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ میں کبھی بھی مرغوب پر بوجھ نہ بنوں گی اور خود کما کر کھاؤں گی۔ آپ میرے لئے دھما کر رہے ہیں اور اپنی شفقت سے محروم نہ کریں۔ رہا مسئلہ کنیشن والوں کا رہ گئی کیا ہو گا اور وہ مجھے یا آپ کو کیا کہیں گے؟ تو یہ واضح ہے کہ آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ قصور صرف میرا ہے اور میں تو مشن اور اس کے کارکنوں سے اپنا تعلق بیٹھنے کے لئے ختم کر رہی ہوں۔ لہذا مجھے ان کی پروا نہیں اور یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں کی تعینات سے کبھی کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی۔“

یہ کہہ کر ٹریسا انھی اور حسب سابق ڈیڈی کو سلام

نہی۔ اس نے قلم اٹھایا اور اسی موضوع پر ایک بھرپور کالم لکھ مارا، پھر اسے چیف ایڈیٹر کی منظوری کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد چیپ ایڈیٹر نے آکر بتایا کہ چیف ایڈیٹر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اندر گیا۔ سلام کیا اور پوچھا۔ ”حکم؟“ چیف ایڈیٹر نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور اسے بتایا کہ اس کا گزشتہ روز کا کالم قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ اسے کئی لوگوں نے فون کئے ہیں۔ جن میں وکلاء، اساتذہ، صحیح صاحبان اور معاشرے کے سرکردہ کئی اصحاب شامل ہیں۔ خواتین میں بالخصوص اس کا کالم بہت پسند کیا گیا ہے۔ بعض سوشل کام کرنے والی خواتین نے اس موضوع پر مزید کالم لکھنے کے لئے درخواست کی ہے اور یہ کہ آج کا کالم جو اسی بج پر لکھا گیا ہے، اسے امید ہے کہ بہت پسند کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر چیف ایڈیٹر نے کالم کا مسودہ مرغوب علی کو دے دیا تاکہ وہ اسے کاتب کے حوالے کر دے مگر مرغوب علی نے اسے نظر ثانی کے بہانے روک لیا۔ دراصل وہ یہ مسودہ ٹریسا کو دکھائے بغیر کاتب کو نہیں دینا چاہتا تھا۔

ٹریسا صبح سو کر انھی تو اس کا ہاپ ٹاشٹے کی میز پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گو بوزھا کپا ڈنڈر ہار مان چکا تھا لیکن اس کی پوزانہ محبت اور شفقت کے تقاضے اسے اگلوٹی اولاد کو ہاتھ سے کھو دینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ معاشرتی مصلحتیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ لڑکی کو ایک دفعہ اور سمجھا کر دیکھ لے مگر لڑکی کی ضد اور ہٹ دھرمی کے پیش نظر وہ اس پر بھی تیار ہو چکا تھا کہ لڑکی اپنی ضد پوری کر لے۔ اگر اس کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو سوچ کرے ورنہ کئی دوسری لڑکیوں کی طرح مشن کے دامن میں دوبارہ پناہ لے لے گی۔

اس نے شفقت اور پیار سے جذبوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی جو قدم تم اٹھا رہی ہو، مجھے یقین ہے۔ وہ غلط ہے۔ آج جذبات کے جوش میں مرغوب



**دلیل:** اپنی آواز کی بجائے اپنی دلیاں کو بلند کرو کیونکہ پھول بارش کے برسے سے کھلتے ہیں، بادل کے گرجنے سے نہیں۔ (نسیم سلیمینہ صدق)

جوابات بھی غریب دہرائے گئے جو ان دونوں نے دیے تھے۔

ٹریا نے آئندہ پروگرام کے متعلق دریافت کیا تو مرغوب علی نے فوری جواب دیا۔ ”اب تو سوچتے اور انتظار کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے حقائق سامنے آ چکے ہیں، ان سے گریز کا موقع نہیں۔ مکان تلاش کیا جائے اسے مناسب سامان سے آراستہ کیا جائے۔ تم اسلام قبول کرو، اس کے ساتھ ہی نکاح کی رسم ادا کی جائے اور نئی زندگی کا آغاز کیا جائے۔“

ٹریا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب درست، مگر نئی زندگی کے آغاز پر رقم کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ ایک ماہ کا کرایہ مکان اور ضروری خرچ نکال کر کچھ سامان بھی خریدا جاسکتا ہے۔ وہ میں ساتھ لے آئی ہوں۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔“ مرغوب علی نے اسے اپنی پونجی بھی بتائی۔ دونوں کا سرمایہ مل کر اتنا بن جاتا تھا کہ وہ نیا گھر چلا سکیں۔

پاکستان بنایا جاتا تھا۔ ایم اے انگریزی بلینک چیک کا درجہ رکھتا تھا۔ اتفاق سے دونوں ایم اے انگلش تھے۔ اگر ملازمت کرنا چاہتے تو دونوں کے لئے وسیع میدان تھا۔ مرغوب علی مقابلے کے امتحان میں شامل ہو سکتا تھا۔ ٹریا کسی زمانہ کالج میں نوکری کر سکتی تھی۔ اس لئے مالی مشکلات کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

دونوں ہوٹل سے اٹھ کر محکمہ بحالیات میں گئے۔ مرغوب علی مہاجر تھا، محکمہ بحالیات میں اس کے جانے والے موجود تھے۔ معمولی کوشش سے اسے ایسا مکان مل گیا جس میں تھوڑا بہت ساز و سامان بھی موجود تھا۔ جلد

کے گھر سے باہر نکل گئی۔ بوڑھا لپٹا دھڑکھٹ کی طرف ٹھٹھکی باز دیکھتا رہ گیا۔ گھر سے نکلی تو ٹریا کو زبیدہ یعقوب کے فقرات یاد آ گئے جو اس نے رات اسے گھر سے الوداع کرتے وقت کہے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ زبیدہ یعقوب نے جان بوجھ کر اسے سنانے کے لئے سب کچھ کہا تھا۔ اس میں مرغوب کا تصور ہونا ہو مگر اسے ان فقرات کے لئے معافی مانگنا ہوگی۔ وہ اسے ایسے گھر میں کیوں لے گیا جہاں یہ کچھ پیش آ سکتا تھا؟ پھر اسے وہی پرانا خیال آیا کہ اگر ان تلخ الفاظ کا بدلہ لینا ہے تو اسے خاندان کے اندر داخل ہونا ہوگا اور موت سے کام لینا ہوگا۔ یہ مخالفت کوئی غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ انہی خیالات میں غرق پیدل چلتی ہوئی مرغوب کے دفتر پہنچ گئی۔

معافی مانگنے پر مرغوب علی پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ ٹریا کوئی شکایت کرتی۔ وہ ابھی بیٹھی بھی نہ تھی کہ مرغوب نے رات کے ناخوشگوار واقعے پر معافی مانگ لی۔ ٹریا مسکرا دی۔ مرغوب نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے کالم کا مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ٹریا نے دلچسپی سے مواد پڑھا اور تبصرہ کیا۔ ”کالم نگاروں کا یہ عام دھیرہ ہے کہ وہ قارئین کے لئے بہت کچھ لکھتے ہیں مگر ان کا اپنا عمومی عمل اپنی گزارشات سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔“ مرغوب علی ٹریا کی بھرپور طنز سمجھ کر مسکرا دیا اور بولا۔ ”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میرے عمل اور قول میں کتنی ہم آہنگی رہتی ہے اور کس قدر تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس موقع پر میں جو کچھ بھی کہوں گا، وہ تکلف ہی معلوم ہوگا۔“

یہ گلے شکوے ہو چکے تو دونوں نے حسب معمول باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ دونوں آہستہ آہستہ پیدل چلتے ہوئے باغ جناح پہنچ گئے۔ اس دوران انہوں نے ایک دوسرے کو اس طرز پر لکھوں میں اس گنگو کا خالص سنایا جو ان سے اپنے گھر میں ناشتے کی میز پر کی گئی تھی۔ پھر وہ

READING  
Section



# ہومیو پیتھی واحد طریقہ علاج ہے

جو

مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ مرض کی اہمیت کو ختم کرتا ہے۔ علاج سے کوئی ضرر پہنچا نہیں دیتا اور مرض کو  
بیشمار سے ختم کرتا ہے۔ ہومیو پیتھی واحد طریقہ علاج ہے جو ہمارے کئی سماجی مرض کو پختہ  
انسانی زندگی بناتی ہے۔ ہمارے سماج میں ہومیو پیتھی کے سوا کوئی آپ کی زندگی نہیں

## کوئی مرضی علاج نہیں

خواہ وہ کتنا ہی پرانا ہو۔ شہر، دیہات، مردوں اور بچوں کے تمام امراض ختم ہو جاتے ہیں۔  
ان کے لئے ہمارے امراض معذور بچوں کے علاج کے لئے دستہ نظام علاج بہت آسان ہے۔

ماہد کے لئے

0321-7612717

0312-6625056

0323-4329344

ڈاکٹر رانا محمد اقبال  
(گولہ پورہ)

عارف محمود

بالمشافہ مذاق سے کے لئے پہلے وقت لیں۔

درست شفاء حکایت 26 پٹیاں گراؤنگ لکھنؤ



سہی مگر بڑے بھائیوں کا ادب، صلہ رحمی اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کا بھی آخر کوئی مقام تھا۔ مرغوب علی تو انگریزوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ کیا اعلیٰ تعلیم یہی سمجھانی ہے؟ آئندہ چل کر کیا ہو گا؟ وہ سوچتا رہا۔ ناشتے پر مستورات بھی خلاف معمول خاموش ہی رہیں۔

مرغوب علی نے ناشتہ جلد ختم کر لیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پاس کوئی خاص سامان نہ تھا۔ دو چار جوڑے کپڑوں کے، جو پہلے ہی سوٹ کیس میں بند تھے، وہ ہمراہ لے کر نکل آیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے رسماً سب کو خدا حافظ کہا۔ پھر سوٹ کیس ہائیٹل کے پیچھے باندھا اور سوسے منزل چل پڑا۔ احساس تک نہ ہوا کہ جن لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا تھا، ان کے اس پر کیا حقوق ہیں اور اس وقت ان کے جذبات و احساسات کیا ہیں۔ اس نے گویا بڑے سکون، اطمینان، حوصلے اور جرأت سے فردا کی طرف قدم آگے بڑھائے تھے۔ درحقیقت اس کی لغت میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کا کوئی لفظ موجود نہ تھا۔

وہ پہلے اپنے نئے مکان پر گیا، سوٹ کیس اندر رکھا، پھر اخبار کے دفتر روانہ ہو گیا۔ اس نے کالم نویسوں میں خود اعتمادی، عزم و حوصلہ اور مقابلے اور مسابقت کے موضوع پر لکھا۔ عنوان کے طور پر قائد اعظم کا مشہور مقولہ "افضا کی وسعتوں میں خالی جگہ کی کمی نہیں" استعمال کیا۔

ٹریس آئی تو اس دم اس کا انداز مختلف تھا۔ صبح اس کے باپ نے نہ تو ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کیا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھانے کا کلف کیا تھا۔ البتہ کام پر جاتے ہوئے اس کے قدم ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے لیکن ٹریس کا ذہن مستقبل کے جن سنہرے خوابوں میں منہمک تھا، وہاں بوڑھے باپ کے قدموں کی طرف دیکھ دینے کی مطلقاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔

مکان کی چابی بھی مل گئی۔ عارضی الاٹمنٹ ہوئی تھی۔ دو دن بعد جمعہ تھا، جو زندگی کی اگلی منزل اختیار کرنے کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

## باب چہارم..... نکاح کا بندھن

رات کو ریڈیو ڈیوٹی کے بعد مرغوب علی گھر پہنچا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ مکان الاٹ کروا چکا ہے اور وہ کل سے اس میں منتقل ہو جائے گا۔ انسپکٹر چوہدری محبوب علی نے صرف اسی قدر کہا کہ جان برادر! جہاں رہو خوش رہو۔ یعقوب اور زبیدہ یعقوب نے کچھ نہ کہا۔ سیکرٹ محبوب نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ جب کبھی ہم یاد آئیں تو بچوں کو دیکھنے کے لئے آ جایا کرتا۔ کرنل یعقوب علی نے ٹر اپنی کے لئے اپنی نشست مخصوص کرالی تھی۔ وہ جمعرات کو شام کی گاڑی سے وہاں جا رہا تھا۔

انسپکٹر محبوب علی اپنے بستر پر لیٹا رات گئے تک سوچ رہا تھا کہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے ان کے ذمے چند فرائض تھے۔ مرغوب علی کی شادی کرانا بھی اس کا فرض تھا مگر چھوٹے بھائی نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ اس کی تعلیم و تربیت بھی اس کا فرض تھا۔ تعلیم کا فرض ادا ہو گیا مگر تربیت کے معاملے میں شاید اس سے کہیں چوک ہو گئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا اور بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح ناشتہ حسب دستور سب نے اکتھے کیا۔ اس روز خلاف معمول سب خاموش تھے۔ مرغوب علی کا گھر میں یہ آخری دن تھا۔ انسپکٹر محبوب علی کے چہرے پر پریشانی اور سب اطمینانی کی علامات واضح تھیں۔ کرنل یعقوب علی بھی بھائی کے جذبات سے آگاہ تھا اور مرغوب علی کے رویے پر شاکی بھی۔ وہ فوجی افسر تھا، نظم و ضبط کے اقتدار کے ایسے تصور کو بھی گناہ سمجھتا تھا، جس کا مظاہرہ مرغوب علی اپنے کیا تھا۔ خاندانی روایات اور قدر فرمودہ



مسلم کو دارم اسلام میں داخل کرنے میں خوشی ہوئی مگر مناسب ہو گا کہ آپ لڑکی کے کسی بھسٹ کے سامنے بیان کروالیں۔" مولوی صاحب نے ایک دو معززین نما کو بلا کر انہیں مرغوب علی سے متعارف بھی کروادیا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی مدد کر سکیں۔ ایک وکیل سے بھی ملاقات کروائی، جس نے کہا کہ جمعہ نصف یوم ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر حال میں دس گیارہ بجے کے درمیان دونوں لڑکی اور لڑکا کچھری پہنچ جائیں، باقی کام وہ کر لے گا۔

اس روز بارہ بجے تک یہ سارا کام ہو گیا اور نماز جمعہ کے بعد نکاح کی رسم بھی ادا ہو گئی۔ ٹریسا کا اسلامی نام عارفہ خاتون رکھا گیا۔ یہ نام پہلے ہی ٹریسا اور مرغوب علی کے درمیان طے ہو چکا تھا۔

## باب پنجم ..... وقت کا پہیہ

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا اور واقعات تیزی سے رونما ہوتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہو گیا۔

پاکستان کا قیام طلوع آرزو لوگوں کی جنت ثابت ہوا۔ ابھی شہیدوں کا خون خشک بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے وارثوں نے ان کی ہڈیوں کی بنیاد پر اپنے خوابوں کے محل استوار کرنے شروع کر دیئے۔ کسی نے کبھی بھول کر بھی یاد نہ کیا کہ کتنی عورتیں اور مرد پاکستان کی خاطر جان کا نذرانہ دے کر خاک و خون کا خمیر بنے، کتنی بنیاں اغوا ہوئیں، کتنے بچے ظالموں کی کمزوروں کرپانوں اور برچھیوں کی نوکوں کا ہدف بنے اور کتنی مسجدیں، خانقاہیں، مزار، تعلیمی ادارے اور دینی یادگاریں بے حرمتی کا شکار رہیں۔ ہر ایک کو صرف ایک ہی فکر تھی کہ فلاں فلاں کو یہ فائدہ پہنچا ہے اور فلاں فلاں اس فائدے کے حصول کی کوشش میں سرگرداں ہیں اور ہم آگے بڑھ جانے کے باوجود فلاں

ٹریسا اور مرغوب علی میں جو گفتگو ہوئی اس میں نہ تو اس کا اخباری کالم شامل تھا اور نہ گمراہوں کا ذکر۔ اب وہ سونے والے میاں بیوی کی طرح گھر چلانے، کھانا پکانے، سامان پورا کرنے کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ٹریسا بطور لیکچر نوکری کر لے گی اور مرغوب یکسوئی سے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے گا۔ پاکستان بننے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہر جگہ میں خالی آسامیاں منتظر تھیں۔

ریڈیو کی ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد مرغوب نے کہا کہ وہ آج نئے مکان میں رات گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ "ٹریسا کیا خیال ہے؟" لیکن ٹریسا نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جب تک اگلے دن میں ہونے والی رسمی کارروائی پوری نہ ہو جائے وہ اس انداز میں سوچے بھی نہ۔ چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ مرغوب علی اپنے نئے گھر کی طرف چلا اور ٹریسا اپنے باپ کے گھر کی طرف چل پڑی۔

مرغوب علی کی پہلی رات تھی جو اس نے اپنے فائدان سے باہر اکیلے گز ساری۔ گاؤں میں تھا تو ہائی سکول گھر کے پاس تھا، کالج میں داخل ہوا تو بھائی کے ساتھ رہا۔ رات کو مشکل تھی مگر مستقبل اور ٹریسا کے خیالات نے اسے تنہائی کا زیاوہ احساس نہ ہونے دیا۔

صبح ہوئی تو ناشتے کے لئے اسے دکان پر جانا پڑا۔ آج بھالی پانس نہیں تھی کہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس کے لئے گرم گرم پرائیڈ تیار کر رکھتی۔ دکان پر ناشتہ کیا تو اس نے سوچا کہ دفتر جانے میں تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ مسجد میں گیا۔ مولوی صاحب بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ ان سے ٹریسا کے اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور مدد کی درخواست کی۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "مجھے کسی غیر

READING  
Section



اخبار کے دفتر میں آ کر بیٹھائی تھا کہ اسے بڑے بھائی ہ  
پنچام مل گیا۔ مرغوب علی نے سر تسلیم خم کیا، کہا کہ وہ ریڈیو  
سٹیشن جانے سے پہلے گھر سے ہوتا جائے گا۔ اگرچہ وہ  
دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید بھائی جان اسے نہ ابھلا کہنے  
کے لئے اور عارفہ کو چھوڑ دینے کے لئے کہیں گے۔ مگر  
اس نے خیال کیا کہ چلے جانے میں کیا حرج ہے؟ اس  
نے البتہ عارفہ کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں  
بات بڑھتی نہ جائے۔

شام چار بجے کے قریب مرغوب علی بڑے بھائی  
محبوب علی کے گھر پہنچ گیا جو اسی دم دفتر سے گھر لوٹا تھا اور  
ڈی ایس پی کی وردی میں ملبوس تھا۔ مرغوب علی نے بے  
ساختہ بغلیں ہو کر بھائی کو مبارکباد دی۔

بھائی سے سلام دیا ہوا، ڈی ایس پی محبوب علی نے  
لگا۔ ”مرغوب! جو کچھ تم نے لیا ہے اس سے خاندان کے  
افراد کو صدمہ پہنچا ہے۔ مگر پھر بھی وہ تمہارا ذاتی معاملہ  
ہے، ہم تمہیں اس معاملے کے منطقی نتائج سے آگاہ  
کرتے رہیں مگر جوانی کے جذبات نے تمہیں سوچنے کا  
موقع نہ دیا۔ خیر اب وقت گزر گیا ہے، مستقبل میں کیا ہو  
گا؟ یہ صرف خدا کو معلوم ہے لیکن ناخنوں سے ماس جدا  
نہیں ہو سکتا۔ ہم ایک دوسرے سے ملیں یا نہ ملیں، باپ  
دادا کا نام مشترک ہی رہے گا۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہم مشرقی پنجاب میں بہت ہی  
جائداد چھوڑ کر آئے ہیں، جو زرعی بھی ہے اور کھیتی باڑی بھی۔  
اب اس جائداد کے کلیم داخل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔  
تمہیں یقیناً معلوم ہے کہ بہت سی جائدادیں، جو والد  
مرحوم نے اور تایا جی نے میرے نام کر دوائی تھیں، سب  
برابر کے حصہ دار ہیں۔ تایا مرحوم کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی،  
اس لئے انہوں نے مصلحتاً اپنی سب جائداد میرے نام ہی  
کر دی تھی۔ مختصر یہ کہ اب تم بھی اپنے حصے کے کلیم کا  
مختار نامہ مجھے لکھ دو، تاکہ جائداد کے کلیم داخل کر دیتے

ور قدام سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ فلاں شہر صنعتی اور تجارتی  
گنا سے منید رہے گا اور فلاں فلاں ضلع کی زمین زیادہ  
زر خیز اور قیمتی ہے۔ یہ ایک دہائی جس سے کوئی بھی نہ بچ  
سکا۔ انسپکٹر محبوب علی بھی اس بارے میں سوچتا رہتا تھا مگر  
وہ ایک متوازن ذہن، اونچے کردار اور دلکش شخصیت کا  
مالک تھا۔ اسے اس حقیقت کا بھرپور احساس تھا کہ اس کا  
خاندان شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔ کرٹل یعقوب  
اپنی بیگم کے اثر میں تھا، جبکہ مرغوب علی نے اپنی مرضی  
سے شادی کر کے خاندان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔  
جائداد کے سارے کلیم ابھی تک داخل نہ ہو پائے تھے بلکہ  
اس سلسلے میں بے انتہا کام باقی تھا۔

یہ خاندان ضلع ہوشیار پور کے معزز خاندانوں میں  
شمار ہوتا تھا۔ ٹانڈہ اگرچہ گاؤں کہلاتا تھا مگر تحصیل ہیڈ  
کوارٹر ہونے کی وجہ سے قصبات میں شمار ہوتا تھا۔ یوٹیل  
کمپنی بھی تھی، اس لئے ٹانڈے میں چھوڑی ہوئی جائداد  
کو شہری جائداد شمار کیا گیا تھا۔ اس خاندان کی وسیع زمینیں  
تھیں، حویلیاں تھیں، دکانیں تھیں جو کرائے پر لگی ہوئی  
تھیں، کئی ہزار روپیہ نقد تھا جو بینکوں میں رو گیا۔ ابھی تک  
ان سب اثاثہ جات کے حساب اور ثبوت بھی فراہم نہ  
ہوئے تھے کہ خاندان میں انتشار پیدا ہو گیا۔

انسپکٹر محبوب علی نے سارا درد اپنے دل میں سمیٹا۔  
بھائی کی گستاخی کو معاف کرنا ممکن نہ تھا مگر اس نے  
خاندانی بندھنوں کو اتنا ذہیلا چھوڑ دینا بھی مناسب نہ سمجھا  
کہ الہ خاندان لوگوں کے لئے وجہ عبرت اور سامان تماشا  
بنیں۔ اس نے ایک قابل اعتبار ہیڈ کاشیبل کو بلایا اور کہا  
کہ صبح صبح فلاں اخبار کے دفتر میں چلے جاؤ، وہاں مرغوب  
علی ہوگا، جسے تم پہنچاتے ہو، اسے کہو کہ آج شام وہ اپنی  
بیوی کے ساتھ یا اکیلا، جس طرح مناسب سمجھے، مجھے گھر  
ملے۔

ہیڈ کاشیبل اسی وقت روانہ ہو گیا۔ مرغوب علی ابھی

READING  
Section



اسے وزارت صنعت میں لگایا گیا مگر کچھ عرصے بعد اسے وزارت تجارت میں تبدیل کر دیا گیا۔

چوہدری محبوب علی جلد ہی ایس پی ہو گیا۔ مغرب پاکستان کی وحدت وجود میں تو وہ ڈی آئی جی ہو کر بلوچستان چلا گیا۔ اس کو نیک نامی، فرض شناسی اور ذاتی کردار کی بلندی کی وجہ سے مرکزی حکومت نے نشان امتیاز بھی دیا مگر مرغوب علی کی ملازمت اس طرح بے داغ نہ تھی۔ مشرقی پاکستان میں بھی اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ وہ ان افسران میں سے تھے تھا جو خرید سے جاسکتے ہیں اور ان کی قیمت مقرر ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسے افسر بہت جا رہے کارکن اور سختی نظر آتے ہیں مگر یہ صفات ان کی حرص و آرزو اور جلب زر کی خواہشات کے تابع ہوتی ہیں۔ مرکزی حکومت میں آیا تو یہ فیڈرل مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی صدارت کا زمانہ تھا۔ غیر ملکی امداد افراط سے آ رہی تھی۔ تعمیر و ترقی اور صنعت و تجارت زوروں پر تھی۔ مرغوب علی کو ہاتھ رنگنے کا موقعہ جوتا تو اس نے اپنی طرف سے کوئی کی نہ رہنے دی۔

عارف کا کردار پہلے پر دہلا تھا۔ معاشرے میں اہمیت ملنے پر وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شروع میں اسی نے مرغوب علی کو ناجائز دولت کمانے پر ابھارا۔ اس نے لیکچررشپ چھوڑ دی اور پس پردہ خاوند کی ذمہ داریوں میں شریک ہو گئی۔ اپنی مخصوص عادات کی وجہ سے اس نے اعلیٰ بیوروکریسی کے حلقوں میں رسم و رواج پیدا کر لی اور کسی حد تک اثر و رسوخ بھی حاصل کر لیا۔ وہ پارٹیوں کی جان سمجھی جانے لگی اور انکی پارٹیوں میں بھی شریک ہوتی جن میں مرغوب علی موجود نہ ہوتا۔ وہ خاوند سے کہیں زیادہ شراب کی رسیا تھی۔ بیوی کی رہنمائی تھی اور کچھ اس کی اپنی افتاد طبع، مرغوب علی نے عوام الناس اور قومی خزانے کو بھڑکھڑاتا۔ اسی افسر کو کچھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمانہ شباب میں یہ شخص مہاجر کیپوں میں خدمات سرانجام دے

جائیں۔ اسی قسم کے مختار نامے کے لئے میں یعقوب سے بھی کہہ رہا ہوں۔ اس کا خط آیا ہے کہ ایک دور روز میں وہ بھی بھیج دے گا۔ تصفیہ ہو جائے تو جائداد تقسیم کر دی جائے گی۔

مرغوب علی کو اپنے بڑے بھائی کے خلوص اور نیک نیتی پر کبھی بھی شبہ نہیں تھا، اس لئے اس نے بغیر چوں و چراں کے کہا۔ ”کل شام تک میری طرف سے بیان ملے گا اور مختار نامہ بحسب رینڈ۔“ اوّل اور اوتھ کمشنر سے تصدیق شدہ، آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا بلکہ کسی وقت آ کر خود دے جاؤں گا۔ جہاں تک جائداد کی تقسیم کا سوال ہے تو امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی، کیوں کہ میں بھی کما رہا ہوں، عارف نے بھی کالج میں ملازمت کر لی ہے اور ہم اپنا وقت بڑی خوش اسلوبی سے گزار رہے ہیں۔ موروٹی جائداد کشمیری ہی رہے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ ریڈیو سٹیشن چلا گیا۔

رات اس نے بھائی کے ساتھ ملاقات کا حال عارف سے بیان کیا تو عارف نے کہا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ فی الحال جائداد تقسیم نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ مگر ایک بات سوچ لینا کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔“ مرغوب علی دوسرے دن حسب وعدہ کاغذات بعد از تکمیل بھائی کے گھر پہنچا آیا۔ دو چار روز میں کر قل۔ یعقوب سنے بھی مختار نامہ مصدقہ معہ بیان ملے بھائی کو بذریعہ رجسٹری ارسال کر دیا۔ اس طرح خاندانی جائداد کا مسئلہ وقتی طور پر طے ہو گیا۔

مرغوب علی نے جلد ہی مقابلے کا امتحان دیا اور سی ایس پی میں منتخب ہو گیا۔ تربیت کے بعد اس کی خدمات بطور سب ڈیوٹی بلجسٹریٹ، حکومت مشرقی پاکستان کے حوالے کر دی گئیں، جہاں پر وہ چھ سات سال بعد واپس کشمیر ہو گیا۔ 1960ء کے قریب وہ ترقی پا کر بطور جوائنٹ سیکرٹری مرکزی حکومت میں آ گیا۔ یہاں پہلے تو

READING  
Section



کرتا تھا اور حد درجہ ستمنا رکھتا تھا کہ لوڑا سیدہ مملکت جلد از جلد اپنا وجود منقطع کر لے۔

کوئی نہ سمجھ پایا کہ قوم کی اخلاقی گراؤٹ میں یہ منشی تبدیلی کیونکر شروع ہوئی اور وہ دل جو قیام پاکستان کے وقت مملکت کے ساتھ دھڑکتے تھے، بعد ازاں کیونکر پتھر بننے لگے۔

فاطمہ جناح نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ کرپشن آسمانی بر فہاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہ برف پہلے پہاڑ کی چوٹیوں پر گرکتی ہے، پھر پہاڑوں کے دامن تک جا پہنچتی ہے اور ارض کو حد نظر تک اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہے۔

مرغوب علی کی شہرت بڑی طرح داغدار ہوئی۔ جہاں دھواں اٹھے وہاں تار ضرور موجود ہوتی ہے۔ انگلیاں اس کی جانب اٹھنے لگیں۔ چند بار تحقیقات تک بھی نوبت آئی مگر حکومتی وقار آڑے آ گیا۔ کچھ اس کی ذہانت اور طریق کار میں ہوشیاری تھی جو دریغ نکلا۔ اسے رشوت دینے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ عارفہ اپنے اطوار سے اس کی مدد کر دیتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کے ساتھ بھی اسے شائی لاکٹ، یہودی، میر جعفر اور میر صادق کے القاب سے یاد کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ سودن چور کے پھر ایک دن شاہ کا۔ آخر ایک روز وہ ایسا نرغے میں آیا کہ اس کی ملازمت ختم ہو گئی اور پنشن بھی جاتی رہی۔ اسی دور میں عارفہ ایک شب کسی ہوٹل میں شراب پیتی ہوئی ساتھیوں سمیت پکڑی گئی۔ پولیس کا اچانک چھاپہ خدائیر ٹاؤنٹ کے موقع پر پڑا تھا۔ تمام احوال اخباروں میں چھپ گیا۔

ان دنوں مرغوب علی کے اپنے دونوں بھائیوں سے وابط ہوئے مگر شرمندگی کے مارے وہ کسی سے نہ مل سکا۔ ہمیشہ ملاقاتوں سے پہلو تکی کرتا رہا۔ پھر کچھ وقت کے لئے ملک سے باہر چلا گیا۔ بیوی کی بدنامی کے باعث بھی

وہ منظر سے غائب رہنا چاہتا تھا۔ اسی مدت کے دوران دو المناک واقعات ہوئے جن کی وجہ سے خاندان لرز کر رہ گیا۔

بڑے بھائی محبوب علی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر کی زینت بن گیا جبکہ منجھلا بھائی بریگیڈیئر یعقوب علی ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کی کارنگسی ٹرک سے لکرائی تھی۔ اس ایسے میں زبیرہ یعقوب بھی انتقال کر گئی۔ بیٹا کچھ عرصہ ہسپتال میں پڑا رہا مگر جاں نہ ہو سکا۔ بھرے خاندان میں صرف ایک بیٹی زندہ بچ سکی، جسے بتایا نے اپنی پناہ میں لے لیا۔

مرغوب علی کو اپنی برطرفی کا زیادہ غم نہیں تھا، نہ ہی اس بات کا کوئی تعلق تھا کہ اس نے اپنے اس وطن سے غدارئی کی تھی جس کے چاہنے والوں کا لہو اس نے اپنی آنکھوں سے بہتے دیکھا تھا اور جن کے بدن سے پتے ہوئے لہو پر اس نے حسب الوطنی کے پھاہے رکھنے کی قسم کھائی تھی۔

اس کے پاس حرام کا پیر۔ بے شمار تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے مال و زر میں برکت نہیں ہوتی اور یہ اولاد میں نفاق اور فساد کا باعث بھی بنتا ہے۔ کبھی یہ دگنی رفتار سے نکل جاتا ہے۔ مرغوب علی جلد ہی مالی خدشات میں گھر گیا۔ اس نے اپنے خفیہ بینک اکاؤنٹ کا جائزہ لیا جس میں اس کا بھائی چوہدری محبوب علی مشترکہ جائیداد پر منافع بصورت زر منتقل کیا کرتا تھا۔ اکاؤنٹ میں خاصی رقم موجود تھی مگر خدشات کے پہلو بھی کم نہیں تھے۔ بسبب سے اس کے بھائی پر فالج کا حملہ ہوا تھا، اکاؤنٹ میں مزید منافع جمع نہیں کرایا گیا تھا۔ ایسے میں مرغوب علی کا ہاتھ ٹکنا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے معاملہ ذہن میں رکھ لیا اور موجود پیسے کے مصرف میں مشغول ہو گیا۔

اس نے ایک پوش علاقے میں مکان خریدا اور بیوی بچوں کے ساتھ اس میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ کوئی



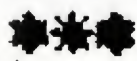
علی کا بڑا صاحبزادہ جو ادعلی کا بیٹا ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں وہ متعلقہ کاغذات میں بھی ہیرا پھیری کر چکا تھا۔ لیکن وہ پیچیدہ گیاں پیدا ہو چکی تھیں جن سے نبرد آزما ہونا کار دشوار دکھائی دیتا تھا۔ مرغوب علی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ واحد شخص تھا جو یوں متاثر ہوا تھا کیونکہ ہر گیندیر مرحوم یعقوب علی کی بیٹی اب جو ادعلی کی بیوی تھی اور اس طور وہاں جا کھانا کا جھگڑا نہٹ چکا تھا۔

جلد ہی ایک ایسے خاندان کے بیچ عدالتی جنگ کا آغاز ہو گیا جو کبھی باہمی غم و سوں پر فخر کیا کرتا تھا اور جس کے افراد ایک دوسرے کے درد آشنا سمجھے جابا کرتے تھے۔ تب معاشرے میں نفسانفی کا عالم نہیں تھا اور انسانی اقدار کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

ٹریسٹ کی پروڈکشن کمپنی تو چل نکلی مگر اس کی بیٹیوں کی تربیت کا معیار مکمل کر سامنے آ گیا۔ کئی ایسے واقعات ہوئے جن کے باعث خاندان پر بدنامی کے داغ لگتے گئے۔

مرغوب علی نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور قانون کی تعلیم میں ڈگری لینے کی جستجو شروع کر دی مگر اس کی یہ تمنا تکمیل کے مراحل سے ہمکنار ہو سکی۔ آخر کار وہ اولاد اور بیوی کا دست بھر بن کر رہ گیا۔ کبھی کسی ذرا سے میں اداکاری کے جوہر دکھانے کی کوشش کرتا تو اس کا ماضی اسے ستانے لگتا۔

اس خاندان اور قوم کا خدای حافط ہے جس کے احساسات مرنے لگیں اور احساس زیاں ہی جاتا رہا ہے۔ یہی ہماری اس قوم کا المیہ رہا ہے کہ اس نے اپنی اعلیٰ اقدار کھو ڈالی ہیں اور اس کی رہنمائی استحصالی طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، جس نے قوم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔



کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صنعت کار اور تاجر جو کبھی اس کے گن گاتے تھے، اسے ہاتھوں ہاتھ تیل کے اور سرمایہ بھی بہتیرا میسر آ جائے گا مگر یہ دنیا تو جڑھتے سورج کی پوجا کرتی ہے۔ وہ جانے والوں کا انتظار کرتا رہا مگر جان پہچان والے اکثر لوگوں نے اس سے آنکھیں پھیر لیں۔

مرغوب علی اولاد نہ رہے سے مرحوم رہا تھا۔ اس کے ہاں تین بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ والدین کی اشکال اور نقوش برے نہیں تھے مگر قیوں بیٹیاں کالی بھنگ تھیں۔ ان کے ماتھے چھوٹے اور عکس چھٹی تھیں۔ چہرے بھی قد و قامت کے حساب سے غیر متوازن تھے۔ حرام کے پیسے سے اولاد کی مناسب تربیت نہیں ہوتی۔ وہ تعلیم میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں۔ قص و موسیقی میں البتہ انہوں نے سوجھ بوجھ پیدا کر لی۔

ٹریسٹ کا ارادہ تھا کہ ٹی وی ڈرامہ پروڈکشنز کے لئے کمپنی بنالی جائے اور اس کا نظم و نسق وہ خود سنبھال لے۔ مرغوب علی شروع میں تو منصوبے کی مخالفت کرتا رہا مگر بعد میں اس پر قائل ہو گیا۔ اب وہ خاندانی اقدار پر زیادہ نہیں سوچتا تھا۔

خاندانی جائداد میں سے اپنا حصہ وصول کرنے وہ چوہدری محبوب علی کے گھر پہنچا تو وہاں کے معاملات دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

چوہدری محبوب علی جو صاحب فرش تھا، ایک الگ تھلگ کمرے میں پڑا تھا۔ گو اس کی دیکھ بھال پر گھریلو ملازم ماسور تھے مگر وہ بہت ناتواں ہو چکا تھا بلکہ زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ نہ تو وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی جسمانی حرکت کر سکتا تھا۔ مرغوب علی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اسے وہاں فقط مایوسی ڈیرے ڈالے نظر آئی۔

بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اسے شدید دھچکا لگا۔

معلوم ہوا کہ تمام خاندانی جائداد پر چوہدری محبوب



## بیکر بعد... نہ رکنی مسلم دشمنی اور اس کے انجام کا قصہ

جگن ناتھ اپنے ماتحتوں خصوصاً مسلمانوں کے معاملے میں  
انتہا سخت تھا کہ حملے نے اس کا نام لال بخار رکھ دیا تھا۔



# لال بخار

— بابہ امیش

— بابہ امیش

جانے یا رخصت پر جانے پر اس کی جگہ کام کرنے بھیجا جا رہا تھا۔ سیارٹی کی بناء پر اس کو ایک بڑے سٹیشن پر تعینات کر دیا گیا تھا جہاں وہ دیا انداری سے اپنی ذیولٹی انجام دے رہا تھا۔ اس سٹیشن پر لوگوں کو درکشاپ تھا جہاں انجنوں کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ ہوتی تھی۔ اس جگہ کے تمام اعلیٰ افسر اینگلو انڈین تھے جن کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنی ہوئی تھی۔ اس میں خوبصورت بنگلے اور پختہ سڑکیں تھیں جو ہمیشہ صاف ستھری رکھی جاتی تھیں۔

اس ڈویژن کا اسٹنٹ انجینئر ایک کٹر، متعصب اور سخت گیر ہندو جگن ناتھ تھا جو چیف انجینئر کا منہ بڑھا اس لئے ترہا کہ بے حد سختی تھا اور ضرورت پڑنے پر دو افسروں کا کام اکیلا نمٹا لیتا تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس کی پہلی ہی کام ہے اور صرف کام۔ ہر بات پر کتہ گیتی اور ہر کام میں کیڑے نکالنا اس کا شعار تھا۔ لوگ چاہت تھی جانتی تھی سے کام کرتے مگر وہ ایک لختہ تر جھب کا منہ ہے

ساجد کی اور میری دوست بہت پرانی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ہماری راہیں جدا ہو گئیں لیکن دوستی اور خط و کتابت برقرار رہی۔ ساجد ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ اپرٹنس شپ کا کورس کرنے کے بعد سب انسپکٹر بن گیا جس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ ریلوے لائن کی دیکھ بھال کرے، اس کو درست حالت میں رکھے اور جب ضرورت ہو مرمت کروااتا رہے۔ اس کو ٹرائی ملی ہوئی تھی اور چار ٹرائی مین جو ریل کی اڑھائی تین انچ چوڑی پٹری پر دوڑ کر دھکیلنے کے بعد ٹرائی کے پچھلے حصے میں مختصر سے ایک اپنی ڈنڈے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ساجد کے زیر نگیں طویل علاقے کی نسبت سے مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد اس کے ماتحت تھی۔ یہ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔

دس سال کی ملازمت کے بعد وہ سب سے سینئر ہو گیا تھا اور ایکٹو اپنے ڈویژن میں کسی انسپکٹر کے بیمار ہو

READING  
Section



حکم کے خلاف براہ راست اپیل کی تو جگن ناتھ اور آتش زیر پا ہو گیا۔ اپیل کا تو کچھ نتیجہ نہ نکلا مگر اس کے بعد جب جگن ناتھ دورے پر آیا تو وہ ساجد کی جان کو آگیا نہ وہ براہ راست چیف انجینئر تک کیوں پہنچا اور طعنہ دیا کہ تم اتنے بڑے آدمی ہو کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنی افسروں سے بات کرتے ہو۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس ہندو نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر ہی چھوڑا۔ ہوا یہ کہ ساجد کے ایک ٹرائی مین اور ایک مزدور میں معمولی بات پر آن مین ہو گئی اور مار پیٹ تک فوج پھینچ گئی۔ جگن ناتھ نے یہ الزام عائد کر کے کہ ساجد کے اکسانے پر ٹرائی مینوں نے مزدور کو پیٹا ہے، ساجد کو معطل کر دیا۔ جب باقاعدہ انکوائری ہوئی تو یہ الزام ثابت نہ ہو سکا اور ساجد کو بغیر کسی سزا کے بحال کر دیا گیا۔ اس سے جگن ناتھ کی مخالفت دشمنی میں تبدیل ہو گئی اور وہ اس ٹوہ میں لگ گیا کہ کوئی بڑا الزام لگا کر ساجد کو ہر طرف کرا دے۔ خود تو ابھی اس عہدے پر تھا نہ کبھی اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے اس لئے مجبور تھا۔ صرف سفارش ہی کر سکتا تھا۔ اگر بااختیار ہوتا تو شاید کبھی کا ساجد کو ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔

ساجد احتیاط، محنت اور جانفشانی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ ریٹروے کے عملے میں سے بھی اس کو ہم صحبت مل گئے تھے اور شہر کے بھی کئی شرفاء سے اس کی شناسائی ہو گئی تھی۔ شہر میں ایک بزرگ کا بھارت تھا جہاں وہ جمرات کو فاتحہ پڑھنے چلا جاتا اور وہیں مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ اس طرح شہر میں بھی کئی ایک سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ ساجد سے میری خط و کتابت برابر جاری رہی۔ ہم دونوں کوئی تاریخ مقرر کر لیتے اور اکٹھے خوبہ غریب نواز کے عرس میں شرکت کرتے تھے۔ ہم نے متواتر سات سات سال خوبہ غریب نواز کے عرسوں میں

نہ نکلتا۔ ماتحت کی ذرا سی کوتاہی پر اس کی تنزیل کر دیتا۔ بعض اوقات کسی بہانے کی آڑ لے کر سزا بھی دے دیتا۔ اب کوئی مفروضہ قائم کر کے زیر عتاب لے آتا۔ غرض اس نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ لوگ اس سے خوفزدہ رہتے تھے اور اس کا نام لال بخار رکھ دیا تھا۔ جب کبھی وہ انسپکشن پر آ جاتا تو لوگ ایک دوسرے کو خبردار کر دیتے کہ لال بخار آیا ہوا ہے محتاط رہیں۔

ایک مرتبہ کوئی انسپکٹر ایک ماہ کی رخصت پر گیا تو اس کی جگہ ساجد کو بھیجا گیا۔ اتفاق سے جگن ناتھ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ ساجد کے گھر سے اطلاع آئی کہ رات کو اس باڑے میں آگ لگ گئی تھی جس میں اس کی بیٹن بندھی رہتی تھی۔ کسی نے شاید لاپرواہی سے جلتا ہوا سگریٹ پھونس کے چھپر پر پھینک دیا تھا جو بھڑک اٹھا۔ بیٹنیں چونکہ لوہے کی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اس لئے اس کو نہ توڑ سکی اور جل کر مر گئی۔ شعلے اتنے اونچے اٹھ رہے تھے کہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مکان کو لپیٹ میں لے لیں گے۔ ساجد کے گھر والے حذر و جد و ہشت زدہ تھے۔

اس اطلاع پر ساجد نے جگن ناتھ سے ایک دن کی رخصت کی درخواست کی تاکہ گھر والوں کو دلاسا دے آئے مگر جگن ناتھ نے اس کو جھڑک دیا۔ ساجد نے محسوس تو بہت کیا مگر مجبور تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ساجد بیماری کی رپورٹ کر کے گھر چلا آیا۔ اس کی یہ حرکت جگن ناتھ کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھی اور وہ ناراض ہو گیا۔ فوری طور پر تو کچھ اس لئے نہ کر سکا کہ کارروائی قانون کے مطابق تھی مگر ساجد کے خلاف اس کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ روزانہ کام سرانجام دینے کی ڈاڑھی جو ہر ماہ ساجد کی جاتی اس پر سخت نکتہ چینی کرتا اور خواہ مخواہ کی دھمکیاں دیتا۔

ایک دفعہ غلط الزام لگا کر اس کی محواہ کی سالانہ ترقی پچ ماہ کے لئے رکوا دی۔ ساجد نے چیف انجینئر سے اس

READING  
Section



ساجد گاڑی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جب اس نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص مجھے ہرگز داخل ہونے نہ دے گا تو اس نے تڑپا کر کہا کہ اچھی کیس پھینک کر



ہور چیف انجینئر کے دفتر پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع ہیڈ کلرک کو دی جو ہندو تھا۔ اس ہندو نے چھوٹے ہی کہا کہ تم نے ٹرائی مین کی ٹانگ تو زدی ہے۔ چیف انجینئر کو مطلع کیا گیا جس نے ساجد کو سٹیشن پر ٹرائی کے پاس ملنے کا حکم دیا۔ ساجد واپس آیا اور مین گیٹ پر اس کا منتظر رہا۔

چیف انجینئر اور جگن ناتھ کار سے وہاں پہنچے۔ چیف انجینئر نے دریافت کیا کہ ٹرائی کس جگہ ہے۔ ساجد نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا اور خود بڑی مستعدی اور لاسے لاسے ہموار قدم رکھتے ہوئے ان کی رہبری کے لئے آگے آگے چلنے لگا۔ جگن ناتھ کو تو یقیناً یہ بڑی گستاخی معلوم ہوئی کہ ان کا ماتحت ان سے آگے آگے چل رہا ہے مگر ساجد کو اندازہ تھا کہ انگریز تو مستعدی، محنت اور حقیقت پسندی اور چاق و چوبند رہنے کا قائل ہے۔ اس نے ساجد کی چال ہی سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ وہ قصور وار نہیں ہے۔ اس نے دو تین سوال کئے۔ چلتی ٹرائی پر بیٹھنے کا عملی مظاہرہ دیکھ کر ساجد کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ جگن ناتھ کی زک پہنچانے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی لیکن وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے چیف انجینئر پر زور دے کر ساجد کا تبادلہ دوسرے ڈویژن میں کرادیا۔

اب ستم ظریفی دیکھئے کہ جگن ناتھ بھی ترقی پا کر بطور ایگزیکٹو انجینئر اسی ڈویژن میں آ گیا۔ یہاں چونکہ وہ باختیار تھا اس لئے اس کو انتظام لینے کی سوجھی۔ اس نے ساجد کا تبادلہ اپنے ہیڈ کوارٹر سٹیشن پر کر دیا مگر تنزی کے ساتھ تنزی اس معنی میں کہ پہلے وہ انچے گریڈ کے لوگوں کی جگہ کام کرنے بھیجا جاتا تھا مگر اس کو اب اپنے گریڈ کے لوگوں کی جگہ کام کرنے کے احکام جاری کر دیئے اور یہ قید بھی لگا دی کہ جب وہ باہر نہ جائے تو اس کے دفتر میں حاضر رہے۔ مکان جس کا وہ حقدار تھا اس پر ہیڈ کلرک نے پہلے ہی سے قبضہ جمارکھا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا مکان اس کو رہنے کو ملا۔ اس نے اس کو

ہی خیمت جانا۔ قریب میں ایک مسلمان اور سہر رستہ تھے۔ جگن ناتھ نے تو بطور سزا ساجد کو اپنے ہیڈ کوارٹر پر رکھا تھا مگر اس کے حق میں یہ بات بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ دو ماہ بعد ہی پاکستان قائم ہونے کا اعلان ہو گیا۔ ہندو مسلمان کی مخالفت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندو تو ہمیشہ ہی مسلمان کا دشمن رہا ہے۔ متعدد مقامات سے کشت و خون کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ریل گاڑیوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی مرضی معلوم کی جا رہی تھی کہ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں یا وہیں رہنا چاہتے ہیں۔ اسی اثناء میں ہیڈ کوارٹر سے ساجد کی ترقی یعنی انسپکٹر بنا دیا جانے کے احکام ہیڈ آفس میں جس کا بہرہ جگن ناتھ تھا، موصول ہوئے اور یہ بھی کہ اس کو اسی سٹیشن پر تعینات کیا گیا ہے۔ جاننے والے اس کو مبارکباد پیش کرنے لگے۔ ساجد کے بچوں کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ بار بار انسپکٹر کے خوبصورت بیٹے کا چکر لگاتے کہ اب وہ ان کی رہائش گاہ ہوگی۔ ساجد نے اس خیال کے تحت کہ اُسے ترقی ملنے والی ہے اور پاکستان میں اس کو اسی عہدے کا حقدار سمجھا جائے گا عارضی طور پر تین ماہ کے لئے ہندوستان ہی میں قیام کرنے پر رضامندی دے دی۔

دن پر دن گزرتے رہے مگر احکام آج ملتے ہیں نہ کل جگن ناتھ احکام کو دبائے بیٹھا رہا اور ان کی تعمیل نہ کی۔ اسی دوران ساجد کو کام کرنے باہر جانا پڑا۔ وہاں سے فارغ ہو کر واپس آیا تو سٹیشن پر کسی نے اس کو مطلع کیا کہ سابق ڈویژن میں ایک انسپکٹر رخصت پر جا رہا ہے اور اس کو اس کی جگہ کام کرنے جانا ہوگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ قاعدے کے بموجب ڈویژن میں جو شخص سینئر ہوتا تھا اس کو بھیجا جاتا تھا مگر اس کجحت جگن ناتھ نے ایسا چکر چلایا کہ ساجد کو دوسرے ڈویژن میں جانے کے احکام ملے۔ وجہ یہ سمجھ میں آئی ہے کہ وہاں جانے کے لئے



# آخر کی سلام

مشرقی پاکستان کے میدان جنگ سے



○ میجر آفتاب احمد کی چشم کشا تحریر

○ وفادار کون، سب ہی باغی تھے

○ جنرل کے قلعے سے ملکہ کی جیل میں

○ ناقابل یقین، انوکھا اور منفرد "جرم و فساد"

1958ء اور 1971ء کے بارش لاکھوپاکستان کے دو اہم ترین ہونے کا سبب۔ پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور اس کی صفوں میں کردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلف کے تقاضوں کے عین مطابق ملک میں ایک اور انسانی اور عوامی انتشار کے نکتہ آغاز جنرل فیاض الحق کے تیسرے بارشل لاء کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی عدیم المثال روایت ڈالنے کی جرأت برداشت کی۔ اس ناقابل یقین، انوکھے اور منفرد "جرم و فساد" میں دو جہیں دو اس کے مستحق ٹھہرے۔ ایک جمہوریت کی بحالی کے بعد ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرمِ تعمیر میں نہ کم وقت بلکہ ظہر بھنوں نے بھی انہیں تین سال باقاعدہ سندھ کی جیلوں میں اس لیے رکھا۔

تقریباً 500

ملنے کا پتہ

مکتبہ داستان - ماہنامہ حکایت

ریاست بھرت پور سے گزرنا پڑتا تھا جہاں کے لوگوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کسی مسلمان کو زندہ اور ان کے سامان کو صحیح سلامت نہ گزرنے دیں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ جتن ناتھ ساجد کی جان کے درپے تھا۔ ساجد اس سازش کو ناکام کیا اور گاڑی سے اترتے ہی سیدھا ہسپتال پہنچا۔ وہاں کے مسلمان کمپاؤنڈر کے ذریعے ہندو ڈاکٹر سے پندرہ روز کا بیماری کا سرٹیفکیٹ لے کر گھر بیٹھ گیا۔

ترقی کے احکامات نہ آنے تھے نہ آئے۔ ایک روز ایک مسلمان اسسٹنٹ انجینئر شیشن پر آئے اور انہوں نے سب مسلمانوں کو براستہ بھرت پور حیدر آباد سندھ کے ریلوے پاس حوالے کئے اور نصیحت کی کہ آپ لوگ پاکستان چلے جائیں تو بہتر ہے اور وہ بھی وہیں جانے والے ہیں۔ پاسوں میں ایک ماہ کی میعاد رکھی گئی تھی۔ اب مسلمان سر جوڑ کر بیٹھتے اور تہہ پیریں سوچتے۔ بھرت پور کے راستے تو جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایک نے تجویز پیش کی کہ مسلمان فوجیوں کے ساتھ جو وہاں تھے نکل جانا محفوظ رہے گا۔ فوجیوں میں نصف تعداد مسلمانوں کی تھی اور نصف ہندوؤں اور سکھوں کی۔ مسلمانوں کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ ہتھیار جمع کرادیں اور چلے جائیں جس پر وہ راضی نہ ہوتے تھے اور ہتھیار ساتھ لے جانے پر مصر تھے اور ان کا چیلنج تھا کہ کسی میں ہمت ہے تو ان سے زبردستی ہتھیار رکھوالے۔ اس طرف سے بھیما یوسی ہو گئی۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ وقت نکلا جا رہا ہے روانگی کی تاریخ مقرر کر لی گئی۔ اس کو خفیہ رکھا گیا اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ کس راستے سے جائیں گے۔

مقررہ تاریخ پر سب لوگ ریل میں سوار ہو گئے۔ ہندوؤں کو بڑا تعجب تھا کہ جس راستے کے پاس ان کو دیئے گئے تھے اس کے بالکل مخالف سمت وہ لوگ جا رہے تھے۔ یہ خبر ملی تھی کہ جھانسی شیشن پر مسلمانوں سے بھری ہوئی پوری ٹرین کا منسحابا کر دیا گیا ہے اس لئے وہ راستہ چھوڑ کر الٹ

READING  
Section



اس علاقے میں صورت حال گوتشویشٹاک نہ تھی مگر حفظ مانتھام کے طور پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ لوگ مسافر خانے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ ضروریات کی تمام چیزیں قریب ہی دکانوں پر دستیاب تھیں۔ خریداری کے لئے دور جانے کی حاجت ہی نہ تھی۔ البتہ عید الفطر کے موقع پر نماز پڑھنے کی غرض سے ضرور کچھ دور جانا پڑا جو کڑکٹ کے میدان میں ادا کی گئی۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہاں تجارت پیشہ مسلمانوں کے بچے "ہندوستان مانٹر" کے پانے پر چوں کے اوراق ایک ایک آئے فروخت کر رہے تھے جن کو خرید کر مسلمان جائے نماز کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

اس دن بعد ہمیں پاکستان جانے سے لئے جیل ڈرگا  
نامی جہاز میں جگہ ملی بود و سال تک سمندر کی تہہ میں پر رہا  
تھا اور جس کو نکال کر مرست کر کے سفر کے قابل بنایا گیا  
تھا۔ کچھ لوگ اس جہاز میں جانے سے ڈرتے تھے مگر  
مجبوری نے ان کو اس پر سوار کروا ہی دیا۔ سب کو جگہ کشادہ  
مل گئی۔ جب اطمینان ہوا تو لوگ مختلف مشاغل میں لگ  
گئے جن میں ایک ٹولی ماش کھیلنے والوں کی بھی تھی۔ اتفاق  
سے آٹمی رات کے وقت جہاز بیچ سمندر میں رگ گیا۔  
جہاز بندہ واقف سے چونک لہگ واقف تھے اس لئے ان کو  
تشویش لاحق ہوئی۔ خصوصاً خواتین بہت خائف تھیں۔



## مکافات

کہتے ہی منہ زور اٹھ رہے جوانوں نے اپنی جوانی طاقت اور اختیار کے زعم میں معصوم جوانیوں کو تاراج کیا اور بدلے میں کچھ معاوضہ دے کر سمجھا کہ قیمت ادا ہو گئی اور کبھی تو معاوضے کی بھی زحمت نہ کی لیکن مکافات عمل سے نہ بچ سکے اور بدلہ ان کی عورتوں کو دینا پڑا۔



☆ ..... امجد عنایت

ضرورت مندوں کی مدد کرنے والے بھی عمر پاتے ہیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ائمہ دین ہیں قرآن و حدیث سے کچی بات اور کیا ہوگی۔ اسی طرح ظلم کرنے والا ایک دن غیرت کا نشان بن جاتا ہے زانی محتاج ہو جاتا ہے اور غرور کا سر ایک دن نیچ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار ایسا نہیں بھی ہوتا تو اس کی وجہ برائی کے معاملے میں توبہ یا کوئی

دنیا میں غیر محسوس طور پر مکافات عمل کا قانون جاری و ساری ہے ہر انسان کے اچھے اور برے اعمال کے اثرات اس پر، اس کے متعلقین اور معاشرے پر مرتب کرتا ہے اور انسان کی تقدیر میں بھی تبدیلی اسی کے تحت آتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ زکوٰۃ دینے والے کا عموماً نقصان نہیں ہوتا، جس بچوں کا عقیدہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش قسمت اور خوشحال رہتے ہیں، صلہ رحمی اور

READING  
Section



ہیں اور جاسوسی کی رگ تو ہر عورت میں ہوتی ہے جبکہ خوبصورت مردوں کی بیویوں میں تو یہ رگ نہیں ایک سے زائد ہوتی ہیں۔ بیوی کو پتا چلا تو اس نے بہت ہنگامہ کیا۔ زیب کے سسرال والے زبردست قسم کے لوگ تھے۔ بات طلاق اور کورٹ کچہری خرچے جرمانے اور بچوں کی کفالت تک پہنچی۔ زیب کو بچے بھی ماں کو دینے پڑے اور خرچہ بھی۔ یہ سزا بہت بڑی تھی مگر زیب پھر بھی نہ سدھرا۔

اب اس نے پیشہ درمختاروں کے پاس جانا شروع کر دیا انہی میں سے ایک چالاک حرافہ نے اپنے حاملہ ہونے کی اداکاری کر کے زیب کو دھمکیاں دے کر نکاح پر مجبور کر دیا۔ خاندان والوں کو پتا چلا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کا بایکات کر دیا۔ مالی مشکلات کا شکار ہو کر اس نے مجبوراً اسے طلاق دے دی اور خاندان والوں نے اس کی تیسری شادی خاندانی لوگوں میں کرادی اور اب وہ ایک بظاہر آسودہ زندگی گزار رہا ہے لیکن طوائف سے اسے جو بچی ہوئی تھیں جوان ہوتے ہی اس کی ماں نے اسے دھندے پر بٹھا دیا اور زیب سب کچھ جانتے سمجھتے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔ بیٹی بیوی سے ہونے والا بچہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے کیونکہ اسے ایک دن بھی باپ کا پیار نہیں ملا۔ بچی نے اس کا پیار پایا تھا مگر وہ سسرال کی وجہ سے بے بس ہے جو کہ اس کے ننھیالی ہی ہیں وہ چاہے کے باوجود اس سے مل نہیں سکتی۔ ماں تیسری بیوی سے ہونے والی اولاد اس کے پاس ہے اب آپ خود ہی حساب لگائیں کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا اور وہ کس کس طرح قانون مکافات کی زد میں آیا اور جوانی کی عیاشیاں اسے کتنی بھاری پڑیں۔

بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے باپ نے کمال کو کاروبار پر رکھی اختیار دے رکھا تھا۔ کپڑے کا ٹھکانہ کاروبار تھا اور آمدنی کا کوئی حساب نہیں تھا۔ پھر باپ نے اسے پاور لومز بھی لگا دیں اور اپنی خوبصورت

ٹکی ہو سکتی ہے اور ٹکی کے معاملے میں ریاکاری فخر یا ہنسی۔ پھر بھی اگر یہاں اچھے برے عمل کا بدلہ نہ ملے تو آخرت میں ضرور ملے گا بطور مسلمان یہ ہمارا ایمان و یقین ہے۔ ذیل میں ہم کچھ ایسے ہی سچے واقعات بیان کر رہے ہیں جن میں یہ قانون واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہے البتہ بعض تکلیفیں آزمائش ہوتی ہیں جو نیکوں کو بھی ہو سکتی ہیں۔

زنا آج کل بہت عام ہو گیا ہے کیونکہ اس کے لئے سہولت پیدا کر کے والے کئی شیطانی ذرائع ایجاد ہو گئے ہیں ہر دور میں اس کی تباہ کاریاں الگ انداز میں نظر آتی ہیں۔ یہ ایسا گناہ ہے جس کے برے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی پر سب گناہوں سے زیادہ ہوتے ہیں جو کئی کئی نسلوں تک پھلتے ہیں۔ یہ تو عام سی بات ہے کہ بڑے بڑے معزز لوگ اپنے نطفے بازار حسن کی طوائفوں کے رحم و کرم پر پورے آتے ہیں اور ان سے بوجھیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ان کو بھی دھندے پر بٹھا دیتا ہے کیونکہ ان کا تو یہ کاروبار ہے اور اگر بچے پیدا ہوتے ہیں تو وہ بھی وہاں دلالی بنتے ہیں یا بدعاشی بن کر رہتے ہیں اور کبھی کبھی قدرت ان کے گناہ کا انتقام یوں بھی لیتی ہے کہ بھائی بہن کا یا باپ ہی بیٹی کا خریدار بن کر رہتی جاتا ہے۔

زیب کو اللہ نے شکل مشکل اور دوست سے خوب نوازا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں سے گزرتا گوریاں آئیں بھرتیں اور اس کی اک نظر التفات کی منتظر رہتیں۔ زیب نے بھی اپنے رنگ روپ کا خوب فائدہ اٹھایا اور جوانی بڑی رنگین گزاری لیکن اس کی شادی حادثاتی طور پر اسی عورت سے ہو گئی جو کہ عمر میں تو اس سے آٹھ دس سال بڑی تھی ہی اس کا رنگ بھی پکا تھا اور تھیں بھی قبول صورت خاندانی دباؤ باعث زیب نے اسے قبول تو کر لیا مگر یہ کوئی جوڑ نہ تھا پھر نو خیز جوانیاں اب بھی اس کی راہ میں آنکھیں بھرتی تھیں نتیجہاً وہ پھر بہک گیا۔ ایسی باتیں کب چھوڑ

READING  
Section



(حضرت علیؑ)

پھر اسے عزیزوں کی مدد سے دینی بھجوا دیا تو حالات کچھ بہتر ہونے لگے۔ بچیوں نے گھر میں ٹیوشنیں پڑھایا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھی نوکریاں حاصل نہیں کر سکا۔ کمال کے دن پھر رے مگر میاں بیوی کی نبوتانی حالات کا ایندھن بن گئی اور پہلی بیوی نور اس کی ادا ہو بھی گئی۔

یہ بارل شہری بن گئے۔ بیوی انہی مساکین کے ہاں

کشمیر کا شکار ہو کر سر گئی اور بچے معاشرے کے مفید شہری بننے کی بجائے خود بھی مساکین کا شکار بنے اور دوسروں کو بھی کیا۔ ان کے رشتہ دار بھی ہمارے جیسے تھے اور

میں ہی وہ خانہ بدوش صبر داری، یک شخص کی غلطیوں کی سزا داری وغیرہ بن گئے تھے۔ بلکہ ڈاکو اور متعلقین بنے بھی پالی

یاد رہے کہ قاضی کا شکار ہونے اور معاشرے کے ایسے

مہربان بننے

بصرِ آغا: توانی بہت ہی سزاوارست، جذبات کا  
حامل تھا جن کو ٹھنڈا کر دینے کے لئے اس نے اپنے لڑکے کو  
مزدعورت اپنے پرانے کسی کپڑے میں تھپتھپاتے رہنے دیا ہے  
کہ وہ اس قدر بدنام ہوا کہ عابدان تو کیا بزمِ قادری میں بھی  
کسی نے اسے رشتہ دینے کی ہائی نہ بھری حتیٰ کہ اس کی  
شادی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی جو کنواری مالِ بے مالہ  
تھی اور اپارشن کرا کے اس کو رشتہ دے دیا گیا جو اس نے  
مجبوراً قبول کر لیا لیکن اس اپارشن میں کوئی ایسی پیچیدگی  
پیدا ہو گئی کہ دو بارہ اُمید ہوتے ہی اس کا جلد پریشہ شریف  
کر جاتا اور بچہ خود بخود ضائع ہو جاتا۔ بڑی منتوں  
مرا دوں کے بعد ایک بچہ زندہ سلامت پیدا ہو گیا لیکن اس



کے بعد کبھی کوئی بچہ منزل تک نہ پہنچ سکا۔ اکلوتا بچہ بھی ابتدائے جوانی میں ہی باپ کے نقش قدم پر چل نکلا۔ ایک دن اس نے نہالے مکے لئے نہر میں جو چھلانگ لگائی تو وہاں پانی شاید کم تھا یا ز میں سخت تھی کہ اس کا سر حسب زور سے زمین سے ٹکرایا تو ریڑھ کی ہڈی میں فریچر آگیا اور وہ کچھ عرصہ مفلوج رہنے کے بعد فوت ہو گیا اور نہ صر کو ہمیشہ کا روگ دے گیا۔

مظفر کا حال بھی ماضی سے ملتا جلتا تھا اور انہی وجوہات کی بناء پر اس کا رشتہ بھی نہ ہو سکا ایک دفعہ اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی گھر سے بھاگ لی لڑکی کی مرضی شامل تھی اور یہ موٹر سائیکل پر تینوں آ رہے تھے کہ تعاقب کے خدشے اور پکڑے جانے کے خوف کے باعث گھبرا کر ایک رکشے سے ایکسپڈنٹ کر بیٹھے دوست اور لڑکی تو بچے گئے مگر اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دوست نے لڑکی کو واپس بھیج دیا اور اسے ہسپتال لے گیا۔ ٹانگ بڑ تو گئی مگر صحیح نہیں کہ وہ اب بھی لنگرا کر چلتا ہے۔

اظہر پیدائشی حرامی تھا ہر راہ چلتی لڑکی کو چھیڑنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ گالیاں جوتے بھی کبھی اسے مشن سے نہ ہٹا سکے اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو جتنی خوبصورت اور خوشخیز تھی اتنی ہی بد زبان اور بد کردار تھی اور شادی کے کچھ ہی عرصے جب اس نے پر پڑنے سے نکالے اور گھر پر مٹی لوگوں کو بلانا شروع کر دیا تو اظہر نے احتجاج کیا بیوی نے دھمکی دی کہ میں اپنے یاروں سے تمہیں قتل کرا دوں گی نتیجہ یہ کہ وہ اب اپنی آنکھوں سے سب کچھ ہونا دیکھتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ یہ بھی مکافات کی ایک شکل ہے۔

فراز کے اپنی کرن کرن کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے جبکہ کرن کے فراز کے علاوہ بھی کئی لڑکوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ کرن کا تعلق کسی قدر غریب گھرانے سے تھا اس کی شادی ایک غریب گھرانے کے نیم معذور شخص سے

ہوئی فراز اس وقت اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں ہو گئی۔ شادی کے بعد کرن کی دوستیاں ختم ہونے کی بجائے بڑھ گئیں اور جب اس نے اسے آمدنی کا ذریعہ بنالیا تو شوہر کا احتجاج نہیں کیا ہوتے ہوئے ختم ہو گیا۔ فراز سے بھی اس کے تعلقات بدستور قائم تھے جس کا علم اس کی بیوی کو ہوا تو اس نے احتجاج کیا فراز نے اس کا خرچ بند کیا تو اس نے بھی رد عمل میں شادی سے قبل کے کسی یار سے دوبارہ تعلقات قائم کر کے اپنے خارا جات چلانے شروع کر دیے جب یہ فراز پر کھلا تو اس نے طلاق دے دی بیوی عدالت جا پہنچی اور خرچ کسے کیس کے ساتھ ساتھ مار پیٹ اور سسرالیوں پر دست درازی کا کیس بھی کر دیا گرفتاری اور سزا و خرچے سے بچنے کے لئے فراز طلاق سے ٹکرایا اور بیوی کو گھر سے آیا اور کرن سے بھی اس کی ایما پر اپنے شوہر سے خلع کرنے کو کہنے لگی۔ لے اور فراز سے نکاح کر لیا اور فراز کی اجازت سے بڑا نا دھندہ منظم طریقے سے شروع کر دیا پہلی بیوی بھی واپس کے بعد سے خود مختار تھی اور اس پر کسی قسم کا کنٹرول اب فراز کا نہ تھا بچے پالنے کے لئے اس نے مریوں کی طرح دکھ داری شروع کر دی جبکہ فراز وہ بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی دراصل کسی کا شوہر نہیں ہے اور اپنی جان کو کئی اعلانات روگ لگا چکا ہے مکافات عمل نے اسے عبرت کا نشان بنا سکے رکھ دیا ہے۔

کامی نے شاید ہی کسی لڑکی کو چھوڑا ہو جب اس کی شادی ہوئی تو علم ہوا کہ بیوی بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ادھر ادھر تو اس کے کئی بچے تھے مگر گھر میں بچہ نہ دیکھ کر بڑا بد دل ہوا دوسری شادی یا طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ سسرالی بڑے زور آور تھے مجبوراً بھائی کا ایک بچہ گود لے لیا تو وہ ایک ایکسپنٹ میں فوت ہو گیا پھر اس ڈر سے کوئی اور بچہ گود بھی نہ لیا کہ وہ بھی نہ مر جائے کیونکہ شاید اس کی قسمت ہی ایسی تھی یوں مکافات عمل کا شکار ہو

READING  
Section



رقم سے لیا تھا۔

اکبر سکول ٹیچر تھا اول تو وہ سکول میں تک کر بیٹھتا ہی نہ تھا اور اگر افسران کے ذریعے سے بیٹھتا بھی پڑتا تو بس بیٹھتا ہی تھا پڑھاتا کچھ نہیں تھا۔ امتحان میں نقل لکھا کر بچوں کو پاس کرا لیتا اور سزا سے بھی محفوظ رہتا۔ سب مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے تو اس کے بچے اعلیٰ تعلیم میں ناکام ہوئے اور پھر بری صحبت میں پڑ کر جرائم کی راہ پر چل نکلے ایک لڑکا ذکیٹی میں گرفتار ہوا اور دوسرا اقدام قتل میں۔ اس کی جمع پونجی ان کو چھڑانے اور کیس لڑنے میں خرچ ہو گئی حتیٰ کہ کرپشن سے جوزین لیتی تھی وہ بھی بیچنا پڑی۔

تاشیر کی ذیولنی سرحدی علاقے میں تھی اور اس کا اکثر و بیشتر بار سہ میں آتا جانا رہتا تھا جہاں ے الیکٹرک اور دوسری اشیاء سے داسوں مل جاتی تھیں جنہیں وہ دوستوں کو مہنگے داموں بیچ کر رہتا تھا۔ وہ لٹا لٹتا حتیٰ چار چار گنا تک اور ساتھ ہی دوستوں پر احسان بھی جتاتا اس کے علاوہ وہ موقع یہ موقع دوستوں پر بھروسہ قرض رقیس بھی لیا کرتا تھا جو اس نے کبھی واپس کرنے کی زحمت نہیں کی جب کوئی تقاضا کرتا تو اپنے حالات کی ایسی دردناک تصویر پیش کرتا کہ دوسرے کو خاموش ہوتا پڑتا اور اسے ضد شدہ ہوتا کہ واپس کیا ملنا ہے کچھ اور نہ دینا پڑ جائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم سے اس نے عزیزوں کے ساتھ مل کر لکڑی کا کاروبار شروع کیا تو عزیزوں نے لکڑی بیچ بیچ کر رقم اس کو دینے کی بجائے کھانا شروع کر دی حتیٰ کہ وہ کاروبار ختم ہو گیا پھر اس نے جمع پونجی سے ٹینٹ سروس کام شروع کیا اور ساتھ چھوٹے بھائی کو بھنایا جو ٹینٹی ہو گیا اور دکان کا سامان بیچ بیچ کر نشہ پورا کرنے لگا جو بڑا سامان بیچ گیا تھا یعنی دیکھیں وغیرہ وہ ایک ذکیٹی میں پار ہو گئیں ممکن ہے اس میں بھی چھوٹے بھائی کا ہاتھ ہو یوں وہ ساری جمع پونجی اور پی فنڈ وغیرہ

گمراہ و لہر مراد۔

کاشی کو بھی ہزار بھتیوں کے باوجود اولاد نہ مل سکی کیونکہ ایک تو وہ بڑا مغرور اور بزرگان تھا اور اس نے والدین کا بڑا اولاد رکھایا تھا دوسرے اس نے اپنے حسن اور تعلیم کے زعم میں اپنی کزن کا رشتہ رعونت سے ٹھکرا دیا تھا کزن کی شادی بھی ہو گئی اور اولاد بھی جبکہ وہ ابھی تک بے اولاد ہے۔

بدگوئی، نفیبت اور لوگوں کی خامیوں کا مذاق اڑانا مظہر کی فطرت بنیاد بن چکی تھی اپنا پرایا کوئی اس کی زبان سے محفوظ نہ تھا۔ دد لڑکوں کے بعد وہ بچی کا خواہشمند تھا اس کے گھر لڑکی تو پیدا ہوئی مگر ذہنی معذور جسے پالنا اس کے لئے عذاب بن گیا اس کی چھوٹی بھابی نے گھریلو لڑائی میں جھٹائی کو بچی کی معذوری کا طعنہ دیا اس وقت وہ خود ایک بچی کی ماں تھی اور حمل سے بھی وہ لڑکا چاہتی تھی لڑکا ہی پیدا ہوا مگر وہ بھی ذہنی معذور تھا۔

ندیم مردہ اور بیمار گوشت بیچا کرتا تھا جبکہ سفیر ایسا ہی گوشت شادی ہانوں اور ہوٹلوں کو سپلائی کرتا تھا وہ دونوں ایسے گوشت کو خد کھانے میں بھی کوئی قہاحت محسوس نہ کرتے تھے نتیجتاً دونوں خود بھی یہاں ٹائٹس کا شکار ہو کر گئے۔ ایک اولاد نہیال میں رل گئی اور دوسرے کی بچیوں نے جسم فروشی شروع کر دی مکافات یوں سامنے آیا۔

اعظم سکول کے بزنس سے وابستہ تھا اور خاصا کماربا تھا اسے بزنس میں توسیع کے لئے کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو ایک دوست سے نصف پر شراکتہ کر کے ایک بڑی رقم اس سے لے لی بعد میں اختلافات ہونے پر رقم سے ٹکر گیا اور حلف بھی دے دیا چونکہ گواہ کوئی تھا ہی نہیں حالانکہ یہ اللہ کا حکم ہے لہذا اسے سب کو کچھ نہ بھنا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کے بھائی کا کھانا تیار ہوا جو بک چار رہا تھا نہ بک بھی ہوا ہو گیا اور بھائی بھی مر گیا بعد میں چھ پونجی اس نے بھائی کو تھا جو اس نے بھائی کی بھائی ہوئی

READING  
Section



بچہ اور بچی معذور پیدا ہوئے اور اس کی اولاد کے رشتے نہ ہو سکے اور ایک آدھ کا ہوا تو طلاق ہو گئی خود اس کی موت بڑے عبرت ناک انداز میں ہوئی۔

فیاض اسم باسٹنی تھا اس کی فیاضی رشتے داروں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عام تھی وہ کسی ضرورت مند کو خالی نہیں لوٹا تھا اس نے کتنے ہی رشتہ داروں کو پڑھا لکھا کر ان کو ان کے پاؤں پر کھڑا کیا کتنے ہی لوگوں کو مالی امداد دی کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکیں شاید اسی کا صدقہ ہے کہ وہ ہمیشہ لاکھوں میں کھیلا اور کاروباری اعتبار پتہ حاد کے باوجود شاندار گھر، گاڑی اور دکان خرید لی اور اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی جن میں سے ایک انجینئر اور ایک سائنسدان بن کر اس کے خوابوں کی تکمیل کا باعث بنے۔

کتنے ہی معذور بچے تھروے جوانوں نے اپنی جوانی طاقت اور اختیار کے زعم میں مہسوم جوانوں کو مارا ج کیا اور کچھ رقم یا غلامیہ کر بھانڈا اس کی قیمت قرار دی اور کبھی تو قیمت دینے کی بھی ضرورت نہ کی لیکن مکافات عمل سے وہ بھی نہ بچ سکے کوئی گناہ نہ قسم ہونے سے شکر میں مبتلا ہو کر Dialysis کو ان کے ساتھ ساتھ کر رہا کسی نے کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنے گناہوں کو استعمال شروع کیا جس کی استقامت ویران پر ہوئی اور اس کا تمام مال جائیداد اور صحت ٹھکانے لگ گئی اور وہ مختار اور بھکاری ہو کر مرا کہ کسی کی اولاد اس کے نقشب قدم پر چلی اور اس کی عزت ساتھ اور دولت کو ٹھکانے لگا دیا کسی کی بیٹی یا بہن نوکر کے ساتھ بھاگ گئی یا ذاکو اٹھالے گئے اور وہ معاشرے میں عبرت کا نشان بن گئے جنہوں نے اسے مکافات عمل یا قدرت کا انتقام سمجھ کر صبر کیا وہ پھر بھی کم نقصان میں رہے لیکن جنہوں نے غیرت میں آ کر قتل وغیرہ کر دیئے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔



ضائع کر کے اب معمولی پنشن اور چھوٹے موٹے کام کر کے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

فیصل کے مالی حالات نہایت کمزور تھے اس نے ہجرت کی اور مناسب جگہ دیکھ کر چھوٹا سا پھنڈ لگا لیا دن رات محنت کے بعد قسمت نے یادری کی اور وہ دکان بنانے میں کامیاب ہو گیا پھر اس نے مکان اور دکان خرید لئے پھر یہ سلسلہ رک نہیں اور بیس پچیس سال میں کروڑ پتی ہو گیا۔ پہلے پہل وہ پوری زکوٰۃ نکالا کرتا تھا جب اس کی جمع پونجی بڑھی تو زکوٰۃ کا رقم بھی بڑھ گئی اس نے اس کے حساب سے زکوٰۃ دینے کی بجائے برائے نام زکوٰۃ دینے کا سلسلہ شروع کیا ایک دن شارٹ سرکٹ سے اس کی دکان میں آگ لگ گئی اور لاکھوں کا نقصان ہو گیا اور شہزاد جو باقاعدگی سے زکوٰۃ نکالا کرتا تھا کبھی اس کا نقصان نہیں ہوا بلکہ اس کے حالات بہتر ہوتے گئے۔

کینسر ایک تکلیف دہ مرض ہے اور اب اس کا کسی قدر علاج بھی موجود ہے کئی مریض کینسر کے باوجود ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہے ہیں لیکن کچھ ایسے مریض بھی مشاہدے میں آئے کہ جو سائل ہونے کے باوجود کینسر سے سکس سکس کے مرے حالانکہ علاج بھی بہت کیا گیا۔ مریض نے پوتوں کی شدید حق تلفی کی کیونکہ ان کا باپ نہیں رہا تھا۔ ایک مریض نے بچوں کے رشتوں کے لیے میں باپ کی نافرمانی کی تھی دو مریضوں نے سسرال میں بڑا غلط رویہ اختیار کیا اور قطع رحمی کا باعث بنی تھیں۔

شہریار کو عملیات کا شوق تھا اور اس شوق میں وہ کالے جادو تک پہنچ گیا وہ کالے جادو کے ذریعے لوگوں کے جائز ناجائز ہر قسم کے کام کرنے لگا لوگوں نے اپنے دشمنوں کے کاروبار، اولاد وغیرہ اس سے بند کرائے اور کئی گھروں میں جدائیاں ڈلوائیں۔ اس نے مالی تو بڑا کمایا لیکن اس کے چہرے پر لعنت برستی تھی اس کے گھر ایک

READING  
Section



بات ہے رسوائی کی

## نشدہ پلا کے

جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے  
جس میں ہر لمحہ اسے ضمیر کا تھانیدار کوڑے مارتا رہتا ہے۔

0300-9667909

☆ دنگیر شہزاد



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



سب کچھ کرو گالی دے دوں گا! بھلا کہہ دو! پھر مار لو مگر یاد رکھو! دورا ہے پراڈ کر کسی کا ساتھ مت چھوڑو بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔

گئی۔ ”میرا تو سب کچھ لٹ گیا۔“

گھر میں موجود سبھی یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ ابو بکر قتل ہو چکا ہے۔

”ہمس یہ بات فوراً پولیس کو بتا دینی چاہئے۔“ بہنوئی طاہر احمد نے کہا۔

”ہمارے بچ میں تم کون ہوتے ہو ناگ اڑانے والے! عائشہ غصے سے چیخ پڑی۔ ”تمہیں پولیس کے سوا کچھ سوچتا بھی ہے؟“

اس کی یہ بات سن کر سحرش بے نہیں رہا گیا، تین دن سے بہن کو بین کرتے دیکھ کر وہ خود پریشان تھی۔ اس نے عائشہ کے گال پر ایک کرار اطمینان چڑایا اور چینی۔

”چپ۔۔۔ ایک دم چپ! اب تو ایک لفظ نہیں بولے گی۔ یاد دلانے کا تیرا شوق میں خوب جانتی ہوں۔ اب تو مدثر پر الزام لگا رہی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تھو نے اسی مدثر کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کو اوپر پہنچایا ہے اور اب پارسا بننے کا ذرا انداز کر رہی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی سحرش طاہر احمد کی طرف گھومی۔ ”طاہر! بند کرو اسے کمرے میں اور فوراً پولیس کو فون کرو۔ پولیس کا ڈنڈا ایلے گا تو خود ہی بتائے گی سچائی۔“

قابل اعتبار اکثر قاتل اعتبار ہوتے ہیں۔

طاہر پولیس کو فون کرتا، اس سے پہلے ہی پولیس سحرش کے گھر پہنچ گئی۔ دراصل پولیس کی انکرویوں میں عائشہ پہنچے ہی مشتبہ ہو چکی تھی۔ حسنین شاہد نے جب اس کے کمرے کی تلاشی کروائی تو اس کا شک پختہ ہو گیا۔ اسی سبب پولیس نے مکان مالک کی موجودگی میں مدثر اور عائشہ کے کمرے کے تالے توڑ کر کمرے کا محاسبہ کیا۔

20 فردری کی صبح عائشہ تھانہ سول لائن آئی اور اس نے انسپٹر نیل مغل کو اپنے شوہر ابو بکر کی تشددی درج کرنے کی درخواست کی۔ نیل مغل نے تشددی درج کر کے معاملے کی جانچ ایس آئی حسنین شاہد کے سپرد کر دی۔ جب حسنین شاہد نے عائشہ سے پوچھ گچھ کی تو عائشہ کی متضاد باتوں اور اس کے غیر ضروری رد نے سننے سے انہیں عائشہ پر شک ہو گیا مگر اپنا شک ظاہر کئے بغیر انہوں نے عائشہ سے کہا ٹھیک ہے تم جاؤ، ہم ابو بکر کو تلاش کرتے ہیں۔

تھانے سے عائشہ سیدھا اپنے کمرے کے کمرے پر گئی۔ ایک میک میں ضروری سامان بھرا پھرا اپنی بہن سحرش کے گھر آ گئی۔ ماں سے دونوں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ بچوں کو نکال میں چھوڑا اور شام تک واپس سحرش کے گھر آ گئی۔ میکے سے اس کا بھائی بھی ساتھ آیا تھا۔ اوپر جب عائشہ اپنے کمرے سے ضروری سامان لے کر گئی تھی مکان کے باہر سادہ لباس میں کھڑا کاشیمل حمزہ شہاب اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے عائشہ کو بیک کا ندھے پر انکاسے ہوئے جاتے دیکھ کر یہ بات فون پر حسنین شاہد کو کہی۔

22 فروری کو سحرش کے فون پر مدثر کا فون آیا، وہ عائشہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ عائشہ کے پاس فون نہیں تھا اس لئے وہ سحرش کے فون پر بات کر رہا تھا۔ سحرش نے عائشہ کی بات مدثر سے کرائی۔ فون پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد عائشہ کا چہرہ غصے سے جھٹکا اٹھا۔ اسے غصے میں دیکھ کر سحرش نے سبب پوچھا تو عائشہ نے بتایا مدثر کہہ رہا تھا کہ بسنت دانے دن شراب کے نشے میں اس کا ابو بکر سے جھگڑا ہوا گیا تھا۔ ہاتھ پائی کے دوران غصے میں مدثر نے اس کا قتل کر دیا اور لاش ایک جگہ پھینک دی۔ کہنے کے ساتھ وہ دھمازیں مار مار کر رونے لگی۔

”اس کیسے نے مجھ کو بیوہ بنا دیا۔“ وہ بین کرنے

READING  
Section



☆..... انسان سب کچھ بھول سکتا ہے سوائے ان لمحوں کے جب اسے اپوں کی بہت ضرورت تھی اور وہ دستیاب نہ تھے۔

☆..... دنوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا کہ تمام دلیس و منتقص اور فلسفے بے کار ہو جاتے ہیں۔

میں دو گھنٹے بیت گئے مگر سات بجے تک بھی مدر نہیں آیا۔ پھر مایوس ہو کر پولیس پانی عائنہ کو لے کر تھانہ سول لائن آ گئی۔

پولیس کو مدر نہایت ہی گھاگ قسم کا لگ رہا تھا۔ وہ پولیس کی چال بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اب اسے پکڑنے کے لئے اسپیکر فیل مغل نے ایڈیشنل ایس ایچ او احمد جنید کی سرکردگی میں ایک ٹیم بنادی۔ اس ٹیم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدر کے موبائل فون کو سرولانس پر لگوا دیا۔ یعنی فون کے ذریعے اس کی لوکیشن اور آنے جانے والی کالیں ٹریس کی جاسکتی تھیں۔

لیکن لوکیشن کا علم نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی مدر نے اپنا فون مٹی بند کر دیا تھا۔ ٹیم نے کئی جگہ تلاش کیا لیکن مدر نہیں ملا۔

29 فروری کی صبح مدر کا فون چالو ہو گیا۔ فون کی لوکیشن چاہ میزوں میں ایک بلڈر کے آفس کے آس پاس تھی۔ پولیس نے ایک لمحہ ضائع کئے بنا دباؤ پہنچ کر مدر کو دیوچ لیا اور تھانہ سول لائن میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو وہ پولیس کو درغلانے لگا کہ اسے ابو بکر کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے مگر جب اس کے سامنے عائنہ کو لایا گیا تو وہ سمجھ گیا کہ اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مدر نے اپنے جرم کی ساری داستان سنا دی۔ اس کے بعد عائنہ کے بیانات سے جرم کی ایک حیرت انگیز کہانی سامنے آئی۔

تاجپور کا باشندہ ابو بکر زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا البتہ

کمرے کی دیواروں پر خون کے تہرے داغ تھے جنہیں کمرے والے ڈکٹس کی گئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے دیوار میں اس جگہ مقتول کا سر پچا گیا ہو۔ فٹس کو گھس گھس کر بنوانے کے نشانات بھی موجود تھے۔ مدر کے کمرے کی ملائی سے گھر پر اندازہ لگا کہ ابو بکر کا قتل اسی کمرے میں کیا گیا تھا۔ پھر لاش کو مدر کے کمرے میں بوری میں بھرا گیا۔ اس کے بعد آدھی رات کو مدر اپنی کئی دوستوں کے ساتھ لاش کو گھر کے باہر لے گیا۔

پولیس کو سراغ اور ثبوت ملے تو عائنہ کی تلاش میں عرش کے گھر پہنچی گئی۔ عائنہ کو پوچھ گچھ کے لئے تھانے لے جانے خود حسین شاہد پولیس ٹیم کے ساتھ آئے تھے۔ عائنہ نے ہاتھ ملا کر اور عرش کو بھی تھانے لے جایا گیا۔ تھانے میں آتے ہی پھر بھی بولی پڑتی رہی، عائنہ تو کمرہ دل کو کتاب دکھا رہی تھی۔ اس نے پولیس کو ساری بات سچ سچ بتا دی۔

”مدر کہاں ہے؟“ اس بار اسے میں عائنہ کچھ نہیں بتا سکی۔ تب اسپیکر فیل مغل کی ہدایت پر پولیس نے مدر کو ہال میں پکڑ لیا۔ اس کے لئے تھانے میں لٹی ایک منصوبہ بنایا۔ حسین شاہد نے بے غش سے کہا آپ مدر کو فون دے دیجئے۔ عائنہ فون پر اس سے کہنے لگی کہ پولیس کو ہم پر شک ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس پہنچی پکڑ کر جیل میں گھولیں دے، ہم ایسی جگہ بھاگ چلیں جہاں پولیس کے فرشتے بھی نہیں تلاش نہ کر سکیں۔ عرش نے مدر کو فون دیا کہ عائنہ کے ہاتھ میں تھا دیا۔ بڑی طرح خوف زدہ عائنہ نے مدر سے وہی کہا جسے حسین شاہد نے اسے کہنے کے لئے کہا تھا۔

”اس نے شام پانچ بجے مدر کے کمرے کے پیش میں آکر جھوٹ مدر سے کہا۔“

پانچ بجے سندھ پہلے ہی حسین شاہد ہاتھوں کے ہاتھ سے لیا۔ اس نے مدر کو اس کے پیش گیت نمبر 7 کے پاس لے گیا۔ پھر مدر نے عائنہ کو بھی تھانے لے لیا۔

READING  
Section



سے دیکھتی اور سوچتی میں نے بھی تو ایسا ہی شریک حیات چاہا تھا مگر مجھے ملا ایک سیدھا سادہ مزدور۔

ایک ہی مکان میں رہنے رہتے ہوئے جب ابو بکر کے کنبے اور مدثر کے درمیان نزدیکیاں بڑھیں تو حسین عائشہ مدثر کی نظروں میں چڑھ گئی۔ عائشہ کو وہ بھائی کہتا تھا۔ عائشہ بھی اس کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی تھی۔ مدثر اپنے کمرے کی چابی عائشہ کو دے جاتا تا کہ شام کو پانی آنے پر وہ اس کے لئے پانی بھر دے۔ اس طرح دونوں دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

مدثر کے پاس پیسہ آیا تو وہ شراب بھی پینے لگا۔ وہ روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر شراب کی چسکیاں لیتا۔ مدثر نے ابو بکر سے بھی دوستی گانٹھ لی تھی اور اس کو بھی پلاتا تھا۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ ایک رات مدثر نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ابو بکر کو اتنی پلائی کہ وہ بے سدھ ہو گیا۔ اور اسے کچھ ہوش نہیں رہا اور مدثر کو میں کی مراد پانے کا موقع مل گیا۔ اس رات عائشہ چپکے سے مدثر کے کمرے میں گھسکی تو صبح ہونے سے پہلے نہیں نکلی۔ عائشہ کے شباب کا نشہ ہی ایسا تھا کہ مدثر نے اپنے پلے سے روزانہ ابو بکر کو شراب پلاتا شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے ابو بکر شراب کا عادی ہو گیا۔ نشہ زیادہ ہونے لگا تو وہ کام سے بھی ناغہ کرنے لگا۔ جس سے کام ملنا بند ہو گیا۔ تب اس نے راج مستری کا کام چھوڑ کر بوجھ ڈھولنے والا ٹھیلہ چلانا شروع کر دیا۔

مدثر ہر رات ابو بکر کو اتنی پلا دیتا کہ صبح دس بجے تک وہ سوتا رہتا۔ اس دوران عائشہ مدثر کے کمرے میں چلی جاتی اور رات بھر دونوں خوب عیش موش کرتے رہتے۔

ایک رات ابو بکر پی کر بے سدھ ہوا تو کچھ دیر بعد اس کا جی متلایا۔ متلی اور تے سے اس کا نشہ اچاٹ ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد آہٹ پا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت

اسے دنیا داری کی سمجھ بوجھ تھی۔ شہر میں لوگ اس کی کافی عزت کرتے تھے۔ چودہ سال قبل اس کی شادی قادر آباد کی عائشہ سے ہوئی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ ابو بکر اُسے پا کر بہت خوش تھا۔ وہ کبھی باڑی کرتا تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد عائشہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا پھر دو سال کے وقفے کے بعد اس کے ایک اور بیٹی پیدا ہوئی۔ دو بیٹیاں ہونے کے بعد گھر کا خرچہ بڑھا تو ابو بکر کو آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی۔ وہ تصور آگیا اور ایک راج مستری کی شاگردی اختیار کر لی اور راج مستری کا کام سیکھ لیا۔ کام چلنے لگا تو اس نے عائشہ اور بچوں کو بھی تصور بلا لیا اور کرائے کا ایک کمرہ لے کر رہنے لگا۔

عائشہ خوبصورت تو تھی مگر کردار کے لحاظ سے ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تھے تبھی سے وہ بہک گئی تھی۔ شہر میں کئی نوجوانوں سے اس کے تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو بھی عائشہ کے خُسن پر رنجھتا عائشہ اُس پر اپنے خُسن کی چاندنی کی ٹھنڈی چھاؤں کی چادر تان دیتی۔

قصور میں ابو بکر کا راج مستری کا کام اچھا چلنے لگا تو عائشہ کو کھلا آسمان مل گیا اور اس کے پُر پرواز کے لئے پھڑ پھڑانے لگے۔ عائشہ کی یہی بے چینی اور اضطراب اسے مدثر کی آغوش میں لے گیا۔

پہاڑ مگر کے رہنے والے جاوید کا بیٹا مدثر کئی سال پہلے قصور آیا تھا۔ اُس نے بھی پہلے راج مستری کا کام سیکھا۔ وہ کالی تیز دماغ اور چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا اس لئے وہ جلد ہی لمبکے لے کر لوگوں کے مکان بنوانے کا کام کروانے لگا۔ اس کام سے خوب کمائی ہونے لگی۔ اس نے ایک بایک بھی خرید لی اور مینکے مینکے کپڑے پہنے لگا۔

ابو بکر جس مکان میں کرائے پر رہتا تھا مدثر بھی اسی مکان میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے ٹھاتے باغھ دیکھ کر عائشہ اسے رشک بھری نظروں

READING  
Section



شراب پلا دیتا ہے۔ اس کے عوض میں اسے خوش کر دیتی ہوں تو کیا بُرا ہے۔ مجھے تو اس سودے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔“

”تو پھر تُو کوٹھے پر ہی بیٹھ جا۔“ ابو بکر چیخا۔ ”سودا ہی کرنا ہے تو کھل کر کر دیجئے میں اور ایک رنڈی میں کیا فرق ہے؟“

”میں اپنی بیٹیوں کا منہ دیکھ کر چپ ہوں۔“ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر چیخا۔ ”ورنہ تُو میرے ہاتھوں ماری جاتی۔ اب غور سے سن لے آئندہ تُو نے ایسا کیا تو میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ عائشہ نے بے خوفی اور بے حیائی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”دیکھوں گی کون کس کے ٹکڑے کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ بستر میں گھس گئی۔

ابو بکر نہ ا۔ صبح مدر کے کمرے پر جا کر اسے خوب بُرا بھلا کہا اور صاف صاف دارنگ دے دی کہ وہ آئندہ کبھی اس کے گھر نہ آئے۔ یا تو وہ یہاں سے کمرہ چھوڑ دے یا پھر وہ خود ہی یہ گھر خالی کر دے گا۔

ابو بکر اب بیوی پر نظر رکھنے لگا، وہ یہ مکان بھی بدل لینا چاہتا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے لئے کام پر جاتا پھر دسی شراب کا پوا غنک لیتا۔ اشد جڑھتا تو اسے بیوی کی بے حیائی یاد آ جاتی وہ سیدھا گھر پہنچتا اور عائشہ کو گالیاں بکتے ہوئے اس کی پٹائی شروع کر دیتا۔

وقت آگے بڑھا، عائشہ اور مدر کے اچھے دن چلے گئے تھے۔ مدر عائشہ کے حصول کے لئے تڑپ رہا تھا اور عائشہ ابو بکر کے ظلم سے عاجز تھی۔ ایک دن دونوں ملے اور ابو بکر کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور منصوبے پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے 25 فروری کا دن چنا۔ 25 فروری ہسنت میلے کا دن تھا اور مدر نے صبح سے ہی شراب پینا شروع کر دی تھی۔ پھر انگریزی شراب کی بوتل لے کر

میں بڑھ گیا کہ عائشہ دبے پاؤں بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تھی اور باہر سے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ابو بکر کو شک ہوا کہ عائشہ کہیں مدر کے کمرے میں تو نہیں گئی، گئی تو کیوں گئی؟

اس کیوں کا مطلب جب اس کی سمجھ میں آیا تو وہ تڑپ کر بیڈ سے اٹھا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو دو کمروں کے درمیان تھا۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ایک کنڈی اس طرف تھی دوسری مدر کی طرف۔ دونوں کنڈیاں بند رہتی تھیں۔ ابو بکر نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی تو وہاں کا نظارہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی عزت و غیرت ایک غیر مرد کی ہانپوں میں تھی۔ غم و غصے سے ابو بکر پوری رات جاگتا رہا۔ اسے اب سناری سازش سمجھ میں آ گئی تھی۔ صبح چار بجے عائشہ کنڈی کھول کر کمرے آئی تو اس نے ابو بکر کو بیدار پایا۔ وہ اسے ہی گھورے جا رہا تھا۔

”آگئی منہ کالا کر کے۔“ ابو بکر نے جلتی آواز میں کہا اور غصے سے فرش پر تھوک دیا۔

”اوہ! تم نے سب کچھ جان لیا۔“ عائشہ بے حیائی سے مسکرائی۔

غصے میں ابو بکر نے عائشہ کے بال پکڑ لئے پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”کیوں کیا تم نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟“

عائشہ نے ابو بکر کے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑا کر اسے پر سے جھٹکا پھر ناگن کی طرح پھنکاری۔ ”دھوکا تمہارے ساتھ تب ہوتا جب میں مدر کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی۔ وہ تو میرے ساتھ اپنی دنیا بسانے کے لئے مرا جا رہا ہے، میں ہی انکار کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کیا ملا؟ صرف محرومی اور آنسو۔ مدر مجھے سب کچھ دیتا ہے میبک اپ، کپڑے، جوتی..... وہ میرے ارمان پورے کرتا ہے اور میری بیٹیوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ تمہیں بھی



تھے۔ یہ جو بھانک انھوں نے دیکھا وہ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔  
مدر نے انہیں ان کی برائیوں کی بھرپور چاقو چاقو پرست ہوئے  
بلکہ یہ بات کہ خود ان کے درمیان بھی کئی تہی مانی فردوں  
نہیں تھے کہ تم گئے۔ ہماری عدویہ مانی پور ان کے پاس سے  
یہنا کہ بہت سحرانے گھر بھی گئی۔

منصوبے کے مطابق مانی کے پاس پہنچے ان  
پانچ سب کے بورے، یہ سب مانی کے پاس پہنچے اور ان کے  
کرکھ گئے تھے۔ دوست ابوذر کی کی مدد سے ان کے دوست  
پوری میں نپیت کر باندھا اور بر کو بھی اسی طرح پوری میں  
لپیت کر باندھا پھر راستہ بارہ بجے پوروں کو ابو بکر کے  
سامان ڈھونڈنے والے ٹھیلے پر رکھ کر شاہد رہ کی جھانڈیوں  
میں پھینکا اور سر اور چاقو کو دریائے رابو کی کے قریب پانی  
سے بھرے گڑھے میں پھینک کر دونوں گھر واپس لوٹ  
آئے۔ رات دونوں نے ابو بکر کے کمرے کی صفائی کی  
لیکن خون کے کچھ چھینٹے دیوار اور فرش پر رہ گئے۔

مدر کی نشاندہی پر پولیس نے رائے ونڈ سے ابوذر کو  
بھی گرفتار کر لیا اور پھر دونوں کو ساتھ لے جا کر جھانڈی میں  
پھینکے گئے بورے میں بند دھڑ اور گڑھے سے ابو بکر کا سر اور  
چاقو برآمد کر لیا۔

جرم کے بعد ہر مجرم کا سید نفسیاتی قید خانہ بن جاتا  
ہے جس میں وہ مسلسل سزا بھگتا رہتا ہے۔ ابو بکر کی لاش  
برآمد ہونے کے بعد سول لائن تھاٹھ میں یہ معاملہ قتل کے  
تحت درج کر لیا گیا۔ اس کیس کے تینوں ملزمانوں مدر و  
ابوذر اور عائشہ کو پانچ مارچ کو سیشن کورٹ میں پیش کیا  
گیا۔

عدالت نے تینوں کو عدالتی حراست میں جیل بھیجنے کا  
حکم دے دیا جہاں وہ اپنے کئے کی سزا تو بھگتیں گے ہی  
لیکن آخرت میں جو عذاب تیار ہے وہ الگ ہے۔

\*\*\*

ابو بکر کے کمرے پر پہنچا تو ابو بکر بھانک گیا۔  
"آؤ پورا آؤ آؤ فرقی پور ہم چاہتے ہیں"۔ مدر  
نے پانی نہ تڑپا ہے کہ پانی نہ تڑپا ہے۔ "ابو بکر قتل  
میں مل کر پانی چاہا ہوں ہمیشہ سے۔" انہی تھوک دو  
بھالی میں اپنے کئے کے کئے کے مانی مانگتا ہوں۔

ابو بکر شراب کا پکا عادی ہو چکا تھا۔ وہ رتی شراب  
بکھ کر وہ نہ سکا اور شراب کے لالچ میں اسے معافیہ کر  
دیات دونوں اپنے پیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے میں بوتل ختم ہو  
گئی۔ مدر نے تم پی ابو بکر کو زیادہ پلائی۔ ابو بکر نشے میں  
جھومنے لگا۔ تبھی مدر نے ابو بکر کے سامنے عائشہ کو اپنی  
بائیں میں جکڑ لیا یہ دیکھ کر ابو بکر چیخا ہوا اٹھا اور مدر کو  
مارنے دوڑا لیکن نشے میں اتنا پور تھا کہ مدر کو کیا مارتا خود  
مدر نے ابو بکر کی گردن دیوچ لی پھر اس کا سر دیوار سے  
بٹختے لگا اور جب تک ہتھکڑیاں جب تک ابو بکر کے جسم میں  
جان رہی۔ سر پھینٹے سے کافی خون نکلا پوری دیوار لال ہو  
گئی۔

نوگ اس دن نگلی میں چھتوں پر بسنت کی خوشیاں منا  
رہے تھے۔ اس لئے کافی شور و غل تھا۔ ابو بکر کے دونوں  
بچے نگلی میں پھر رہے تھے۔ ابو بکر کے گھر میں ہونے والا  
شور شرابا کسی نے نہیں سنا۔  
"لاش کو کہاں پھینکو گے؟" عائشہ نے مدر سے  
پوچھا۔

"تم فکر مت کرو میں نے لاش ٹھکانے لگانے کا  
انتظام پہلے ہی کر لیا ہے۔" مدر نے کہا۔ "بس تم ان بچوں  
کو لے کر نہیں چلی جاؤ۔"

عائشہ فوراً ہر نگلی اور بچوں کو لے کر ملتان روڈ واقع  
پھو پھو کے گھر چلی گئی۔ دوپہر کے بعد وہ بچوں کو لے کر  
واپس کمرے میں پہنچی تو عائشہ نے دیکھا کہ مدر اپنے  
دوست ابوذر کے ساتھ مل کر ابو بکر کا سر دھڑ سے الگ کر رہا  
تھا۔ ابوذر و مدر دونوں کے ہاتھوں میں خون آلود چاقو



# بہاں پھیل کھلتی تھی

ہم انسان تلخ حقائق پر گریہ کر سکتے ہیں مگر انہیں تبدیل نہیں کر سکتے۔ غلطی  
نے ہوتی ہے ورنہ فطرت نے تو ہمیں حقوق و فرائض کا مکمل دستور عطا کیا ہے

0345-6875404

ڈاکٹر مبشر حسن ملک



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



فراتے بھر رہی تھی۔ اسے وہاں زیر تعمیر جیل کا معائنہ کرتا تھا اور متعلقہ سکیورٹی نظام کے حوالے سے تجاویز کو آخری شکل دیتا تھی۔

باغ نگر سعد کے لئے بظاہر اجنبی علاقہ نہیں تھا، مگر گزرے ہوئے وقت کے ساتھ اجنبی ہو چکا تھا۔ علاقے کے خدو خال اس کے ذہن میں ابھرے تو مخصوص آب و ہوا کی تازگی اس کی روح میں اتر گئی۔ کبھی وہ بھد شوق وہاں جایا کرتا تھا۔ بچپن جیسے والدین کے ہمرکاب ہوا کرتا، مگر بعد ازاں اسے فقط ان کی اجازت کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔ پھر غم دوراں نے اسے ٹھکنوں میں جکڑ لیا۔ پولیس سروس اپنانے کے بعد وہ اس طرف کبھی نہیں جاسکا تھا۔ اب اس ٹھکے میں آئے اسے تیس برس بیت چلے گئے۔ جب آخری بار باغ نگر گیا تو اس دم وہ بی اسے کا طالب علم تھا۔

ماضی کے سمندر میں اترا تو مضطرب موجیں اس کے قریبی سفینوں پر ٹکرانے لگیں۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تو حسن فطرت کے مناظر نے اس کے موسموں کی بلا خیزی کو قدرے سکون سے ہمکنار کر دیا۔ اس نے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پا لیا، پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔ سکون ملا تو اس کے خیالات آبی جھروں میں گھرے ایک گھروندے پر مرکوز ہو گئے، جس کا آئینہ گلوں کی تاب سے دہکا کرتا تھا۔ گہرا اسی گھر کی باسی تھی۔ رشک عور، کیف بھری دادیوں میں حسن فطرت کا شاہکار۔

”میری گہنا“ سعد زیر لب بڑبڑایا۔ یک دم اسے ہنگام کے تاریک سلسلوں میں مبدی ماضی کے جھروکے وا دکھائی دینے لگے تھے۔ ان میں یادوں کے دیئے ہواؤں کے دوش پر جھلکا ہے تھے۔ اس لو نے سعد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ ست بعد ان یادوں کو کھو جانے لگا جو اس کے ذہن نے نہاں خانوں میں دفن ہو چکی تھیں۔

”جنید!،“ سپرنٹنڈنٹ جیل ڈی ایس پی سعد نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے صدا نکالی مگر پھر چونک کر رہ گیا۔ ہتھ کڑیوں میں جکڑا ہوا جوان اس کا تخت جگر نہیں تھا، مگر اس سے بلا کی ممانعت رکھتا تھا۔ سعد کا دل بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا۔ اس نے ماتھے پر لرزاں پسینے کے قطرہوں پر حیرت ملی پریشانی میں ہاتھ پھیرا اور بیب سے رومال نکال لیا۔ پھر بے ساختہ مڑ کر اپنے ڈپٹی کی طرف دیکھا، جو کرسی پر براجمان واقعات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

”سرا! دل نہیں مانتا مگر یہ بد بخت ان تین دہشت گردوں میں شامل ہے جنہیں موت کی سزا سنائی جا چکی ہے۔“ ڈپٹی نے اپنے افسر کو بتایا۔ سعد کے چہرے پر نکھرے ہوئے نقوش میں دکھ کا تاثر ابھر آیا۔ وہ استغیاسیہ نظروں سے ڈپٹی کی طرف دیکھتا رہا۔ ”لیس سرا! یہ وہی خطرناک مجرم ہیں جو رات گئے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ آپ کے حکم پر ان کے لئے مخصوص کوٹھڑیاں تیار کر وادی گئی تھیں اور جیل میں سکیورٹی بھی بڑھا دی گئی ہے۔“ ڈپٹی نے مضبوط لہجے میں رپورٹ دیتے ہوئے باس کو مطلع کیا، پھر فلی فون کی طرف متوجہ ہوا جو مسلسل بج رہا تھا۔

”سرا! آپ کے لئے گاڑی تیار ہے، آپ چاہیں تو سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔ باغ نگر میں آپ کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔“ ڈپٹی نے سعد کو آگاہ کیا۔

سعد نے اپنے ماتحت افسر کی طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھا، پھر فوراً ہی اپنی کیپ سر پر سجائی اور آغاز سفر کا اشارہ دے دیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ رکا، اپنے دفتر پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ”آپ کے حوالے“ اپنے ڈپٹی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ساتھ ہی اس کے قدموں کی حرکت میں تیزی آئی۔ ڈپٹی نے دیر بعد اس کی جیب باغ نگر کی جانب

READING  
Section



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)





وہ سعد کی نوعمری کا دور تھا، اس کی عمر کوئی بیس برس ہوگی، جب وہ بی اے کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ تفریح کا خیالی بس کے بی میں سما یا اور وہ باغ ٹر پینچ گیا۔ کرائے کے بنگلے میں اتر اسی تھا کہ اس کی نظر گہنا پر پڑ گئی، جو تازہ پھولوں کے گہرے چنگیر میں سجائے وہاں آن پہنچی تھی، پھر یہ جان کر شرمندہ سی ہو گئی کہ شہری بابو تھا ہی بنگلے میں ستم ہوا تھا۔ سعد نے اس کا حسن دیکھا تو جی جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اسے بس دیکھتا رہ گیا، پھر گہنا نے اسے چونکا دیا۔

”کیوں بابو! چھوہری کیا کبھی نہیں دیکھی؟“ اگلے لمحے یہ کھٹکتی ہوئی آواز قہقہے میں ڈھل گئی۔

”سارے حواس میں لوٹنا تو اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ یہ بنگلے میں چھٹنوں کی دیر لگی۔“

”تم کون ہونا؟“ اسے اختیار اس نے پوچھ لیا۔

اسے بدحواس پا کر گہنا بھرپور ہنسی پڑی۔ چہرے کی کھلتی ہوئی چمک اب اس کے تینوں میں بھی چمکنے لگی۔

”گویا میری محنت آپ کے کسی کام نہیں آ سکتی۔“ اس نے خوش رنگ گجروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ سعد کی آنکھیں بدستور گہنا پر گڑھی رہیں۔ ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟“ گہنا نے جینھے سے لہجے میں

انتہا کیا۔ اس بچ سعد خاصا سنبھل چکا تھا، لفظوں کو تولتے ہوئے بولا۔

”سوچتا ہوں، قدرت نے تمہیں موسیٰ کی کلیوں سے اتنی فی قاب میں ڈھال کر ذوق پرستوں پر کتنا بڑا

حصان کیا ہے۔“ سعد کی جرات نے گہنا کو چونکا دیا۔ اس کی اچلی رنگت میں گلوں کی سرخی دوڑ گئی، پھر پسینے کے

توتے دھرمس پھولوں میں شبنم کی طرح اس کے عوارض پر چمکنے لگے۔

”گہنا! چلی گئی مگر سعد کو روح تک گھائل کر گئی۔ اس

روز اس نے گہری چوٹ کھائی تھی، شب بھر اسی کے خیالوں میں کھویا رہا، جاگتا رہا، کروٹیں بدلتا رہا۔ چاند سا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں لہرائے لگتا۔ وہ سکون سے اس قدر عاری ہوا کہ اگلے روز صبح سویرے اپنی گل بکاؤلی کے ہاں پہنچ گیا قسمت کا دھنی نکلا، جوڑ کی اسے سخن گل ہی میں نظر آ گئی اس دم باغیچے میں ٹرنگ آتش پوری طرح دھب رہی تھی۔ گہنا اسہاک سے تازہ پھول چن رہی تھی۔ اس کی بازک انگلیاں گل و خار میں الجھی ہوئی تھیں۔ سعد کو مقابل پا کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی، پھر اس کے عوارض میں وہی گلاب مہکنے لگے جن کی جھلک سعد کو دیوانہ بنا چکی تھی۔

”ماں، بنگلے والا بابو آیا ہے۔“ گہنا نے فوراً من کا چور ہاں کے حواس لے کر دیا۔ ماں کا جہاندیدہ چہرہ سلوٹوں سے اٹھنے لگا اور آنکھوں میں اندیشہ الجھنے لگا۔ سعد

نے ذہانت دکھائی، جو ہاں کو سنبھال لیا، پھر اسے دلاسہ دیتے ہوئے بدحواسوں پر لے آیا۔

”خالہ! مجھے تازہ دھنوں کی نوکری چاہو، کمرے کی سجاوٹ کے لئے، حسن و زیبائش کا موقع۔“ وہ بولا۔

آخری لفظ اس نے دھیرے سے کہے۔

”بابو! تو ماں کے پاس بیٹھ جا۔“ گہنا لپائی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تُو بے سچ جائے بھی نہیں لی ہوگی۔ مجھے بس

تھوڑا سا وقت چاہئے، گہنی نوکری تیار ہو جائے گی۔“ وہ اپنی جرات کو شرافت کا لبادہ پہناتے ہوئے بولی۔ پھر

اپنے کام میں جست گئی۔ اس نے کئی انوائس کے پھولوں کا انتخاب کیا، پھر انہیں مرتب کیا۔ سعد کو ہر پہلو میں

گلوں سے حسین لگا۔ اس نے کئی بار اس کی جانب چور نگاہوں سے دیکھا۔ چند بار پکڑا بھی گیا اور شرمندہ ہوا۔

جس پر خالہ مسکرائے لگی۔

”جہاندیدہ عورت میرے باپ کی طرح تھانیدار بنتی ہے۔“ اس نے ذہن میں سوچا۔ ”وہ نوک“ انہیں



رہے۔ کہنا چیلے سے بنگلے میں آ جایا کرتی تھی، جہاں وہ سعد کے ہمراہ کچھ وقت گزارتی۔ بے قابو چاہت کا بہ پہلو نوع آدم کو اس نہیں آ سکتا تھا۔

ایک روز بنگلے کے ملازم نے قیامت ڈھادی اور ایسا کھیل کھیل کر بستی والوں نے پریموں کو یکجا کر بنگلے کا گھیراؤ کر لیا۔ اس انبوہ میں کہنا کے رشتہ دار بھی شامل تھے، جن کا طیش و غضب دیدنی تھا۔

”اس بگڑے امیر زادے نے ہماری برادری کی قیم لڑکی کو خراب کیا ہے، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ اس کے علاوہ بھانت بھانت کی غضبناک بولیاں بار بار ابھرتی تھیں۔ غارت گری ہو بھی جاتی مگر چند افراد سعد اور کہنا کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے جو غصیلے لوگوں کے زرخے میں بری طرح سہم گئے تھے۔

سعد کو کچھ بھائی نہ دیتا تھا جبکہ کہنا مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے ماں کے کئی ٹھنڈے کھائے تھے۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ بستی کے بڑوں کو متحرک ہونا پڑا جنہوں نے اس کشیدہ صورت حال پر قابو پانے کی تدبیر کی۔ اسی روز شام کے وقت کرنا دھرتا افراد کا اکٹھ بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کے بعد ملازم کو بنگلے میں پابند کر دیا گیا۔

سعد کے سر پر سوار عشق کا بھوت ہوا ہو چکا تھا اور اب وہ کسی طرح پیچیدہ مسئلے سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا مگر حالات کا دھارا اس کے مخالف نظر آتا تھا۔ اس دور میں مواصلاتی نظام ارتقائی دور میں تھے۔ کسی سے فوری رابطہ قائم کر لینا ممکن نہیں تھا، سعد اپنی قسمت کو کوستا اور غلطیوں پر پکھتا تا رہ گیا۔

ادھر کہنا کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ ”مردوں یا جیوں، سعد کی ہو چکی ہوں، اس کے بنا نہیں رہ سکوں گی۔“ وہ بار بار کہتی۔ جب اس پر جسمانی تشدد بڑھ جاتا تو وہ تقاضا کرتی کہ اسے مار دیا جائے۔ مار پیٹنے سے باعث اس کے منہ اور ناک سے لہو بہنے لگا تھا۔

اپنے روندے جانے کا دھڑکا لگا رہے، ہمیشہ رحم و کرم کے طالب رہتے ہیں۔“ خالہ نے کہا تو وہ ڈر سا گیا۔ اسے لگا جیسے خالہ اس کا ذہن ٹوٹ چکی تھی۔

اس روز کے بعد کہنا علی الصبح خود ہی بنگلے پہنچ جایا کرتی تھی۔ بنگلے کا ملازم فجر کے وقت بیرونی دروازے کھول دیا کرتا تھا۔ اس وقت سعد سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ کہنا اپنے گھر سے بنگلے کی جانب دیکھا کرتی تھی۔ سعد جو بھی سبک خرازی کے بعد بنگلے میں داخل ہوتا، کہنا وہاں آ جایا کرتی تھی۔

ایک شب برکھا ٹوٹ کر برسی تھی۔ کہنا علی الصبح جاگی تو بوندوں کی رم-جھم جاری تھی۔ گلوں کے دامن آبی موتیوں سے مالا مال تھے۔ کلیوں میں تازگی کا نکھار بھی سہاٹا دکھتا تھا۔ ہلکی میگھا میں کہنا نے پھولوں سے ٹوکری سجائی تو اس کے اپنے من میں بھی کلیاں کھلنے لگیں۔ تنہاؤں کے گلزار مہکنے لگے۔

اس روز کہنا بنگلے میں پہنچی تو بھیگ چکی تھی۔ بوندیں گلچیں کی زلفوں میں بھی ٹکمر گئی تھیں، جہاں گلوں نے اچھوتے رنگ سجا دیئے تھے۔

سعد نے پھولوں کی ٹوکری سنبھالی تو کہنا اس کے قریب تر آ گئی۔ سعد نے خوبصورت سید گل میز پر سجا دی۔ اس دم برکھا انگڑائی لے کر چل اٹھی۔ سعد نے بے اختیار کہنا کو کچھ محفوظ میں سمجھ لیا۔ پھر نسوانی خود سپردگی کا ظلم نمونہ پانے لگا۔ دوا جسام سانسوں کی حدت میں کھلنے لگے۔ شوخ گلابوں کا لہو کہنا کے گالوں میں اتر آیا۔ اس کے لب لرزنے لگے۔ سانس باہم الجھنے لگے۔ برکھا ٹوٹ کر اتنا برسی کہ تراوت ذی روحوں میں گہرائیوں تک اتر گئی۔

عمر کی نا پختگی تھی، یا شعور کی بالیدگی میں کمی، جو سعد ”کہنا اپنے جذبوں پر قیود نہ لگا سکے اور معاشرتی پیچیدگیوں کی پروا نہ کیے بغیر باہمی میل جول میں لا پروا



بھی نہیں تھے کہ وہ بستی کے معتبر افراد کی تواضع کے لئے اقدام کر سکتی۔

”تنگدستی گھرانوں کی عزت داری میں نقب کی راہیں ہموار کرتی رہی ہے۔ گاؤں کے معزز بڑے نے بستی کی محفل برخواست کرتے ہوئے کہا۔

گہنا کی ماں گھر لوٹ کر بے انتہا روتی۔ اس نے بیٹی کو خوب کوسا اور اس کے چہرے پر ایک بار پھر تھپڑوں کی بارش کر دی جو اب ڈھنی اور جسمانی سزاؤں کے باعث تھک ہار چکی تھی۔ تھوڑی دیر مبر سے مار کھاتی رہی پھر بے ہوش ہو کر دھڑام سے پھولوں کی روٹ میں گر پڑی۔ یہ ماجرا دیکھ کر اس کی ماں اور بھی پریشان ہو گئی اور اونچی آواز میں رونے لگی۔ رشتہ داروں نے اسے سنبھالا، بتایا کہ اس کی لائٹری نکل آئی تھی۔ اس کی بیٹی امیر زادے کی بیوی بن چکی تھی۔

”سعد لڑکی کو پسند کرتا ہے، اسے اپنے ساتھ شہر لے جائے گا۔ جلد ہی امارت اس غریب گھرانے کے قدم چوم لے گی۔“ انہوں نے کہا، پھر گہنا کو بھی یاد کر لیا کہ اب اسے سعد کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔

دو روز بعد ایک کار سعد کے بچکے میں آن رکی۔ گہنا اس دم اپنی ماں کے گھر تھی۔

”تمہاری امی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فوری طور پر میرے ساتھ شہر واپس چلو۔“ سعد کے کزن نے اسے بتایا۔ خبر سن کر سعد سکتے میں آ گیا۔ اس کی جیسے جان نکل گئی، دل ڈوب گیا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑتا، کزن نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ سعد اب حواس باختہ ہو چکا تھا، اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوت مسدود دکھائی دیتی تھی۔

اس دم بچکے کا ملازم بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ سعد کے سامان اس کے کزن نے گاڑی پر لادا اور وقت ضائع کئے

شام، اکٹھ کے وقت پریمپوں کو مجرموں کے طور پر دونوں کے سامنے لایا گیا۔ دونوں زخمی تھے اور اس ہیئت میں لیلیٰ مجنوں نظر آتے تھے۔ اب انہیں سنگساری کے مراحل درپیش تھے کیونکہ عمومی رد عمل حدوں سے بڑھا جاتا تھا۔

”ہم نے کوئی ایسا بڑا جرم نہیں کیا۔“ سعد نے حوصلہ کر کے بستی والوں کو بتا دیا مگر اس کی آواز شوریدگی میں دب کر رہ گئی۔

”دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔“ بڑوں نے غلبت میں فیصلہ دے دیا۔ اس بابت صرف چند شوریدہ سروں کے بیان سے گئے۔

”کیا سعد کے رشتہ دار، احباب آپ لوگوں کا فیصلہ تسلیم کر لیں گے؟“ گہنا کی ماں نے گھبرا کر پوچھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ پاسکی۔

”یہ نکاح ابھی ہوگا، ہماری موجودگی میں، جیسا کہ ہمارے ہاں روایت ہے۔“ ایک باعزت بڑے نے حکم سنا دیا۔

”قاضی صاحب کو بلایا جائے۔“ ایک دوسرے معتبر نے ثانیاً کہا۔

تھوڑی دیر بعد بستی کے افراد کی موجودگی میں سعد اور گہنا کا نکاح وقوع پذیر ہو گیا۔ بند گہنا کو تشفی آمیز لگا ہو گا مگر سعد کے لئے یہ رسم قل سے کم نہیں تھا۔

”بڑے قاضی صاحب دو روز میں بستی پہنچ جائیں گے، اس وقت نکاح کے کاغذ مکمل کر والوں کا۔“ قاضی صاحب نے وضاحت کی۔ بد نظمی اس دم اپنی انتہا پر نظر آئی۔ بندھن کے دیگر مراحل کسی کی نظر میں نہیں تھے۔

رسم نکاح کے بعد بستی کے لوگ اپنے آپ کو سرخرو قرار دیتے رہے، مگر گہنا کی ماں پر گہری تشویش کے آثار واضح تھے۔ بوڑھی عورت اندیشوں میں مبتلا تھی۔ وہ دیگر وجوہ سے بالمشیت بھی پریشان تھی۔ اس کے پاس اتنے پیسے

READING  
Section



جھٹک دیتا۔ لڑکی کا روپ اس کے خیالوں میں محسوس  
تا قابل غنائی خطا کے طور پر ابھرتا تھا جس پر زیادہ سوچنا وہ  
دل و دماغ پر لچکوں کا عذاب سمجھا کرتا تھا۔

تر بیت ختم ہوئی تو ایسے پہلا سٹیشن اسپتال شہر میں  
گیا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی۔ ڈیوٹی کے بعد روزانہ وہ  
اپنے گھر آ جایا کرتا تھا۔ زیادہ تر اپنے والد کے ساتھ  
رہتا، جو اب سہاروں کے متلاشی نظر آتے تھے۔ ان میں  
بچنے کا ولولہ ماند پڑ رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے اور بیٹے کے بیچ  
حائل فاصلے مٹانے کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے۔ اس  
پہلو جو وہ برسوں بوجھنے تھے، کبھی اس پر پچھتائے لگتے۔

”بیٹا گھر کے دروازے مجھے اب بند بھائی دیتے  
ہیں، جی چاہتا ہے کہ ہم انہیں کھولنے کی کوشش کریں۔“  
ایک شام انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں سعد سے کہا اور  
پھر بے چارگی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ سعد نے والد کو  
جواب دیا۔ متفرق خیال اس کے ذہن میں ابھرنے  
لگے۔

”دیکھو بیٹا! تمہاری ماں کے بل بوتے پر یہاں گہما  
گہمی جاری رہتی تھی، یہ مکان گھر نظر آتا تھا۔ یہاں  
دوست احباب آتے رہتے تھے۔ موجودہ حالات پر غور  
کر دو تو تم دیکھو گے کہ تمام گھروں کی نوکریاں پر قفل  
ہو گئی ہے، جو گھر کے ہمدرد نہیں کہلا سکتے۔ کبھی کھانا مجھے  
بھی بنانا پڑتا ہے۔ مرحومہ تو چلی گئی، ہمیں ہر طرح محروم کر  
گئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم گھر کی ذمہ داریاں سنبھال  
لو، میرا مطلب تمہاری خاندان بادی سے ہے۔ سچ یہ ہے کہ  
عورت کے بنا گھر نہیں چلا کرتے۔“

سعد کے والد نے گفتگو میں متوازن ٹھہراؤ رکھتے  
ہوئے مضبوط لہجے میں بدعا کہہ دیا۔ سعد پر بجلی سی کوند  
پڑی، پھر ان شعلوں میں ایک مایوس چہرہ سلگنے لگا جو لمحوں  
میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ ایک لڑش کی سعد کے بدن

بغیر دونوں شہر کی راہ ہو لئے۔ گاڑی پر سعد بری طرح  
پریشان تھا اور مسلسل رو رہا تھا۔ وہ ماں کی صحت یابی کے  
تے دعائیں بھی مانگ رہا تھا۔ گھر واپسی کا یہ سفر آٹھ  
گھنٹے پر محیط تھا، جس کے دوران ہی یہ علم ہو گیا کہ اس کی  
ماں انتقال کر گئی تھی۔

ماں کی وفات کا صدمہ سعد پر کوہِ گراں کی طرح  
گرا۔ یہ سانحہ خاندان نے بڑی مشکل سے برداشت کیا۔  
اس کے والد بھی ان دنوں اچانک صدمے سے انتہائی  
پریشان تھے۔ مرحومہ گھریلو معاملات میں روح رواں  
تھی۔ اس کی موت کے بعد گھر میں حیات سکھنے لگی۔ سعد  
کی کائنات میں بھی رنگ اسی کے دم سے ختم ہو گیا۔  
پڑے تو اسے ہر سو تاریکیاں دکھائی دینے لگیں۔ والد کے  
ساتھ اس کا رشتہ فاصلوں پر مبنی تھا، جنہیں پائنے کی  
جسارت وہ کبھی نہیں کر سکا تھا، نہ ہی والد نے کبھی اس کی  
طرف اپنے بازو وا کئے تھے۔ وہ پرانے دور کے جابر  
تھانیدار تھے اور عادتاً اپنا دبدبہ گھرانے پر بھی مسلط کئے  
رکھتے تھے۔ مرحومہ خاتون ہی زیادہ تر باپ اور بیٹے کے  
درمیان روابط کا ذریعہ تھی، مگر اب پڑ ملاں سانچے کے بعد  
سعد اور اس کے والد ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح  
رہنے لگے تھے۔

چند روز اس طور گزرے ہوں گے کہ سعد کی زندگی  
میں ایک بڑا انقلاب آ گیا۔ اسے پولیس اکیڈمی کی  
طرف سے کال لیٹر موصول ہو گیا۔ اب اس کا کیریئر  
شروع ہو رہا تھا۔ اسے فوری طور پر ابتدائی تربیت کے  
لئے بلا لیا گیا تھا۔ گھر سے اس طرح لکھنا سعد کے لئے  
منفید ثابت ہوا۔

اکیڈمی میں وہ اس قدر مصروف ہو گیا کہ تن و من کا  
ہوش بھی نہ رہا۔ رات گئے کہیں فرصت میں ماں یاد آتی تو  
وہ غمزہ ہو جاتا۔ کبھی والد کے حالات تصور کر کے  
پریشان ہوتا لیکن گہما کا بھولا بھٹکا خیال وہ ذہن سے

READING  
Section



میں دوڑ گئی۔

نیلیم کی شخصیت میں دلکش خوبیوں کا ایسا چھوٹا پن تھا کہ جس نے سعد کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا۔ بعد ازاں نو بیاہتا جوڑے کی خاندانی زندگی خوشنمایاں سیٹھ یوں رواں دواں ہو گئی کہ سعد کی کتاب زیست میں ماضی کے نقوش پر دوراں کی گرد تہہ در تہہ جمتی چلی گئی اور کئی متعلقہ چہرے اس خاک میں اُٹ کر اپنا عکس کھو بیٹھے اور غیر متعلقہ شمار ہونے لگے۔ زیست کے اس سفر میں جوئے وجود متعلقہ ہوئے، ان میں سعد کی بیٹی مہوش جان پدری۔ بعد میں جنید بھی پیدا ہوا۔



ایک ایک موسم طوفانی کیفیت میں ڈھل گیا تھا۔ تیز ہوا کے پھیرے سعد کی گاڑی سے ٹکرانے لگے۔

”آئندہ ہی بہت تیز ہے۔“ ڈرائیور نے پہلو بدلتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا، جو اپنے خیالوں کے تقاطع میں گمراہ ہوا تھا۔

”ہاں، بادل گہرے دکھائی دے رہے ہیں۔“ اس نے ڈرائیور کو جواب دیا۔ ساتھ ہی گاڑی کا دنگ دھن اوپری سمت چلا دیا۔ بوند باندی کا آغاز ہو چکا تھا۔

”وادی میں موسلا دھار بارش کا امکان ہے۔“ ڈرائیور نے سکرین پر واپچراؤ متحرک کر دیئے۔ گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

بیس سال قبل سعد نے اس وادی کو ایسے ہی موسم میں الوداع کہا تھا۔ اس روز بھی میٹھا ٹوٹ کر برسی تھی۔ دھرتی ابر کی گڑگڑاہٹ میں لرز رہی تھی اور تند ہوائیں پہاڑوں کے سینوں پر سرنگار رہی تھیں۔

طوفان سعد کے ذہن میں بھی دوبارہ بھرنے لگے تھے۔ مدت بعد گہنا اپنے شخصی عکسوں کے لبادے میں اس کے دماغی پردوں پر مسلسل چھائی ہوئی تھی۔

”نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی، میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟“ سعد نے خیال کیا۔ اس کا بدن

سعد کے والد نے گھرانے کی امیدوں کا دیا گھر کے طاقے میں فروزاں کر دیا تھا، جس کی لو میں وہ اپنی راہیں بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ اس اچانک تقاضے نے البتہ سعد کے دامن ضمیر میں انکارے بھر دیئے تھے، کچھ خوف کے الاؤ بھی روشن تھے جو اس کے دل و ذہن میں بھڑکنے لگے تھے۔ سہارا جس کو اپنا کر گہنا اس کی ذوق حیات میں قیام کر سکتی تھی، اب منوں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔

والد سے شادی پر مکالمے کے بعد سعد کو احساس ہوا کہ وہ وجود جو اس کے خیالوں میں کبھی کبھار چند لمحے اپنی جوت جگایا کرتا تھا، اب مستقلاً اس کے دماغ میں مغلط ہو گیا تھا۔ اگر واقعی وہ لمحوں کا عذاب تھا تو اب وہ بے حد بڑھ گیا تھا۔

چند روز بعد سعد کے والد نے بیٹے کے لئے دلہن کا انتخاب بھی کر لیا۔ نیلیم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین اوصاف کی مالک لڑکی تھی، جو کسی بھی خاندان کے لئے افتخار کا سرمایہ ہو سکتی تھی۔

سعد کے لئے مسلسل متذبذب ہوئے رہنا قدرتی امر تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ والد کے سامنے اقرار خطا کر لے اور جو سزا وہ دیں، اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گہنا کے احباب نے اسے تلاش کر لیا تو اس کی خاندانی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہو جائے گی اور اسے ایسا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو جائے گا، جو شاید اس دم ناقابلِ طمانی ہو، مگر وہ چاہ کر بھی والد کے سامنے اپنے لب نہ کھول سکا۔ سعد کے والد نے بھی بیٹے کے عمومی رویوں میں تغیر بھانپ لیا تھا، مگر وہ اسے اپنا الجھاؤ اگل دینے پر آمادہ نہ کر سکے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے بیٹے کے لئے والد کے ازلی خوف سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ انہی حالات میں اس کی شادی نیلیم سے ہو گئی۔

READING  
Section



باعث وہ تمام رات جاگتا رہا، سوچتا رہا مگر اپنا ضمیر مطمئن نہ کر سکا۔

دوسرے دن شام کے وقت اسے فراغت نصیب ہوئی تو وہ تادیر سڑکیں ٹاپتا رہا۔ بہت ساری سیر کی، پھر کچھ مقام اسے مانوس نظر آنے لگے۔ اسگے روز اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے چند گھنٹوں کا انتخاب کیا، پھر ان راستوں پر چل پڑا۔ اچانک وہ گہنا کے اجاڑ پرانے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا، وہ بوکھلا گیا۔ منظر غیر متوقع تھا۔ عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی، دروں پر لکڑی کے تختے شکستہ ہو چکے تھے، جبکہ دیواریں مخدوش دکھائی دیتی تھیں۔ محض کل مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا۔ دروازہ سے صرف ویرانی چلتی تھی۔ سعد دل مسوس کر رہ گیا۔ کبھی یہ جگہ کتنی زندہ رہی ہو کر تھی، اس کے ذہن میں انجرا۔

بچے تو سعد اسے دہم سمجھا، مگر بعد ازاں اس کا ماتھا ٹھنکا کہ ہستی کے لوگ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ بعض لوگ اس کا نام سن کر ٹھنک جایا کرتے تھے اور پھر اسے بغور دیکھا کرتے تھے۔ وہ ان چہروں پر بدلتے ہوئے تغیر پا کر حیران ہوا کرتا تھا۔ یہ سرسری ملاقاتیں عموماً غیر یقینی کی فضا میں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ کبھی سوالیہ نظریں اس کا تعاقب کرنے لگتیں، مگر اس کے چہرے پر عموماً ایسا تاثر طاری رہتا تھا کہ لوگ چاہ کر بھی اس کے قریب نہیں آ پاتے تھے اور اس کا شخصی حصار نہیں توڑ پاتے تھے۔ کبھی اسے یہ بھی گمان ہونے لگتا کہ علاقے کے بعض لوگ اسے پہچان چکے تھے۔

ہاشم محکمہ پولیس کا پرانا ملازم تھا۔ افسروں کا خدمتگار تھا۔ سعد کو فراغت کی انجام دہی میں اس کی چابک دستی بہت پسند تھی۔ ہاشم اس کے خاصا قریب تھا۔ وہ پولیس افسروں کی پرانی کہانیاں جانتا تھا کیونکہ ایک عمر

جذبوں کی آمیزش سے کپکپانے لگا۔ یکا یک فضا شعلہ بار ہوئی۔ فلک پر زور دار دھماکہ ہوا اور ارض تھر تھرا اٹھی۔ حد نظر تک رعد کا غضب دکھائی دینے لگا۔ سعد کو یوں لگا جیسے برقی اس کے اپنے من میں کوند گئی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور سر گاڑی کی نشست پر ٹکا دیا۔ ”الاماں“۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

ڈرائیور نے گاڑی ایک ریستورنٹ کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ بیس سال قبل سڑک کے کنارے صرف ویرانیاں ہوا کرتی تھیں۔ سعد نے یاد کیا۔ اب تو ہر طرف لگاڑیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ اس نے پہلو بدلا، پھر آہ بھری۔

”سرا میں نے آپ کو کبھی اس طرح پریشان نہیں دیکھا“۔ ڈرائیور نے مضطرب لہجے میں سعد سے کہا جو اس پر چونک سا گیا۔

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”سرد! موسم میں چائے کی حاجت قدرتی بات ہے۔“ اس نے بظاہر معاملہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

سعد بارغ غم پہنچا تو رات چھا چکی تھی۔ دیکھنے میں بہتی اب نئے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ نئی راہیں اس کی شناسا نہیں تھیں۔ قدرتی دلفریب مناظر کی جگہ مصنوعی خوبصورتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ سعد ایک پُر شکوہ عمارت میں اترا، جس کا آئین گلوں سے لدا ہوا تھا، مگر پھولوں میں اسے نہ تو رنگ بچے اور نہ ہی وہ اس خوشبو سے معطر تھے جو اس علاقے کا خاصہ تھی۔

اس کا ذہن بدستور عہد رفتہ کے سلاسل پر مرکوز تھا۔ اس بھنور سے نکل آتا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ احساس جرم، جو کئی سال اس کے ذہنی نہاں خانوں میں پوشیدہ رہا تھا، اب غلغلہ کی عذاب کی صورت ابھر آیا تھا اور اس کے وجود کو ڈس رہا تھا۔ حد درجہ بے قراری کے



تخیر معده کے مایوس مریض متوجہ ہوں  
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

## ریمینال شربت

تخیر معده اور اس سے پیدا شدہ عوارضات  
مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا  
نہ آنا، کثرت زیاج، سانس کا پھولنا، تیزابیت  
معدہ، جگر کی خرابی اور معده کی گیس سے پیدا  
ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔

دوا فرمیشیہ طلب فرمائیں

نوٹ

تخیر معده و دیگر امراض کے طبی مشورے کے لئے



ممتاز مطب

سے رابطہ فرمائیں

ممتاز دوا خانہ (رجسٹرڈ) میانوالی

فون: 233817-234816

سے مکمل کے ڈاک بنگلے سے منسلک تھا۔ اسے میزبان  
شاف میں معتبر جانا جاتا تھا مگر کسی حد تک باتونی تھا۔  
لطیف حیرائے میں پرانے افسروں کی کہانیاں سنانا اس کا  
دل پسند مشغلہ تھا۔ یہ قصے وہ ہر کسی کو نہیں سنانا تھا۔ صرف  
انہی لوگوں سے گویا ہوتا، جنہیں وہ اس بابت شوقین جانتا  
تھا۔ فضول باتوں سے اجتناب برتتا اور اپنے رویوں پر  
دھیان رکھتا تھا۔ سعد جانتا تھا کہ ہاشم اس کی کہانی میں  
حال اور ماضی کی کڑیاں ملا سکتا تھا۔ وہ اس سے دیگر  
متعلقہ بھیج بھی جان سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ارادہ کر چکا تھا  
کہ موقع پا کر ہاشم سے قصہ پارینہ پر بات کرے گا۔

اس شام میگھانوٹ کریری تھی۔ گلوں کے چہرے  
موتیوں سے لد گئے تھے۔ سبزے نے بھی نکھار اوڑھ لیا  
تھا۔ آبی گزرگا ہوں میں پانی بڑھا تو تالوں میں رواں آبی  
لہریں بھاری پتھروں سے ٹکرانے لگیں۔ شام، ہر سو گہرا  
اندھیرا چھا گیا، پھر وقت کے ساتھ برکھا میں تندی بروستی  
گئی۔

سعد کی سوچوں کا تانا بانا موسی گردابوں میں الجھنے  
لگا تھا۔ ہاشم نے سعد کو زیادہ پریشان دیکھا تو اس کی من  
پسند بلیک کافی بنا کر لے آیا۔ اس دوران مینہ کی بو چھاڑ  
نے کھڑکیوں کے پٹ وا کر دیئے تھے۔ ہاشم نے آبی  
پلاخار پر قابو پانے کی کوشش کی تو چند ہی لمحوں میں بھیگ  
گیا۔ وہ تر لباس کے ساتھ ہی سعد کی خدمت میں حاضر  
رہا۔ اس نے پلیٹ میں بسکٹ سجائے اور پلیٹ میز پر  
کپ کے پہلو میں سجادی۔

”بھئی اندر اور باہر کے موسم مزاجا یکساں ہو  
جاتے ہیں“۔ سعد نے بات کی تو وہ چونک پڑا۔ وہ جانتا  
تھا کہ جذبوں کے کسی بلاخیز موسم میں ایسا لمحہ ضرور آئے  
گا، جب سعد کا ذہن گزرے وقتوں میں بھٹکنے لگے گا، پھر  
اس کا ضمیر وہ انجانی داستان کریدنے کی سعی کرے گا،  
جس کا مرکزی کردار ہونے کے باوجود وہ پتا سے شناسا

READING  
Section



کہنا کو دھوکہ دیا اور موقع پا کر بستی سے فرار ہو گیا۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ اس دم اس کی بیوی حاملہ تھی۔ ہاشم نے جواب دیا۔ ابراہیم بار پھر زور سے گر جا اور اس کی کڑک طول و عرض میں پھیل گئی۔ سعد کو محسوس ہوا کہ برق نے اس کا خرمن جلا کر بھسم کر دیا تھا اور شعلے اس کے لہو میں پھر رہے تھے۔

”کیا وہ حاملہ تھی؟“ اس کے گلے سے بمشکل نکلا۔ اگلے ہی لمحے وہ جذبوں سے مغلوب، اپنی راکٹک جیئر میں ڈھیر ہو گیا۔

”جی ہاں، سر!“ ہاشم نے جواب دیا اور سعد کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ آپ نے جاری طوفان کا مشاہدہ کیا سر! کہتے ہیں کہ شدت بھرا طوفان موسم کی ان رتوں میں ضرور آتا ہے سال میں ایک بار اور یہ ان وقتوں تک سر اٹھا تا رہے گا جب تک برسوں پرانی کہانی مکمل نہیں ہو جاتی۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لرز نے لگے تھے۔

”کون سی کہانی ہاشم؟“ سعد نے پہلو بدل کر بے چینی سے پوچھا۔

”گزری رتوں کی روداد ہے سر! اسی وادی میں دو چار بھرے دل سمجھا ہوئے تھے۔ ان کے دلوں میں امنگوں کی کلیاں کھل اٹھی تھیں، پھر زمانے نے ان کلیوں کو مسل ڈالا۔“ ہاشم کھڑکی کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں بیرونی مناظر پر ساکت ہو گئی تھیں اور لہجے میں تندی سرایت کر آئی تھی۔

اس کا دھیان کہانی پر مرکوز ہو چکا تھا۔ سعد نے جذبوں کی بڑھتی بے قراری میں اپنی راکٹک جیئر چھوڑ دی اور ہاشم کے قریب چلا آیا۔ اس نے بات کرنے کے لئے لب کھولے مگر ہاشم کو گویا پا کر خاموش ہو گیا۔

”ایسے ہی موسموں وہ گلغام باغ نگر آیا تھا۔“ ہاشم نے سعد کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ”وہ نوعمر زندگی سے

نہیں تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ جذبوں کا دھارا موضوع، طرف لے جائے گا۔ وہ اپنی نگاہیں جھکاتے ہوئے بولا۔

”آپ نے بجا کہا سر! وقتوں کے زرخیز موسم کبھی بلاخیز جساتیں جنم دیتے ہیں، پھر یہ کہانیاں بن کر انہی موسموں میں غرق ہو جاتی ہیں۔“

”معلوم نہیں ہاشم، ماہ و سال کے سلاسل میں چھپا ہوا خفتہ تجسس آج ذہنی نہاں خانوں سے کیونکر ابھر آیا ہے؟“ سعد نے معاملہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ اب وہ دل شکستہ اور قدرے بے چمن بھی دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر گفتگو میں خاموشی بسی رہی۔ ہاشم سوچوں میں غلطاں ہو گیا جبکہ سعد نے بند کھڑکی کے پہلو میں شیشوں کے قریب جا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس بیچ ہاشم دوبارہ گویا ہوا۔

”خواتین کہا کرتی ہیں کہ سعد ایک شاہزادہ تھا جو کہیں دور سے آیا تھا۔ شاید قسمت اسے یہاں پہنچ لائی تھی۔ پھر اس بستی کی ایک لڑکی اسے پسند آگئی جو پھولوں کی طرح خوبصورت تھی اور گل فروش تھی۔ دونوں کے بیچ پیار ہوا، پھر شادی ہو گئی۔ ایک روز شاہزادہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس کی شہزادی، کہنا تمام عمر راہیں نکلتی رہ گئی۔ شاہزادہ کبھی لوٹ کر واپس نہ آیا۔ شاید اسے اجل نے نکل لیا تھا۔ اس نے جب بستی چھوڑی تو اس دم طوفانی میٹھا برس رہی تھی۔ طوفان نے غالباً اسے شکار کر لیا۔ یوں اس کی کہنا بھی برباد ہو گئی۔“

ہاشم نے بتایا۔ یکا یک رعد کڑکی اور طوفانی بارش دھرتی پر غضبناک ہو گئی۔ سعد کا دل دہل کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے ہاشم کی طرف دیکھتا رہا، پھر اچانک بولا۔

”عورتوں کی سوچ سادہ لوحی پر مبنی ہو سکتی ہے، مزیک مرد کیا کہتے ہیں؟“

”سعد ایک دھوکہ باز شخص تھا۔ اس نے سادہ لوح



پور تھا۔ وادی نے اپنا حسین شخص پہلے ہی دیکھا تھا۔ اس نے ہر ملنے والے کو اپنی خوش فطرتی کی طرف راغب کر لیا۔ ہاشم نے نگاہیں اٹھائیں، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، لمحے رک سے گئے۔ تیز ہوا میں برکھا کا شور فراز کی طرف بڑھ گیا۔ سعد کے چہرے پر مُردنی چھا گئی تھی۔ اس نے قریبی میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا تو اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

ہاشم جانتا تھا کہ سعد کے وجود میں موجزن جذبوں کی تندی اس دم طوفانی رات کے ہم پلہ تھی اور اس نے اپنے آپ کو بے عذاب لمحوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اب وہ خاموشی سے سرگزشت سن رہا تھا۔ رفتہ رفتہ واقعات اس پر کچھ اس طرح عیاں ہوئے:

”جوانی کا سہانا دور تھا اور اس دم سماں بھی سہانا تھا، جب پہلی نظر ہی میں سعد گہنا پر فریفتہ ہو گیا تھا اور اس کے سامنے دل ہار بیٹھا تھا۔ کچھ یہی حال گہنا کا بھی تھا۔ باہم آنکھیں چار ہوئیں تو وہ چوٹ عیاں ہو گئی، جو دونوں نے کھائی تھی۔ گہنا نے آنکھیں جھکا لیں، مگر ان نگاہوں کی تپش اپنے وجود پر محسوس کرتی رہی، جو اسے لمحہ لمحہ گھائل کر رہی تھیں۔ یہ دونوں پر لڑکپن کی اچھوتی واردات تھی۔ انہوں نے کائنات میں کبھر سے رنگ دیکھنا شروع کئے تھے کہ ان کی کائنات میں بھی رنگ نکھر گئے۔ دونوں اس وقت شعور کی منزلوں سے دور تھے، کچھ شعور سے پہلو تکی بھی کرتے رہے، ان راہوں پر چل نکلے، جن کی تمنا دل تو کرتا تھا، عقل نہیں۔

ان کی باہمی ملاقاتوں کے لئے وادی میں بے شمار مقامات موجود تھے، جہاں وہ عوام الناس کی مجلس بھری نظروں سے اوجھل رہ سکتے تھے بلکہ گہنا تو پہاڑی جنگلوں میں چل کر جوان ہوئی تھی، اس نے سعد کو بھی پناہ گاہوں سے روشناس کرا دیا۔ گہنا سعد کے جنگلے میں بھی پہنچ جایا کرتی تھی، جہاں دونوں عمارت کے آگن میں بیٹھ کر

خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ شراٹھیری جنگلے کے ملازم نے کی تھی۔ اس نے دونوں کے تعلقات پر انگلی اٹھائی تھی۔ پھر بات ہر کسی کے ہاتھ سے نکل گئی۔ گہنا کو اس کی ماں نے سنبھالنے کی کوشش کی مگر بستی کے بڑوں نے عقلمندی سے کام نہ لیا اور دونوں کی شادی جبراً کر دادی۔ سعد کسی طور پر بھی ان کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ موقع پاتے ہی بستی سے جھپٹ گیا۔ اس طرح گہنا بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو گئی۔ سعد کہاں گیا؟ یہ بھی معصہ بن گیا۔ اکثر لوگوں نے اسے مجرم قرار دے دیا۔ افواہیں بھی جنم لیتی رہیں۔ چند ایک نے یہ بھی کہا کہ سعد نے ان کی آنکھوں کے سامنے پہاڑی چوٹی سے بڑساتی نالے میں چھلانگ لگا دی تھی اور یوں طوفانی رات کے دوران خودکشی کر لی تھی، مگر کوئی بھی لاش تلاش نہ کر سکا۔

شروع میں گہنا کو پختہ یقین تھا کہ سعد جلد اس کے پاس لوٹ آئے گا۔ اس کے نزدیک وہ اس سے پیار کرتا تھا اور پریمی دھوکہ باز نہیں ہو سکتے، مگر دن جب تیزی سے گزرنے لگے تو گہنا بھی مایوس ہونے لگی۔ اب وہ ماں کی پھنکاریں کثرت سے کھاتی تھی، جسے غربت میں بیٹی کا بوجھ ناتواں کندھوں پر بھائی دیتا تھا۔ جب انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہو چکی تھی تو ماں بیٹی پر گویا قیامت نوٹ پڑی۔

اس مرحلے پر بستی کے چند لوگوں نے شہر کا رخ کیا اور سعد کو کھوج نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور مایوس لوٹے۔ ماں بیٹی سعد کے تعاقب میں شہر نہیں جا سکتی تھیں البتہ ختمیے ماننے جا بجا خانقاہوں پر پہنچ جاتیں۔ مختلف عاتلوں سے ملتیں اور پیروں کے آستانوں پر پیسہ لٹاتی رہیں لیکن ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔

عام خیال تھا کہ گہنا کے ساتھ نکاح تحریر میں آ جاتا تو سعد کبھی یوں غیر متعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ گہنا کے پاس ایک کاغذ البتہ مودود تھا جو کسی رجسٹر پر شادی سے

READING  
Section



مندرجات ظاہر کرتا تھا۔

بنادیا تھا۔

سائے حیات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں مگر کہ:  
کی زندگی میں یہ بار بار آئے تھے۔ ہر نیا سانحہ پہلے سے  
زیادہ قیامت خیز ہوتا تھا۔ ایک روز اس کی زندگی کا کڑا  
المیہ بھی ظہور پذیر ہو گیا۔ اسی کی ماں اچانک انتقال کر  
گئی۔ محلے والوں نے دیکھا کہ بے کس عورت اپنے محن  
کل میں گری پڑی تھی اور وہیں ابدی نیند سو گئی تھی۔

ماں کی جدائی گہنا کے لئے تنہائی کا عذاب بن کر  
اتری۔ الم تو شاید وہ سہ جاتی مگر ان گھمبیر مسائل کا  
مقابلہ نہ کر سکی جو اس لیے کے باعث پیدا ہو گئے تھے۔  
اس کے خاوند کا رویہ بگڑ گیا تھا۔ سوتلا بیٹا اسے زہر لگتا تھا  
اور وہ اسے اپنے گھر میں کسی صورت پناہ نہیں دینا چاہتا  
تھا۔ وہ بچے کو اس بُری طرح دھتکار دیتا کہ وہ محرومی کی  
تصویر بن جاتا۔

آخر گہنا کو یقین ہو گیا کہ وہ حالات کے دورا ہے  
پر کھڑی تھی۔ اسے اپنے لخت جگر اور خاوند میں سے کسی  
ایک کا انتخاب کر کے اسے اپنانا تھا۔ مسئلہ گو پیچیدہ تھا مگر  
زیادہ سوچ کا متقاضی نہیں تھا۔ گہنا نے خاوند کا گھر چھوڑ  
دیا اور بیٹے کو اپنا لیا۔ وہ اجڑ کر آبائی گھر واپس لوٹ آئی  
اور دس سالہ بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔

دوران کی گردش میں محو سفر ہوئی تو گہنا کو یقین ہوتا  
گیا کہ اس کا بیٹا نارٹل نہیں تھا بلکہ اس کی نیم پختہ شخصیت  
نفسیاتی و معاشرتی مسائل کی آماجگاہ بن چکی تھی اور وہ عام  
بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ نو عمر، یاس اور خود رنجی کا شکار تھا،  
پھر اسے کسی پر اعتماد نہیں تھا اور وہ انسانی رشتوں کو بے معنی  
قرار دیتا تھا۔ وہ رویوں میں انتہا پسند ہو چکا تھا اور شدید  
انتقامی احساسات کا حامل دکھائی دیتا تھا، خصوصاً اپنی ماں  
کے خلاف۔ ماں ہی انکی ہستی تھی جو اس کے زیر عتاب رہ  
سکتی تھی اور وہ اسے زخم زخم کر سکتا تھا، زلا سکتا تھا، گو اس  
صورت میں خود بھی پہروں کڑھتا رہتا۔

جلد ہی دوراں وہ وقت لے آیا، جب الہزی گہنا  
کے آگن میں اس کے وجود سے تخلیق پانے والا بھی مہکنے  
کا۔ اسے جاوید کا نام دیا گیا۔ دنیا میں ایسے بچے بھی جنم  
لیتے ہیں جنہیں ماں سے غذا کے طور پر پیار تو مل جاتا ہے  
مگر ان کے حصے میں کوئی بھی بہت آتے ہیں۔ توجہ  
انہیں کم ملتی ہے مگر مدد و جہی کی سزا زیادہ۔ ان کی طرف  
بد دعاؤں میں بھی کمی نہیں آتی۔ انہیں باور کرایا جاتا ہے  
کہ وہ بلا جواز منحوس نہیں کہلاتے۔ انہیں ملنے والی معمولی  
خیر سگالی میں رحم اور ترس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے  
ہیں۔ ایسے بچے خورد و پودوں کی طرح پرداخت پاتے  
ہیں۔ یہ بچے اگر اقرباء سے نفرت کرنا سیکھ جائیں تو جو  
پہلو بھی بلا جواز نہیں کہا جاسکتا۔

بنارس باغات کا مالی تھا۔ اس کے گھر میں بھی اسی  
نوع کا بچہ موجود تھا جسے ماں جنم دیتے وقت مر گئی تھی اور  
بچے کو باپ نے پانچ برس پر دان چڑھایا تھا۔ بنارس مالی  
اب بچے کے لئے متا کی مٹھاس پانا چاہتا تھا اور اس  
ناٹے اپنے گھر آگن میں بہار بھی۔ وہ گہنا کا گردیدار ہو  
چکا تھا۔

”یہ کیسا انصاف ہوگا کہ آپ کے بچے کو تو پیار مل  
جائے مگر میرا لخت جگر اسی پیار سے محروم ہو جائے؟“ گہنا  
نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا مگر اس کی اپنی ماں یہ ناٹہ  
قبول کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں جہی کا  
گھر بسا دینا چاہتی تھی، خصوصاً جبکہ اس کو خود اپنی زندگی کا  
بھروسہ نہیں تھا، گہنا کا بچہ البتہ وہ خود اپنا لیتا چاہتی تھی۔

معصوم سا بچہ جاوید، شادی کے موقع پر جب اپنی  
ماں سے جدا ہوا تو محرومیوں نے اس کی شخصیت پر گہرے  
اثرات مرتب کئے۔ وہ اپنی ننھی سی دنیا میں تنہا رہ گیا، پھر  
تنہائی پسند ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ کئی منفی رویوں کا شکار  
ہو گیا۔ پیار۔ نرد۔ سے اسے سخت گیر اور کھوڑ دل بھی

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ بستی کی مسجد کے قریب نو جوان لڑکے ایک معلم سے ملا کرتے تھے۔ جس نے انہیں افغان جہاد میں حصہ لینے پر ابھارا تھا۔ جاوید اسی شخص کی تعلیمات سے متاثر ہوا تھا۔ بستی کے دیگر لڑکے معلم کے قابو نہ آئے مگر وہ اور جاوید مقدس جہاد میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ دونوں کو مختلف اوقات میں دور دراز علاقوں میں بھجوا دیا گیا۔ دونوں کے ٹریننگ کیمپ علاقہ غیر میں واقع تھے۔ مذکورہ لڑکے نے جاوید کو وہاں کہیں دیکھا تھا۔

لخت جگر کے بارے میں خبر گہنا پر بجلی بن کر مگری۔ اسے اپنا اور بیٹے کا مستقبل خود کش شعلوں میں جلتا ہوا دکھائی دیا۔ جہاد کتنا تبرک ہو سکتا تھا، وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی۔ اس نے بستی کے کرتا دھرتا افراد کے سامنے گریہ زاری کی، جو اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ طویل اور آن تھک محنت کے بعد گہنا بالآخر اس معلم تک پہنچ گئی، جو مختلف آبادیوں سے جہاد کے لئے نو عمر لڑکے جمع کر رہا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ جاوید کو اسی نے علاقہ غیر میں بھجوا دیا تھا۔ گہنا کے حالات بھانپنے کے بعد اس کا دل پہنچ گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی سی کوشش کرے گا کہ جاوید کو گھر واپس پہنچا دے۔

چند روز بعد اس نے گہنا کو اپنی ناکامی کی خبر سننا دی۔ بتایا کہ جاوید کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی لہذا اسے کیمپ سے واپس لانا ناممکن نہیں رہا تھا۔ مزید براں نو جوان اب عاقل اور بالغ ہو چکا تھا۔ صحیح حقائق آشکار ہونے پر گہنا کا جسمانی عارضہ تیزی سے بڑھ گیا۔ وہ صحن گل میں مشقت کے قابل بھی نہ رہی۔ زندہ رہنا اس کے لئے اور بھی کٹھن ہو گیا۔

زندگی میں بار بار اس کی تمناؤں کی مالا ٹوٹی اور بھری تھی مگر جیون کے اس مرحلے پر وہ اس قدر مایوس ہو چکی تھی کہ زندہ رہنے کی آرزو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

ماں جو کہتی، وہ اس کے برعکس کرتا تھا۔ اس پہلو بد مذہب بھی دیکھنے لگتا۔ اس میں اعتماد کی شدید کمی تھی، اس نے تعلیم میں اس کی دلچسپی معدوم ہو چکی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گھر سے غائب رہتا تھا۔

ماں کو ستانے کی خاطر وہ کئی حربے کرتا۔ پورا پورا دن کھانا نہ کھاتا۔ بے چاری منتیں کرتی رہ جاتی۔ سخت گرمی میں پنکھا بند کر دیتا اور سخت سردی میں گرم لباس سے اجتناب کرتا۔ ہر وہ کام کرتا جس سے ماں کا دل سرزد خطاؤں پر پھپھکتا۔

ماں کی خسریت تھی کہ وہ کسی طرح میٹرک تک تعلیم حاصل کر لے مگر وہ بڑی صحبت کا شکار ہو گیا۔ اس دور میں ماں نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنی روش تبدیل کرے، اس کے آگے ہاتھ جوڑے، اپنی خطاؤں پر معافی چاہی، آنسو بہائے مگر بیٹے سے بات نہ منوائی اور مجبور محض بن کر رہ گئی۔ پھر وہی ہوا جس کا احباب کو خدشہ تھا۔ بیٹا امتحان سے قبل ہی گھر سے فرار ہو گیا۔ ایسا گیا کہ اس کی خبر تک نہ ملی۔ ماں اپنی محرمیوں پر روتی رہ گئی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی کوتاہیوں کی تلافی نہ کر سکی تھی۔

بیٹے نے گھر چھوڑا تو ماں بھی اپنے مستقبل سے مایوس ہو گئی۔ صحن گل میں مشقت کرتی تو ساتھ آنسو بہاتی رہتی۔ کبھی حالات سے اس قدر مایوس ہو جاتی کہ اپنے لئے اجل کی دعائیں مانگنے لگتی۔ اب وہ جیون کو سزا سمجھنے لگی تھی۔

کڑے حالات کا بوجھ اسی کی قلبی صحت پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ وہ زندہ لاش کی طرح نظر آنے لگی۔ وقت اپنی چال چلتا رہا۔ اسی طرح دوراں کی گرد ماہ و سال پر جمی رہی۔ پھر اس کی زندگی میں ایک بھونچال اور آب و بستی میں خبر پھیل گئی کہ ایک روز اچانک جاوید کو ملکی سرحد کے قریب جہادی کیمپ میں دیکھا گیا تھا۔ علاقے کا ایک لڑکا کیمپ سے فرار ہو کر اپنی بستی پہنچا تھا۔ اس نے ماضی

READING  
Section



رہے۔ ماں ٹھنکی ہاندھے جواں سال کی طرف دیکھتی رہی۔ اس بچ اس کی آنکھوں میں اشک بھی لریزاں ہو جاتے اور چند چہرے پر پھسلنے لگتے۔ اس حالت میں وہ انتقال کر گئی۔ مسرتے وقت اپنے کلڑیل بیٹے کی ہانہوں میں ترپتی رہی۔ بیٹا اس کی دنیا میں اس وقت لوٹا تھا جب وہ اس کندھا دے کر محض اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا سکتا تھا۔ وہ حواس پر بوجھ نئے ان مراحل سے گزر گیا مگر جب گھر میں تھا ہوا تو زندگی اس پر بوجھ بن گئی۔ یادوں کے سہارے اس کا جینا مشکل ہو گیا۔ پچھتاوے اس کے ذہن میں ابھرتے تو ان سے تشفی پاتا اسے ممکنات سے بےید دکھائی دینے لگتا۔ اشک بھی اسے تسلی نہ دے پاتے۔ کبھی وہ ادھام کا شکار ہو جاتا۔ ایک کمرے میں ماں کا جنازہ دیکھتا تو دوسرے دروازوں کے پیچھے مانی کا جسد خاکی۔ ان حالات میں اس کا ذہنی سکون کسی طرح اکارت ہو گیا۔ وہ انسانی روابط سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ اس کے ماضی کے باعث احباب اس سے کتراتے تھے۔ کچھ خود بھی وہ زیادہ ہی اکثر مزاج دکھائی دینے لگا تھا۔

کئی دنوں کا مذاق جھیلنے کے بعد ایک شام اس نے قریبی مسجد کی راہ لی۔ نماز کے بعد خدا کے گھر میں وہ نرمی طرح رو پڑا۔ اس نے نمازیوں سے التجا کی کہ وہ اس کے لئے ذہنی سکون کی وعامائیں اور معمول کی زندگی میں واپس لوٹ آئے میں اس کی مدد کریں۔

اگلے روز اس نے بھرپور مشقت شروع کر دی۔ گھر کا آئین کھودا، پھر اسے کیاریوں میں منقسم کر دیا۔ زمین کے حصے بخرے کر کے مٹی کو زرخیز کیا اور گھر میں پودوں کی نرسری کا اہتمام کر لیا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور جلد ہی محکم کل پوری آب و تاب سے مہکنے لگا۔ شغل ترقی کی طرف بڑھتا تو "گہنا نرسری" کی چھت بھی گملوں سے بھر گئی۔ باہر کی جانب متعلقہ سائن بورڈ بھی آویزاں ہو گیا۔ جاوید کو حیات کا یہ ثبوت پہنو بھا گیا۔

چاہتی تھی کہ اس کے سانسوں کی ڈوری چلتی رہے، مگر حالہ کو اپنے ہاتھوں سے گلے لگا لیتا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ہر صبح نئی یاس لئے شام کا انتظار کرتی اور پھر شب گزارنے کی سعی شروع کر دیتی۔ بالآخر ایک صبح تھک ہار کر گر پڑی اور ہسپتال پہنچ گئی پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی۔

جاوید تین سال جنگی میدانوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس بچ دنیا نے اسے کئی تجربوں سے ہمکنار کیا۔ اب وہ جہان کارزار میں کندن مانا جاتا تھا۔ یہی نہیں اس کا وجود بھی کڑیل جوانی میں ڈھل چکا تھا۔ کرسنگی اس پر طاری ہوتی تو وہ ہیبت ناک دکھائی دینے لگتا تھا۔ وہ مدت بعد گھر لوٹا تو محکم کل میں نہال کھلائے ہوئے تھے۔ مکان کے دروازے کھلے تھے مگر کیمین وہاں موجود نہیں تھے۔ ویرانی دروازہ پر منڈلا رہی تھی۔ جاوید گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا اپنا حلیہ بھی بدل چکا تھا۔ چہرے اور سر کے بال بے ہنگم طور پر بڑھے ہوئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے جاننے والے اسے پیچون نہیں پارے تھے۔ اس نے محلے میں واقع قریبی کریانہ سنور کے مالک سے بات کی تو ماں کے بارے میں دریافت کیا، پھر معاملہ جان کر سبے حد پریشان ہو گیا۔ وہ خیراتی ہسپتال کے دروازے پر پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ اس کے دل پر خوف طاری تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر وہ انتہائی رنجیدہ ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے قدم چھو کر معافی کا خواستگار ہوا اور اپنا چہرہ اس کے پیروں میں رکھ کر بری طرح رو پڑا۔ وہ ماں کے پاؤں چومتا رہا حتیٰ کہ وہ اس کے اشکوں سے تر ہونے لگے۔ گہنا اپنے طور پر حرکت کرنے سے قاصر تھی، بمشکل بیٹے کو سنبھال پائی۔ اسے پکارتی رہی۔ "میرا بی قصور تھا اخت بھرا میں نے ہی تمہیں لاوارث کر دیا تھا۔" اب گہنا بھی نرمی طرح روسنے لگی تھی۔ مان جینا کچھ دیر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے

READING  
Section



میں بسکون زندگی گزارنے کا جدبہ نمود پائے لگا۔

چند برس اس طور گزرے ہوں گے کہ وطن کی بے سکون فضاؤں میں بھی فتنہ و تخریب کے شعلے بھڑکنے لگے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آتش دور دور تک پھیل گئی۔ کئی بے گناہ ہم وطن دہشت گردی کا لقمہ بننے لگے۔ آگ تیزی سے حدیں عبور کرنے لگی۔ ایک تنظیم کے کارندوں نے جاوید کو بھی کھوج نکالا جسے اچانک معلوم ہوا کہ وہ اپنے پر تخریب ماضی کے باعث دہشت گردوں کا اسیر بن چکا تھا اور اب قتل و غارتگری کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا۔ اسے اپنے ان آقاؤں کے اشاروں پر چلنا تھا جنہوں نے اس کا یہ روپ تخلیق کیا تھا۔

جاوید نے انسانی جانوں کا ناقابل یقین ضیاع قریب سے دیکھا تھا مگر اپنے وطن میں اس نوع کے ایسے سے بچنے کے لئے اپنی جان خود سے لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا اگلا مشن کیا تھا۔ اسے یہ بڑا خطر کام مرضی کے خلاف فوراً ہی کرنا تھا کیونکہ زبردست کا ٹھینکا اب اس کے سر پر تھا۔

جاوید نے مہیا کی گئی عینک پہنی تو حیران رہ گیا۔ عینک کے فریم میں ماسکرو کیمرے آویزاں کئے گئے تھے۔ اس نے مسجد میں نماز پڑھی تو ساتھ ہی کئی فوٹو بھی حاصل کر لئے جو مختار اور علاقہ میں تخریب کاری کے لئے ضروری تھے۔ اس دوداں اس کے دلوں پر خوف بھی طاری ہوا کیونکہ اس کے طفیل ایسے مقام پر خون خرابہ ہوئے والا تھا۔ جو اس کے رب کا مگر قرار دیا جاتا تھا۔

مسجد پر خود کش حملہ ہوا تو وہ اسی علاقے میں موجود تھا بلکہ وہی خود کش بمباروں کو وہاں تک لے کر آیا تھا۔ بد قسمتی سے یہ تخریبی منصوبہ وقوع پذیر ہوا اور دشمنانِ وطن کی توقع سے بڑھ کر کامیاب رہا۔ ایسی تباہی پائی کہ

انسانییت رو پڑی۔ ہندوؤں نے بے تحاشہ شعلے اگلے، رستی ہم بھی پھٹے، پھر رہی کسی کسر خود کش حملہ آوروں نے پورن کر دی۔ نماز جمعہ کے دوران خانہ خدا الہولہو ہو گیا۔

انسانی جسموں کے پھٹنے سے ہر طرف بکھر گئے۔ آہ و بکا تھی کہ آسمانوں تلک جاتی تھی۔ کئی افراد شہید ہوئے تو بے شمار زخمی تڑپتے رہے۔ بچ جانے والے اپنے پیاروں کو ڈھونڈتے رہے۔ قیامت منبری کا ساں تھا۔ تباہی کے یہ منظر جاوید نے بھی دیکھتے تھے، وہ حواس باختہ ہو گیا اور اسی بھگدڑ میں بطور مشتبہ پکڑ لیا گیا۔ اس کے دو اور ساتھی بھی دھر لئے گئے۔

عدالت میں تینوں اشخاص نے اعتراف جرم کر لیا۔ جاوید واحد شخص تھا جس نے نمازیوں پر فائرنگ نہیں کی تھی مگر وہ اپنا مقدمہ بھرپور طور پر نہ لڑ سکا اور سزائے موت کا مجرم قرار دیا گیا۔ اس کے باقی ساتھیوں کو بھی یہی سزا ملی۔ بعد میں اور گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں۔



ہاشم نے سعد کو اس کی کہانی سنائی تو سمجھ گیا کہ سامع کا دل مندا ہو چکا تھا کہانی کے لفظوں نے اسے ڈس لیا تھا اور اب وہ بڑی طرح رو رہا تھا۔ اس کا وجود جذبوں کی شدت سے لرز رہا تھا اور اس کی ذہنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ بڑی طرح ٹوٹ چکا تھا۔

”میں جاوید سے بھی بڑا مجرم ہوں، بیٹے کا بھی دشمن رہا اور اس کی معصوم صفات ماں کا بھی“۔ سعد نے دلاؤ بھری لرزیدہ آواز میں کہا اور دوبارہ اونچی آواز میں رو پڑا۔ اب وہ اپنے اعصاب پر قابو پانے سے قاصر ٹل رہا تھا۔

طوفانِ بادِ بارانِ تندوں میں عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ابر پوری تاب سے دھرتی پر ٹکرا رہا تھا۔ باد بھر پور تھی۔ پہاڑ رعد کی گونگڑاہٹ میں تڑپتے تھے۔ غضب دھرتی پر بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا، بارش کبھی نہیں سمٹے گی۔ یکایک

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



تھا۔

سعد اپنے شہر پہنچا تو رات گزر چکی تھی اور سحر طلوع ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی بروقت دیکھا اور ڈرائیور کو جیل اپنے دفتر جانے کا حکم دیا۔ دفتر آنے کا یہ وقت سعد کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ کئی بار ایسے ہی اوقات میں اپنے دفتر آتا رہا تھا، خصوصاً جبکہ اسے پھانسی کے ناگوار مراحل کی نگرانی درپیش ہوا کرتی تھی۔ آج اسے چھٹی حس وہاں لے آئی تھی۔ فوراً ہی اسے جیل میں پھانسی کے اہتمام کا اندازہ ہو گیا مگر شاید اسے آنے میں دیر ہو چکی تھی۔ اس کا ڈپٹی مجرم جاوید کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد لوٹ رہا تھا۔ ڈپٹی کے ہمراہ سعد اپنے دفتر پہنچا تو دونوں کے ذہنوں پر جاوید کا آخری سفر چھایا ہوا تھا۔

”حیرت کی بات ہے سر! اس مجرم کا نہ تو کوئی ملاقاتی آیا اور نہ ہی اس نے اپنی کسی آخری خواہش کا اظہار کیا، عجیب شخص تھا، بس چپکے سے مر گیا۔“ ڈپٹی نے آدھرتے ہوئے کہا۔

”کبھی رشتے بعد از مرگ بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔“ سعد نے ڈپٹی کو جواب دیا۔

”کیا آپ اس کے احباب کو جانتے ہیں؟“ ڈپٹی نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں، اس کے بد نصیب باپ کو۔“ سعد نے بات کی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”کون ہے وہ؟“ کئی گمان ڈپٹی کے ذہن میں ابھر آئے تھے۔ اس کی صدا تقریباً چیخ کی صورت بلند ہوئی۔

”اس کا باپ تمہارے سامنے کھڑا ہے، دوست! پریشان حال، وہ اپنے بیٹے کی لاش لینے آیا ہے۔ اس کی بانہوں میں اس کے جواں سال لخت جگر کی لاش ڈال دو۔“ سعد نے کسی حد تک حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا۔

”سمجھ میں نہیں آیا، سر!“ ڈپٹی اب انتہائی پریشان

خیال سعد کے ذہن میں برقی کی طرح گونڈ گیا۔ باغ نگر رہائگی سے پہلے جاوید نامی جوان کو وہ خود پھانسی کی کال ٹوٹھڑی میں ڈال آیا تھا۔ سعد کے دماغ میں ایک چہرہ معلق ہو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ قیدی جاوید اس کے لخت جگر جنید کا ہم شکل تھا اور دونوں میں اس قدر مماثلت تھی کہ وہ خود بھی دھوکہ کھا گیا تھا۔ بعد ازاں وہ بہت حیران بھی رہا تھا۔

”گویا پھانسی کا مجرم میرا اپنا بیٹا تھا۔“ سعد زرب لب بڑبڑایا، اس کے چہرے پر ابھرتے ہوئے تاثر میں اب بلا کی جھنجھکی تھی، الم تھا۔

”ہاشم! میں اسی وقت شہر لوٹ جانا چاہتا ہوں۔“ وہ بے چینی بے عالم میں بولا۔

”مجھے معلوم تھا کہ یہ کہانی آپ کو بہت پریشان کر دے گی۔“ ہاشم کی صورت پر بھی پچھتاوے چھانے لگے تھے۔

”ہاشم! یہ کہانی میرے نصیب کا حصہ تھی، میری لغزش، آخر میرے سامنے آئی تھی۔“ سعد نے دکھے ہوئے لہجے میں بات کی۔

”مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو میں دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔“ ہاشم کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

”مجھے واپس جانا ہے، ہاشم!“ سعد نے ارادے کا اعادہ کیا۔

”شب کی ظلمت گہری ہے اور وفان بھی شدید، سر! آپ ارادے پر نظر ثانی کر لیں۔“ ہاشم کے لہجے میں ہمدردی تھی اور انداز منت کا مگر سعد اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ کہانی کے تانے بانے اس کے دماغ میں الجھ چکے تھے۔ اب اس کے لئے وہاں ٹھہر جانا بہت مشکل تھا۔ اسی عالم میں اس نے باغ نگر چھوڑا اور شدید طوفانی رات میں شہر کی طرف چل پڑا۔ تمام راستہ وہ طوفانوں سے لڑتا رہا۔

”اندرونی سلام بیرونی تند موسموں سے زیادہ بلائیز

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



نظر آ رہا تھا۔ بات سن کر سعد نے جو دیا دیکھتے ہی ہنسنے لگا۔  
دیر سے دھیر سے کہا۔

”اس جواں عمر کی رہنمائی میں اس کی زندگی میں  
نہیں کر سکا، اب نصیب میرا منہ چڑھا ہے کہ میں اسے  
اپنا کندھا دے کر موت کی اندھیری کوٹھری تک پہنچا  
دوں۔ اس نے اپنی ماں کا چہرہ اس کے مرتے وقت دیکھا  
تھا، اب اس کی اجل نے مجھے اس سے متعارف کرا دیا  
ہے۔ ہم ان تلخ حقائق پر گریہ تو کر سکتے ہیں مگر انہیں  
تبدیل نہیں کر سکتے۔ فطرت نے ہمیں حقوق و فرائض کا  
کھل دستور عطا کیا ہے، غلطی ہم ہی سے ہوتی ہے، ہم  
فطرت کے تقاضوں سے پہلو تہی کرتے ہیں اور وقتی طور  
پر اپنے آپ کو کامران بھی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔  
سعد نے بمشکل الفاظ ادا کئے۔

تھوڑی دیر بعد پوچھی گھاٹ سے ایک لاش اس  
کے پاس پہنچ چکی تھی اور وہ غمزہ اس کے پہلو میں دھیر ہو  
نظر آ رہا تھا۔

اس وقت وہ انتہائی ماندہ اور بے بس دکھائی دے  
رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ڈپٹی کے سہارے کی ضرورت  
پڑی۔



عدائے کے معززین جمع ہو چکے تھے۔ گہنا زسری کا  
افتتاح تھا۔ سعد نے فیٹا کاٹنے کے لئے قیمتی اٹھائی تو اس  
کے ہاتھ کاٹنے لگے۔ بعد ازاں یہ افتتاح ایک مشہور سماجی  
شخصیت نے کیا۔ گہنا زسری اب بنات کی افزائش گاہ  
نہیں تھی، بلکہ نادار بچوں کی درس گاہ کا روپ دھار چکی تھی۔  
لوگوں نے دیکھا کہ نو تعمیر شدہ عمارت کا صحن اس روز بھی  
احمریں گلوں سے دھک رہا تھا، مگر اس دم کئی مدعوئین کی  
”کھنوں میں اشک تیر رہے تھے۔



## دعائے مغفرت

”حکایت“ کی مستقل قاریہ محترمہ آسیہ ظنون  
ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئیں۔

إِنِّ لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مرحومہ ایم اے اسلامیات اور پمفٹر ہیڈ  
مسٹر بیس گرلز ہائی سکول سمڑ ہالی تھیں۔ اللہ  
تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور جوار  
رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر  
جمیل عطا فرمائے۔ قارئین دعائے مغفرت  
فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

یاد رہے کہ مرحومہ ”حکایت“ کے ہر پمفٹر کا قلمکار  
مولانا محمد افضل رحمانی کی ہستی تھیں۔ ادارہ  
ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

”حکایت“ کے ایک اور مدیر قاری

محمد آزاد صاحب گاؤں

مجبوری ایبٹ آباد قضاے الہی سے انتقال کر  
گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور  
جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے  
پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ان  
کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے  
دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔ (ادارہ)

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



## غزل

خادم حسین مجاہد

جس کو مسجد میں بھی خدا نہ ملا  
اس کو دنیا میں کچھ ملا نہ ملا  
تیری بستی کے اتنے لوگوں میں  
کوئی بھی مجھ کو باوفا نہ ملا  
باٹ لیتا میں اس سے خیراتیں  
مجھ کو لیکن کوئی گدا نہ ملا  
جس کی فرقت میں دل ٹڑپتا رہا  
ایک لمحہ بھی وہ جدا نہ ملا  
جس نے مانگی پناہ تھی حاکم سے  
کوئی دروازہ اس کو وا نہ ملا  
کوئی آیا بھی اور چلا بھی گیا  
پر مجھے حرفِ مدعا نہ ملا  
جس کو پوجا تھا عمر بھر خادم  
اُس کے در سے بھی آسرا نہ ملا

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



# آگاس پیل

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی زندگی میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات

عبدالرحمن انجم

☆ 10: قسم



READING  
Section

SCANNED BY AMIR



خاندان بھی جب حویلی پہنچا تو وہاں صفہ ماتم  
ہمارا بچاؤی گئی تھی۔ بے ہوش لڑکے کو پہلے ہی ہسپتال  
لے جایا جا چکا تھا۔ اسے کلہ پیپ کی خبر نہ تھی، انجانہ کی  
تکلیف ہوئی تھی۔ سنتو ہائی محلہ کی عورتوں کے درمیان  
ٹیمھی بین کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد علاقہ کے تھانیدار نے کہا کہ لاش  
نہ ملے۔ لے لے اہل محلہ میں سے تم از کم ایک اچھی کروڑا  
تھنیں اور تم نو جوان پولیس ٹیم کے ساتھ تھنیں گاؤں  
چلیں۔ پولیس پارٹی کے ساتھ تھنیں گاؤں جانے والی محض  
کی چار افراد کی ٹیم میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

تھنیں گاؤں جانے والی پولیس پارٹی کے ساتھ  
جہاں محلہ کے ہم افراد بھی شامل تھے وہاں شہر کے پولیس  
تھانہ جو (T.I.C) تک کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی بھی  
ایک علیحدہ ٹیم ہمارے علاقہ کی پولیس پارٹی کے ساتھ گئی  
تھی۔ T.I.C سے مراد Thoroughly

Investigation Cell تھا یعنی اس خاص تھانہ میں  
اندھے لہل، بڑی ڈکیتیوں جیسے پیچیدہ جرائم کی جڑی  
باریک بینی، سائنٹفک اور جدید طریقہ سے انویسٹی گیشن  
ہوتی تھی۔ اس قسم کے خصوصی نوعیت کے تھانے برصغیر  
کے بڑے شہروں میں قائم تھے۔ T.I.C تھانہ کے ایس  
ایچ ایسٹر پونم نے مجھے اور محلہ کے ایک بڑے گروہ  
نصیر الدین کو اپنی جیب میں بٹھالیا تھا۔

ایس ایچ ایڈ پونم شکل و صورت، بول چال سے ایک  
عام روایتی کرخت اور سخت زبان پولیس والوں سے ہٹ  
کر بڑا خوش اخلاق، ملائم زبان اور سلجھا ہوا انسان لگ رہا  
تھا۔ دونوں تھانوں کی پولیس جیسٹس کمرے سیلابی پانی کو  
چیرتی ہوئی تھنیں گاؤں کی طرف کچے راستوں سے  
گزر رہے تھیں۔ دوران سفر اس نے کرید کرید کر میرے  
اور کلہ پیپ کے بارے میں اتنے اسے سیدھے سوالات  
کئے کہ بخدا میرا دل کیا کہ میں اس سے لڑوں لیکن مجھے



READING  
Section

اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ  
T.I.C کا تھانیدار تھا اور وہ ایسا کرنے کا عوار تھا۔ اس کے  
اس تھانہ سے مجھے تھنیں کی کہ میں اور ماٹراں کو اس نروں  
جس کی تکمیل کے بعد کسی بھی اندر پاس کو پولیس میں  
ہا آسانی نہ لڑی مل جاتی ہے۔ میں اس بات کو کہہ کر است  
ہا لٹا رہا۔

"سنا ہے تمہاری عہد پیپ سے بچپن کی داستان کافی  
کی دوستی تھی" تھانیدار نے ہاتھ پاؤں میں کہا۔  
پچھلے دنوں نہاری اس سے اور اس کے چچا کی بھائی ماٹرا  
خوئی لڑائی ہوئی تھی اور محلہ پیپ چھری کے نام سے شدید  
زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے ذرا بتاؤ کہ تمہاری اتنی پرانی تھنیں  
دوستی اچانک اتنی کڑوی دشمنی میں کیسے تبدیل ہو گئی؟

میں نے اسے اس لڑائی کی جو ہو رہی تھی۔ یہ تھنیں  
کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ سمجھ گیا کہ کافی رپورٹ  
مختلف ہوا است بی صورت میں ہا تک چ پچھلے سے تھو  
ساتھ ایک سفید کاغذ پر مجھ پواتا تھا۔

"ستارا تم نے میٹک تو کر لیا ہے" پونم صاحب  
نے مجھ سے کہا۔ "اگر تم اپنے اچھے کیرئیر کے لئے تھنیں  
چار ماہ کے لئے صرف ایک کورس کرنے کی تو پانی دوتھ  
پولیس میں بھرتی ہو سکتے ہو اور ویسے بھی تم وائٹ پائٹ  
میں ایک ہی سیٹ میں رہ رہے والی نوکری کر رہے ہو۔  
میری مانو جیسا میں کہوں دیا کر لو۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔  
"مجھے بھلا پولیس کی کون نوکری دیے گا؟"

"اورے تم اگر دل سے ان اچھے کو چھوڑ دیتے اور  
ہمت کرو تو میں تمہاری باقاعدہ رہائی بھی کروں گا۔" پونم  
صاحب نے کہا۔

دونوں جیپوں کے ڈرائیوروں کے لئے گاڑیاں  
آگے بڑھانے انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں جیپوں کے  
انجنوں سے بڑی دلخراش چرچاہٹ کی آوازیں آ رہی



نہیں چھپیں۔ انہیں دھکا لگاتا ہوا ہم سب لوگوں کے کپڑے کچھڑ میں بڑی طرح سن پٹے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دھکا لگانے والوں میں تھانیدار پونم بھی اپنا برابر کا حصہ ڈال رہا تھا۔ گھنٹوں گھنٹوں گارے زدہ سیلابی پانی سے گزرتے ہوئے ہم سارے لوگ جب گاؤں اس مقام پر پہنچے جہاں اس علاقے کی پولیس اور کچھ لوگ کھڑے تھے ہماری نگاہوں کے سامنے کھد پپ کی ہاتھ بندھی لاش کچھڑ میں اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے دل پر قابو نہ رکھا۔ گاؤں میں دھماکیوں جیسے ہی اس سے اپنے لگا تو بجلی کی رفتار سے زیادہ پونم کی آئی سی کے ایک سپاہی نے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”خبردار! لاش کو ہاتھ نہ لگانا۔ بے وقوف لڑکے تمہاری اس جذباتی حرکت سے ہماری انویسٹی گیشن کتنی بڑی طرح متاثر ہوتی تمہیں اس کا احساس نہیں ہے۔“

میں اپنا غم اپنے دل میں گھونٹ کر ایک طرف روستے ہوئے کھد پپ کے مردہ جسم کو دیکھنے لگا۔ کھد پپ کی لاش کے پاس شخص علاقہ کا تھانیدار اس کے ساتھ چند سپاہی اور چند دیہاتی کھڑے تھے۔

پونم نے وہاں کھڑے علاقہ کے تھانیدار سے کھد پپ کی لاش ملنے کی تفصیل پوچھی تو اس نے وہاں کھڑے ایک نوجوان دیہاتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔

تھانیدار پونم نے اس دیہاتی سے کچھ سوالات کئے تو اس نے اپنا جو بیان دیا مختصر اس طرح تھا۔

حالیہ آنے والی بارش میں میری دو بھینسیں بہہ گئی تھیں۔ مجھے کسی نے بتلایا تھا کہ چند زندہ بھینسیں اس علاقہ میں موجود ہیں۔ میں جب اپنی بھینسوں کو ڈھونڈنے اس جگہ آیا تو یہاں یہ شخص اسی حالت میں مردہ ملا تھا۔

تھانیدار پونم نے سب سے پہلے کھوجی کو کہا کہ تم اپنا

تھیں۔ نئی جگہ ہماری جیب چلتے چلتے رکی۔ ڈرائیور نے اور سپاہیوں نے مل کر اسے دھکے لگائے۔ ہماری منزل مقصود جب کچھ دور رہ گئی تھی تو ہماری جیب کا کوئی ایسا پڑھ بڑی زوردار آواز سے ٹوٹ گیا جس سے جیب بالکل سالت ہو گئی۔ اسے نی آئی سی کی جیب کے ساتھ سے کی مدد سے باندھا گیا۔ ابھی جیب سے سوائے ڈرائیور کے تمام سپاہی بے تھانیدار بھی اتر گیا۔ سب نے کچھ جیب کو دھکا لگانا شروع کیا۔ کچھ زدہ اور پھسلن والی زمین میں قدم جمانا اور دھکا لگانے کا عمل کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

ایک مقام پر دونوں جھپٹیں رئیس۔ ہمارے علاقہ اور نی آئی سی تھانیداروں نے علیحدگی میں کچھ صلاب مشورہ کیا اور پھر مجھے جھپٹیں جیب میں بٹھلادیا گیا اور میری جگہ جولا کا بیٹھا تھا اسے کئی جیب میں نے گھسنے۔ وہاں بیسیں بڑی آہستگی اور احتیاط سے خراباں خراباں سڑک کے اس حصے میں چل رہی تھیں جہاں کالیول اونچا اور پانی کم تھا۔ شخص گاؤں تقریباً چار میل کی دوری پر تھا۔

دونوں جھپٹیں آگے پیچھے اپنی مخصوص رفتار میں چلتی رہیں۔ کچھ دیر کی مسافت کے بعد پولیس کی یہ دونوں جھپٹیں ایسی حدود میں داخل ہوئیں جہاں کا پورا علاقہ سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ جھپٹوں کے تمام شیشے اس طرح سے چڑھائے گئے تاکہ چھینے اڑ کر اندر پانی نہ آئے۔ دونوں جھپٹوں کے تار پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”لگتا ہے اس دفعہ برساتی بارش نے کچھ زیادہ ہی تباہی مچائی ہے۔“ ہماری جیب کے ڈرائیور نے کہا۔

”ہاں، واقعی اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ ایک اسی عمر کا ٹینیل نے کہا۔ ”اس بار برصغیر کے کئی شہروں میں پچھلے سالوں کی نسبت شدید بارش اپنے ساتھ تباہی کے کرائی ہے۔“

پولیس کی دونوں گاڑیاں کئی جگہ دلوں کے پانیوں

READING  
Section



کام شروع۔ (کھوتی اور پولیس کا نوٹوگرافر ساتھ تھے) پولیس نے کھوتی نے سب سے پہلے کلدھپ کی لاش کے قریب کی زمین کا جائے کیا اس نے وہاں کھڑے سیلابی پانی کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے تنہا کرکے کھڑے تلاش کئے۔ اس کے بعد اس نے اپنی رپورٹ میں کچھ لکھا۔ کلدھپ کی لاش کی پولیس کے نوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے چند تصاویر لی۔

”لاسا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟“ تھانیدار پوچھنے لگا۔

”اگر سیدھی سڑک سے وہاں جایا جائے تو وہ دور ہے۔ لیکن اگر کچے کچے دھوار اتنے سے جایا جائے تو اس کا سفر 8 کلومیٹر رہ جاتا ہے لیکن عموماً یہاں کے مقامی رہنما اس راستے سے جانے کو کتراتے ہیں۔“

”کیوں؟“ پوچھنے لگا۔

”اس دھوار گزار جنگلی راستے میں جگہ جگہ خطرناک ڈانڈوں، خوشنما اور بھیڑیوں، گیدڑوں وغیرہ کا بسیرا ہے۔“

”اگر یہاں سے گزرنے والے مسافروں کو نوٹ لیتے ہیں۔ پندرہ دن پہلے انہوں نے ایک رہنما کو لوٹنے کے بعد ڈرک کر دیا تھا۔“

”یہی تھانیدار صاحب اس اپنے ان ساتھی تھانیدار صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ مقتول کو ڈانڈوں کے گھونٹ مارا۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔“

”یہی تھانیدار صاحب نے یہاں سے پہلے تین چار روز کہاں رہا؟“

”میرے پاس ایک گڑھ ہے۔“

”یہاں ان باتوں کو چھوڑو۔“ پوچھنے لگا۔

بڑی احتیاط سے اٹھا کر پولیس جیب کی بجائے کلدھپ کی لاش کو منڈے سے نوٹوگرافر اور پولیس کے سپاہیوں نے پولیس جیب پر رکھ کر اسے اچھی طرح ایسے بڑے سامان جیسے ڈھانپ کر اسے باغیچہ دیا تاکہ وہ جھگڑے لکھا کر نہ پڑے۔

تھانیدار نے ہمارے علاقہ کے تھانے کی پینچر جیب کو نہ صرف تھیک کر دیا بلکہ پولیس ٹیم کے تمام افراد کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا۔

واپسی سے قبل جب ہم سارے لوگ تھانے میں بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے تھانیدار پوچھ کر پوچھ کر

لاسا گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور اس وقت ہمارے پاس پولیس پارٹی بھی ہے تو کیوں نہ ہم وہاں جانا

کو کلدھپ کے محل کی اطلاع کر دیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ دو کم از کم کسی طرح مقتول کی آخری رسومات میں شرکت کرے گی۔

تھانیدار نے میری اس تجویز پر جواباً کہا کہ لڑکے کی بات میں بہت وزن ہے اور یہ اخلاقی لحاظ سے بھی درست ہے لیکن زمینی حقائق بھی تو ہمارے سامنے ہیں۔

پھر اس تھانیدار نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”برخوردار جن علاقہ میں تم جانا چاہتے ہو یہاں تک ڈانڈ ایک تا چار فٹ تک نہ صرف پانی کھڑا ہے بلکہ یہ سارا علاقہ لاسا گاؤں تک ڈانڈوں سے بھرا ہوا ہے۔“

”اسی دوران پولیس ٹی آئی سی پارٹی نے ایک چابی سے تھانیدار پوچھ کر توجہ اس جانب دلائی کہ مقتول کی تارہ ناوشی ہوئی ہے۔ لہذا اس ٹائی کو کھینچنا چاہئے کہ جس سے اس کی ٹیٹو بنائی ہے۔“

کلڈھپ کی ٹیٹو پر اسٹریس کا ہڈ سا کٹ بھی نظر آ رہا تھا۔

مسٹر پوچھنے لگا۔

”کیا یہ تھانیدار صاحب کی تصویر اس علاقہ کے تمام جہازوں



## راستہ اور منزل

اگر راستہ خوبصورت ہے تو معلوم کرو کہ کس منزل کو جاتا ہے لیکن اگر منزل خوبصورت ہے تو راستے کی پروا امت کر دو کہ کیسا ہے۔

کے حویلی لائی گئی اور سکتہ زدہ لالہ بی کو کلد ہیپ کی میت کے قریب اس مقصد کے لئے لایا گیا تھا کہ وہ کلد ہیپ کا آخری دیدار کرنے اور دکر اپنے دل میں رسکے غم کا اظہار کر کے ہلکا ہو جائے۔

مقتول کی لاش انتہائی حد تک سڑ چکی تھی اور خیال تھا کہ زیادہ دیر رکھا گیا تو اس سے اٹھنے والی بدبو کا قاتل برداشت ہو جائے گی۔ اس لئے اس کی آخری رسومات کا بندوبست جلدی جلدی کیا جانے لگا۔ کلد ہیپ کی لاش سے اس وقت بھی بدبو پھوٹنے کے ساتھ اس کے منہ سے مسلسل نیلا سرخی مائل لعاب برس رہا تھا۔

سنتو مائی کے دل خراش بین اور ردنا انتہائی دردناک تھا۔ اس منظر کا احاطہ لفظوں میں کرنا انتہائی محال ہے۔ وہاں کلد ہیپ کا چچا شکر دیال اور اس کے بیٹے بچتی بھی وہاں موجود اور رو رہے تھے۔

شکر دیال نے میرے قریب آکر کے بچھ سے واقعہ کی پوری تفصیل پوچھی (میں نے اسے اتنا کچھ بتایا جتنا کہ مجھے پتا تھا)۔

لالہ بی کو سکتہ کی وجہ سے پپ ٹکی ہوئی تھی۔ وہی دوران شکر دیال نے ماتم کے گھر کے تمام تر کارکنوں کو روٹی، پانی دیگر تمام ضروری لوازمات کرائے لئے۔ نظام اسے اور اس کے بیٹوں اور چچی کی سب سے کم حالت کو دیکھ کر تو یہ لگ رہا تھا جیسے انہیں بھی کلد ہیپ کی موت کا کوئی راز پتا ہے۔

پچھ ہی کلد ہیپ کی لاش کی رسومات ہو کر رہ گئے۔ لالہ بی کی لاش بھی شان گھاٹ کے لئے جانے لگے تھی۔

کو اکھائی ہے۔ شاید انہیں ان سے اس کیس کی سچائی سمجھانے میں اہم مدد مل جائے۔

”مسٹر پونم آپ صحیح کہتے ہیں۔“ تھنسن کے تھانیدار نے کہا۔ ”میں ایسا کر کے جلد آپ کو رپورٹ بھجواؤں گا۔“

چلنے سے پہلے تھنسن دورٹی آئی سی تھانیداروں نے کچھ ضروری کاغذات کا تبادلہ اندراج کیا اور ان میں ہم چاروں نوجوانوں، ہمارے ساتھ آئے بزرگ اور کئی دیگر لوگوں کے دستخط وغیرہ تھے۔ پونم نے گاؤں تھنسن کے تھانیدار سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ میرے ذہن میں یہ سوال چل رہا ہے کہ انکوواں نے اگر اس بچے کو لوٹا تھا تو لوٹ لیتے مگر وہ اسے جان سے مار کر اس کی لاش دور پھینک گئے اور وہ بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر۔ اس میں کوئی راز ہے۔

کلد ہیپ کی لاش نی آئی سی تھانے میں لائی گئی۔ تھانیدار پونم نے ہم سے کہا کہ حویلی جا کر اطلاع کر دیں کہ مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد کل شام نی آئی سی تھانے میں ضروری کارروائی کے بعد لواحقین کے حوالہ کی جائے گی۔

”تھانیدار صاحب! ہم نے لاش کی پیر پھاڑ، پوسٹ مارٹم نہیں کروانا۔“ ہمارے ساتھ آئے بزرگ نے تھانیدار پونم سے کہا۔

”اگر بزرگ گواہی دے گا معاملہ ہے اور قانون کے تحت اس کا پوسٹ مارٹم کرنا لازم ہے۔“ پونم نے سخت لہجے میں کہا۔ ہم سب ٹوٹ جب غریبی پہنچے تو وہاں ماتم، سوٹ کا مٹاں تھا۔ اور وہ دلی تھانے کا ایک بازار بند تھا۔ حویلی کے دروازہ پر لوگوں کو انعام دینے تھا۔ اناری ٹکلیں دیکھ کر ہمارے چہرے پر مسکراتے ہوئے سوالات پوچھنے شروع ہو گئے۔ ہم نے سب کو مختصر تفصیل بتائی۔

”اچھا! ان کلد ہیپ کی لاش تھانے سے وصول کر

READING  
Section



بہو دیہا کو معاف نہیں کر سکتی۔" تائی سنتو نے دیہا کی طرف تہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں کلدھپ کو میں اپنا اور غلاما اور بھڈکا ہوا بیٹا مانتی ہوں۔ یہ بد نصیب اس منحوس کے ورغلا نے پر ہی حویلی سے روپے، زیور چرا کر بھاگا تھا۔"

"نہیں میرا کلدھپ نہیں مر سکتا۔" دیہا نے ہچکچاہٹ کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔ "کاش! میں حویلی سے باہر ناراضگی کا قدم نہ رکھتی۔"

"دیہا بھگوان تیرا اسی طرح بیزا غرق کرے جس طرح ہم رسوا زمانہ ہوئے ہیں۔" سنتو نے دیہا کو کواستے ہوئے کہا۔ "تیرے منحوس قدم ہماری حویلی کی تمام خوشیوں کو اپنے پاؤں تلے روند گئے۔ تو حرافگھی ٹوٹنے میرے معصوم بچے کو پہلے اپنے حسن کے جال میں پھنسا یا اور پھر اس سمیت ہمارے پورے پر یوار کو برباد کیا۔"

"یہ مجھ پر سراسر الزام ہے میں نرووش ہوں۔" دیہا نے معافی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "حلقہ دانوا بھگوان کے لئے سائیں جی کو سمجھا نہیں۔ میں آپ لوگوں کے سامنے کیسے اپنے آپ کو نرووش ثابت کروں؟"

"میں بھائی کی چتا کو لازماً چھوٹے بھائی ہونے کے ناطے اگنی دوں گا۔" ماما نے کہا۔

"نہیں! شکر دیال تم نے کلدھپ کو اگنی دینی ہے۔" سنتو تائی نے روتے پڑتے ہوئے یہ جملہ کیا۔

"چلو اس چتا کو اگنی دینے کا فیصلہ شمشان گھاٹ میں کرنا ہی احوال از بھی اٹھاؤ۔" کسی نے کہا۔

شمشان گھاٹ کے پورے راستہ ماما، اپنے چچا شکر دیال سے لڑتا، الجھتا رہا کہ میں نے ہی چتا کو آگ کی لکڑی دکھائی ہے اور شکر کا کہتا ہے تھا کہ یہ اس کی بھانج کا حکم ہے اور وہ یہ کام خود کرے گا۔ شمشان گھاٹ میں جب کلدھپ کا مردہ جسم جلانے کے لئے رکھا گیا تو وہاں ماما نے چچا شکر دیال کو پیچھے دھکیں کر خود بھائی کی چتا کو

انہی گئی تو اسی وقت خلاف توقع مکیش بہمد فہلی آ گیا۔ اس شکر کو دیکھ کر سب حیرت زدہ ہو گئے کہ یہ لوگ کیسے اور کس طرح یہاں پہنچ گئے۔

"کیا ہوا میرے کلدھپ کو؟" دیہا سینہ کو ہلکے کرتے ہوئے چلائی۔ "کس نے مارا ہے، میں اس کی نریا چالوں گئی۔"

ادھر ماما کلدھپ کی ارٹھی سے لپٹ کر دیوانہ وار رونے پینے چلائے لگا۔

"نہیں چھوڑوں گا ظالموں کو میں اپنی جان دے کر اپنے بھائی کے تیارے کی جان لے لوں گا۔"

ادھر دیہا کی آمد کا سن کر سنتو تائی آگ بگولہ ہو کر حویلی سے باہر کلدھپ کی ارٹھی پر لیٹ کر دھاڑی۔ "خبردار! تو نے اور ماما نے اسے چھوڑا۔ شکر دیال، تو نے کلدھپ کی چتا کو اگنی دینی ہے۔"

"نہیں بھادو جب میرا اگنی دینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے کیونکہ ابھی کلدھپ کا بھائی زندہ ہے۔" شکر دیال نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کام لال جی سے کروالو۔"

"نہیں اس کے اوسان قابو میں نہیں ہیں۔" سنتو تائی نے روتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھوں گی کہ میں ہانچھ تھی میری کوئی اولاد نہ تھی۔"

"اتنی کٹھور نہ بن سنتو بھابی!" شکر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دے دے ماما کو اپنے بھائی کی چتا کو اگنی دینے کا ادھیکار۔"

"نہیں شکر تم نے یہ آخری فریضہ ادا کرنا ہے۔" تائی سنتو بے ضد تھی۔

"بھگوان ناراض ہوتے ہیں۔ اولاد کو کھانا نہیں چاہیے۔" شکر نے پھر کہا۔ "اری شکر کر تیرا ایک بیٹا ابھی زندہ ہے۔ کل دل بڑا کر کے صبح کے بھولے شام کو آئے کو معاف کر دے۔"

"نہیں بیٹس میں کسی صورت میں اس ناخلف ماما اور

READING  
Section



آگ دکھانے کا ارادہ کیا تو شکر نے بھی غصے کے عالم میں اسے ہلکا سا دھکا دے دیا۔ یہ دیکھ کر مکیش کے دونوں لڑکے ٹپش میں آ کر آگے بڑھے اور انہوں نے شکر دیال کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو اپنے معصوم بھتیجے کو اپنے بھائی کی اڑھی کو آگ دینے سے روک رہا ہے۔

”ہاں یہ ہمارے خاندان کا پکا دشمن ہے۔ اس کا ہمارے خاندان پر کوئی ادھیکار نہیں ہے۔“ مانا چلایا۔

”ادھیکار ہے یا نہیں مجھے تمہارے خاندان کی سربراہ میری بھابھی نے زور دے کر یہ حکم دیا تھا کہ میں کلہاڑی کی اڑھی کو اگنی دوں اور اس کے ساتھ ساتھ تجھے قریب نہ آنے دوں۔“

شمشان گھاٹ میں مانا کی حمایت میں مکیش، کلجھال، شکر دیال اس کے دونوں بیٹوں سے ٹھیک ٹھاک کھوں، لاتوں کی لڑائی لڑنے لگے۔ شکر دیال کا سر پھنا، مکیش کی ٹانگ سے لہو بہنے لگا جبکہ پونم کے سر پر نہ جانے کس نے اینٹ ماری تھی۔ وہ زمین پر گر کر پھلی کی مانند ترپنے لگا تھا۔ کسی نے پولیس بلانی تھی۔

”لڑنے والے تمام فریقین کو گرفتار کر لو۔“ تھانیدار کے ضم پر پولیس والوں نے کلجھال، شکر دیال، مکیش اور ان کے دونوں بیٹوں سمیت مجموعی طور پر گیارہ افراد کو گرفتار کر لیا۔

پھر تھانیدار نے شکر دیال کو کہا کہ وہ سنو تائی کی نصیحت کے مطابق چتا کو اگنی دے۔

چار بندوں کو شام کو ہی چھوڑ دیا گیا جبکہ علاقہ کی پولیس، شکر دیال، مکیش، مانا کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔ ان سب کے خلاف دن کا نقص امن کی دفعات پر مشتمل پرچہ کاٹ دیا گیا۔

ابا اور علاقہ کے معززین تھانہ میں ان سب کو چھڑوانے کے لئے جگ دو کرنے لگے۔ علاقہ کا تھانیدار

تمام گرفتار شدگان کو یہ کہہ کر چھوڑنے کو تیار تھا کہ ان تمام افراد کو ٹی آئی سی تھانیدار کے حکم کے تحت گرفتار کیا گیا ہے اور ٹی آئی سی تھانہ کے حکم کی تعمیل برصورت پر لازم تھی۔ اس کی لمحہ لمحہ کی ذیل رپورٹ لازمی طور پر باقاعدگی سے ہیڈ آفس جاتی تھی۔ جسے (D.P.R یعنی Daily Performance Report) کہتے تھے۔ اس کے لئے گرفتار شدگان کی ضمانت یا دیگر دستاویزات کے لئے ٹی آئی سی کے متعلقہ مجاز آفیسر (مجسٹریٹ) نے مانا اور چار لڑکوں کو ٹی آئی سی کے پندرہ پندرہ روپے جرمانہ سنایا جبکہ مکیش، شکر دیال اور اس کے بیٹوں کو تین تین روز قید بمعدہ 50/- روپے فی کس جرمانہ کی سزائیں سنائی گئیں جبکہ کلجھال جو مجسٹریٹ سے ذرا اکھڑ ہو کر بولا تھا۔ اسے 5 روز قید بمعدہ 80/- روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ مکیش، شکر دیال اور اس کے بیٹوں پر اور ساتھ ہی کلجھال پر بھی لازم تھا کہ وہ ہر ہفتہ تین ماہ تک ٹی آئی سی تھانہ اپنی حاضری کے لئے آئیں۔

اوسر دیپا کو سنو تائی نے اپنی حویلی میں محسنہ نہ دیا۔ وہ حویلی سے تیسرے گھر میں ایک محلہ دارنی جس کا نام سو جا تھا، وہاں چلی گئی جبکہ لالہ جی کو لقوہ کے عارضہ کے ساتھ ہلکا سا دماغی فالج کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ وہ کافی دیر سوچنے کے بعد بڑی مشکل سے اپنی زبان سے اکا ذکا الفاظ نکال سکتا۔ لالہ آرام وہ کرسی پر کسی زندہ لاش کی مانند دھوپ میں خموشی سے بڑا رہتا تھا۔ سنو تائی بے درپے صدموں کی مار کھا کھا کر گم گو، تنہائی پسندی ہو گئی تھی۔ اس کی صحت کا گراف بڑی تیزی سے تنزلی کا شکار ہو رہا تھا۔ دیکھا جائے تو دیپا حویلی کے اندر اکیلی رہ گئی تھی۔

میری اماں، ابا اور محلہ کے ایک آدھ بڑوسی اس کی دلجوئی یا اس کے خدمات کو اپنی ہمدردیوں، سلی کا سرہم لگانے ان کے پاس چلے جاتے تھے۔

ایک دن محلہ کے چند بڑے مرد، عورتیں دیپا کو



سنتو تائی کے پاس سے گئیں انہوں نے سنتو تائی کو سمجھایا کہ وہ دیہا کو اس حویلی میں رکھے یہ جو بھی کچھ ہے کلدھپ کی ودھوا اور لالہ پر یوار کی بہو ہے۔ نیز ان محلہ داروں نے سنتو تائی کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اس معصوم کا اس حویلی کی تباہی اور زونما ہونے والے متعدد حادثات میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

سنتو تائی بڑی مشکل سے دیہا کو حویلی میں اس شرط پر رکھنے پر راضی ہوئی کہ یہ اپنا منہ اس سے ہمیشہ دور رکھے گی۔ اوپر والے کمرے میں رہے گی اور اپنا کھانا پینا علیحدہ رکھے گی۔ دیہا نے روتے ہوئے سنتو تائی کے پاؤں پکڑ کر بڑی عاجزی سے ان سے معافی مانگتے ہوئے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا کہ اس نے حویلی سے ناچاقی کے باعث باہر قدم رکھ کر اپنی زندگی کی بہت بڑی بھول کی ہے۔ اہل محلہ کی متیں، ساجتیں رنگ لائیں وہ دیہا کو واپس حویلی میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دیہا سارا دن کلدھپ، نوتن کے کمروں میں جا کر روتی رہتی تھی۔ اپنی رونے دھونے کے ساتھ اس نے ماٹا اور چند مزدوروں کی مدد سے حویلی کے در و باہر کو دھلوا کر صاف ستھرا کیا۔ پرانی غریز کا پڑا فرنیچر، گھسا پٹا کارپٹ، دیگر مخدوش سامان کو باہر پھینکوا یا اور اس کی جگہ نئی مازرن چیزیں لائی۔ وہ حویلی کے رہائشی حصہ میں مرمت، سفیدی، رنگ و روغن کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن اسے ابا اور اہل محلہ نے سمجھایا تھا کہ اس کا ایسا کرنا بیکار جائے گا کیونکہ اس حویلی کا رہائشی حصہ "الہ جی" نے قلعہال کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے اور وہ کسی بھی لمحے اس کے قبضہ کا تقاضا کر سکتا ہے۔ دیہا نے یہ کام چھوڑ دیا۔

ابھر قلعہال نے کلدھپ کی موت کی وجہ سے اور اظہار ہمدردی کرتے ہوئے حویلی کے قبضہ کئے لئے ایک ماہ کی مزید مہلت دے دی۔

ایک خوش آئند بات یہ ہوئی کہ دیہا نے سنتو تائی

کی شدید ناراضگی کے باوجود ان کی اتنی خدمت کی ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سنتو تائی کا دل اس کی جانب سے نرم پڑنے لگا۔ وہ پہلے تو دیہا کی جانب سے ایسے گئے سامان، روٹی اور اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا کرتی تھی لیکن گتتا تھا انہوں نے حویلی کے ڈوبتے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اب دیہا سے کچھ کچھ باتیں کر لیا کرنے لگی تھی۔ گویا کہ ان کا اعتماد اس کی جانب سے بحال ہو گیا تھا۔

سنتو تائی کے ساتھ ساتھ دیہا اپنا لالہ جی کی بھی بڑے دل و جان سے خدمت کر رہی تھی۔

ہم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اکثر دیہا چھت پر سنتو تائی کے پیچھے بیٹھی ان کے ہاتھوں کی چھٹی کر رہی ہوتی۔ گتتا تھا کہ حویلی کی رونمائی ہوئی رو لقیں بحال ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

کلدھپ کی چٹا کو جیلے بمشکل 20 روز ہی ہوئے ہوں گے کہ حویلی میں ٹی آئی سی تھانہ سے تھانیدار پونم، سول وردی میں آفیسر زتسم کے دو آدمی اور پولیس کے سپاہی آئے۔

تھانیدار پونم نے حویلی میں موجود سنتو تائی اور دیہا کو اپنے پاس بلا کر ان سے کچھ سرسری باتیں کی اور پھر اس نے اس کے ہاتھ آئے افسران نے پوری حویلی کے چپ چپ کا معائنہ کیا اور پھر تھانیدار پونم نے مجھے میرے گھر سے بلوایا۔

اس نے مجھے حویلی بلوایا تو میرے دل میں ہزار سو سو، اندیشے جنم لینے لگے۔ یا اللہ خیر پونم نے مجھے حویلی کیوں بلوایا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کلدھپ کے قتل میں مجھے شامل تفتیش کر رہا ہو۔

لیکن ابانے میرا موصلا بڑھاتے ہوئے کہا کہ باب تمہارے دل میں کوئی چور نہیں ہے تو تم تھانیدار کے سامنے پیش ہونے سے کیوں کتر رہے ہو؟

میں بہر حال ہمت کرتے حویلی میں تھانیدار سے



## دولت اور حسن

دولت اور حسن کے لالچ میں کبھی اپنی سیرت خراب نہ کرنا کیونکہ دولت دنیا میں ہی ختم ہو جائے گی اور حسن مٹی میں مل جائے گا لیکن اچھی سیرت آخرت تک ساتھ دے گی۔

(کنیز قاطمہ)

بھگوان کی کرپا ہے۔ دھونند نے عاجزی سے کہا۔  
”دھونند میری معلومات کے مطابق تم ہی بنے اس حویلی میں موجود کسی بڑے اسرار مخلوق کی موجودگی کی نشاندہی کی تھی؟“ پونم نے کہا۔ ”کیا تم اس بارے میں کچھ سرسری سا بتا سکتے ہو؟“

”میرا گیان اور تجربہ کہتا ہے کہ اس حویلی میں ایک جڑیل اور ایک چھلاوہ موجود ہے اور وہ اس حویلی کی رسوئی میں شامل ہیں۔“ دھونند نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں، مجھے سنتو اور دیکھنا اس بارے میں بتایا اور دکھلایا بھی ہے۔ میں نے رسوئی کی اس چوکھٹ کا بغور معائنہ کیا ہے۔ جہاں اکثر بڑے بڑے اسرار طور پر نیلے رنگ کی آگ یا شعلہ نمودار ہو کر فی الفور غائب ہو جاتا تھا۔“ پونم نے کہا۔ ”لیکن دھونند جی! ایک بات جو میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے وہ یہ کہ یہ آگ فوری کیوں بجھ جاتی ہے اور وہ اپنے پیچھے کوئی نشان کیوں نہیں چھوڑتی؟“

”سرکار یہی تو اس بڑے اسرار مخلوق کی بڑے اسراریت ہے۔“ دھونند نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل اس حویلی میں جو غیر مرئی مخلوق موجود ہیں ان کا کام ہی حویلی کے باسیوں کو شرارتوں کے ذریعہ بار بار نقصان اور اپنی اذیت دینا تھا۔“

دھونند نے تھانیدار کو یہ بھی بتایا کہ میں نے اپنے

ساتھ پیش ہو گیا۔ وہاں ٹی۔آئی۔سی کے دیگر اہلکار بیٹھے ہوئے تھے۔ ”وہاں بھی ستارا میں نے تمہیں اپنے پاس بلائے کے لئے کافی دیر سے سندیسہ بھیجا ہوا تھا۔ تم نے یہاں؟“ میں اتنی دیری کیوں کر دی؟“ اس نے سوال کیا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی، میں دراصل غسل کر کے تیار ہو رہا تھا۔“ میں نے جھوٹ گھڑا۔

”لیکن تمہارے بال تو بالکل خشک ہیں۔ تم کیا سن جاتے ہو؟“ اس نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے وہاں موجود دونوں آفیسر کے سامنے میری جانب سے خواہ خواہ بولے گئے جھوٹ کو پکڑتے ہوئے مجھے ٹوکا تو میں دلی طور پر دق کر یہ سوچ کر پچھتائے لگا کہ میں بسنے یہ بھونڈا جھوٹ کیوں بولا۔

”تم نہا کر نہیں آئے۔ سچ بولو۔“ تھانیدار پونم نے مجھ پر ایف بار پھر طنز کا شہر چلاتے ہوئے یہ جملہ بولا تھا۔  
”جی وہ میں سننے اپنے بال تولیہ سے اچھی طرح خشک کئے تھے۔“

اس نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر دس پندرہ منٹ تک اوڑھنا دھریا بیٹھیں۔

پھر سے بعد پونم نے دھونند اور سریال کو ان کی دکان سے بلا دیا۔

دھونند آگیا لیکن سریال نہیں آیا۔ دھونند نے آتے ہی مجھ سے ہندوانہ طرز گفتگو سے شروع کیا۔ سب کو بھٹک کر پریشان کیا۔

”تمہارا کام ہے دھونند۔“

”جی سرکار۔“

”میں نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔“ پونم نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم جادو کرنے کے جادوگر ہو اور وہی نکالوتی نی ہینستہ مجھے میں نے سنا ہے۔“

”جی ہاں، آپ نے سنا ہے۔“

READING  
Section



ملیات کے ذریعہ بڑے کشت کے ساتھ اس حویلی میں موجود اس غیر مرئی مخلوق کو کافی حد تک کھد پڑ دیا تھا لیکن بد قسمتی سے سنتو جی نے میرے کام میں ہر وقت رکاوٹیں ڈالیں اور جو کام میں کرنا چاہتا تھا وہ انہوں نے اپنے سخت رویوں کی وجہ سے کرنے نہیں دیا۔

”تم کس کے ذریعہ اور کہاں سے یہاں آئے تھے؟“ پونم نے سوال کیا۔

”جی میں اس حویلی کے سدھی مکیش جی کے ذریعہ یہاں آیا تھا۔“ دھونند نے اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا۔

”پونم نے کافی دیر تک دھونند سے سوالات و جوابات کئے اور دھونند کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ اس کے بیان کی صورت میں کاغذ میں لکھتا رہا۔

پونم نے مکیش کو بھی بلوایا اور اس سے بھی تفتیشی انداز میں چند سوالات پوچھے۔ بالخصوص اس نے اس سے پوچھا کہ آیا کہ مقتول کلدھپ لاسا گاؤں آیا تھا کہ نہیں۔ اس پر مکیش نے کہا۔

”سرکار! اس سال جس ہولناک، جانی والی سیلابی ہار ہارے پورے علاقہ کے ملحقہ دیہات میں آئی ہے آپ بتائیں۔ دس بارہ فٹ کھڑے پانی کو پار کر کے لاسا گاؤں کس کا آنا ممکن ہے؟“ اس نے کلدھپ کے لاسا گاؤں آنے کا انکار کیا۔

دیہانے بھی اسی قسم کا ملتا جلتا انکاری کا بیان دیا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ٹی آئی سی تھانے کی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک آفیسر ایسا بھی آیا تھا جو کسی سے سوال و جواب نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ صرف ایک طرف خوشی سے ہنسنے لگا تھا۔ دینے والے کی شکل پر اپنی نظریں گاڑے رہتا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پونم کے کانوں میں سرگوشی کرتا تھا۔ اس خوش آفیسر نے میرے چہرے پر مسلسل ہنسنے لگا لی ہوئی تھی لیکن میں جان بوجھ کر اس سے اپنی

نظریں نہیں ملاتا رہا تھا۔

”سنا ہے تمہاری اور کلدھپ کے درمیان پچھلے دنوں نوتن کے سنگسار میں نزاع ہوئی تھی؟“ سادو پزے میں ملبوس آفیسر نے مجھ سے یہ سوال پوچھا۔

”جی وہ میری جانب سے کلدھپ کو اپنی بہن نوتن کے عشق کے بارے میں خواہ مخواہ بدگمانی ہوئی تھی۔“

”کیسی خواہ مخواہ کی بدگمانی؟“ اس آفیسر نے یہ جملہ بڑی آہستگی سے کہا۔ میں گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے اس سوال کا جواب دیتا کہ درمیان میں تھانیدار پریم بول پڑا۔

ہاں اس بات کی تفتیش میں نے اس سے تھمس گاؤں جاتے ہوئے کر لی ہے۔ ابھی اس سے یہ سوالی پوچھنا بیہ معنی ہو گا۔ (تھانیدار پریم نے اس آفیسر کے کان میں کچھ اور بھی کہا)۔

مجھے حویلی میں جب آئے کافی دیر ہوئی تو میرے پیچھے آنا پریشانی کے عالم میں وہاں سب کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے سب مجھے لی آئی سی تھانے کی تفتیشی ٹیم کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا تو انہوں نے پریشانانہ لہجہ میں تھانیدار پریم سے پوچھا۔

”سرکار! آخر یہ تو ہے، آپ نے میرے بیٹے کو حویلی میں بلوایا ہے؟“

”خیریت ہوئی، کلدھپ کے قتل کا معاملہ ابھی اور مشکوک سے بھرا ہوا ہوتا تو ہم یہاں اس کیس کی تفتیش کے لئے آتے؟“

”لیکن کلدھپ کا قتل تو غالباً تھمس کے ڈاکوؤں یا خیروں نے کیا ہے؟“ ابانے کہا۔ ”اس حویلی کے باسیوں یا ہم پڑوسیوں، دوستوں کو اس گھناؤنے عمل سے کیا لینا دینا۔ کیا آپ ہم گھر کے لوگوں، پڑوسیوں پر کلدھپ کے قتل کا شبہ کر رہے ہیں؟“

”بزرگو! پولیس کا کام تو شک نہیں کرنا ہے۔“



سے پولیس پارٹی نے کچھ اور اسے بھی دو روزنی آئی سی  
تھانہ میں بند کر کے کئی سہ ہفتہ پپ کے قتل کے بارے  
میں معلومات حاصل کی گئیں۔ تقریباً روزانہ پونم  
تھانیدار کلدھ پپ کے قتل کی تفتیش کے لئے حویلی آتا یا کسی  
بھی مشکوک شخص کوئی آئی سی تھانہ بلا لیتا جن میں زیادہ تر  
اس نے دیبا، دھونند، سنتو تائی، مکیش کو بہت تنگ کیا۔ ان  
اور مجھے بھی وہ اپنے تفتیشی عمل کے کچھ کے مارنا رہتا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ جن لوگوں کو بار بار  
کلدھ پپ کے قتل کی تفتیش کے سلسلہ میں تنگ کر رہا تھا۔ ان  
لوگوں نے ایک وکیل سے مشورہ کر کے اس کے خلاف  
تھانہ ٹی آئی سی کے ہیڈ کوارٹر میں مختلف جھوٹے بچے  
الزامات کے تحت درخواست دائر کر دی۔ مدعیان میں  
سرفہرست سنتو تائی، دیبا، مکیش، نکجھال، شکردیال ان کے  
بیٹے اور ابا وغیرہ تھے۔ سنتو تائی، ابا اور شکردیال نے اس  
درخواست میں لکھا تھا کہ ہم بوڑھے گھر کے لوگوں کو خواہ  
مخواہ مقتول کے قتل میں رگیدا جا رہا ہے۔ جبکہ مکیش،  
شکردیال، نکجھال نے بھی اس قتل میں ملوث انکاری  
ہونے کے ساتھ لکھا تھا کہ پونم تھانیدار خواہ مخواہ ہمیں  
پریشان کر کے نہ صرف رشوت بٹورنا چاہتا ہے بلکہ وہ ہم  
لوگوں کو چنی اذیت دینے کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر میں  
ہماری تذلیل کرنا چاہ رہا ہے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کے مجاز آفیسر نے انکوٹری بے  
لئے تھانیدار پونم اور تمام درخواست گزاروں کو اپنے آفس  
بوالیا۔ مجاز آفیسر نے دونوں فریقین کے وائیل بڑے قتل  
اور کافی دیر تک سننے کے بعد تھانیدار پونم کو حکم دیا کہ وہ  
مذکورہ کیس کی حتمی انکوٹری اسکے چندرہ روز میں مکمل کرے  
اور اگر اس کے پاس مشکوک لوگوں کے بارے میں کوئی  
فحوس ثبوت ہو تو وہ ان افراد کوئی آئی سی تھانہ بلائے یا اگر  
حویلی جانا لازمی مقصود ہو تو وہ اس کی پہلے ہیڈ آفس سے  
منظوری لے۔

تھانیدار نے ابا سے کہا کہ اور ذات کی تفتیش کو سنبھالنا کہ  
بمیں بچوں تک رسائی حاصل کرنا ہوگا۔ ویسے جی  
ہم نے اپنی ٹیم آپ لوگوں میں سے کسی پر متنبوں کے  
قتل کا شید یا شک ظاہر نہیں کیا۔ ابھی تک تو ہم یہاں  
صرف اپنا ابتدائی کام بڑی خوش اخلاقی سے کر رہے  
ہیں۔ ابھی چند روز بعد مقتول کے جسم سے حاصل کردہ  
۔۔۔ ان کے انگوٹوں کی نوعیت اور وقوع واردات سے  
سبب واسلے کی شواہد کی رپورٹیں آتا باقی ہیں۔ ہم ان کے  
بعد ہی فیصلہ کریں گے کہ کلدھ پپ کے قتل کی واردات میں  
کون سا پشیدہ ہاتھ تھا۔۔۔ اچھا ہم چلتے ہیں، پھر آئیں  
گئے۔

”پھر آئیں گے۔ پر کیوں؟“ سنتو تائی نے  
تہہ بچے انداز میں کہا۔

”خبردار، ماما جی! جو آپ نے آئندہ یہ جملہ کہا۔  
پونم نے بڑے سخت لکھ میں کہا۔ ”ہم قانون کے مطابق  
ہزار دفعہ تفتیش کے لئے یہاں آ سکتے ہیں۔ میں ابھی  
ٹھنڈے ذہن اور ملائم زبان سے تعلق رکھنے والے  
ہنگاروں کو یہاں لے کر آیا ہوں۔ اگر ہمیں ارد گرد کے  
لوگوں میں سے کلدھ پپ کے قتل میں کسی کا ہاتھ نظر آ گیا تو  
تم لوگ پولیس کا اصل روپ بھی دیکھ لو گے۔“

”بھگوان کرے تیری حالت میرے پر یوار جیسی ہو  
جائے۔“ سنتو تائی حسب عادت پونم تھانیدار کو روتے  
ہوئے کوٹنے دینے لگیں۔ ”تجھ پر اور تیرے ہمارے  
مسندوں، حرام خوروں پر بھرتی کا گولہ گرے۔“

ٹی آئی سی کے تمام المکاروں نے سنتو تائی کی ان  
ہتنام انگیز یوں خرافات پر اپنا کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔

دوسرے پورے دن ٹی آئی سی تھانہ میں مکیش اور  
شکردیال کے بیٹوں کو بلوا کر ان سے کئی ٹھنڈوں ملک پوچھ  
”مجھ کی گئی۔ نکجھال بد معاش جو تفتیشی ٹیم کے سامنے پیش  
ہوئے سے کترار رہا تھا، اسے شہر سے بہت دور ایک گاؤں

READING  
Section



”جی۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کب آئے گی۔ سنو تائی نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سنو تائی کو چند لمحوں کے لئے گھورا اور پھر اپنی جیب سے ایک نئے رنگ کا ازار بند نکالنے کے بعد اسے لہراتے ہوئے سنو تائی سے پوچھا۔

”اسے پہچانتی ہے؟“

ازار بند کو دیکھ کر سنو تائی نے اپنی آنکھوں کے ذیلوں کو آخری حد تک کھولا اور وہ کافی دیر تک اسے سبکدہ کے عالم میں گھورتی رہی۔

”جی۔۔۔ یہ۔۔۔ آپ کے پاس کہاں۔۔۔ سے آیا؟“

بھیم نے ”ہوں“ کی آواز اس طرح نکالی جیسے کہ اسے کلدھپ کے اندر گھسٹنے کے بارے میں کچھ سمجھاؤ مل گیا ہو۔

”برھیا! میں نے تجھ سے صرف اتنا پوچھا ہے کہ تو اس ازار بند کو پہچانتی ہے؟“

”جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ سنو تائی کے منہ سے صرف یہی دو لفظ نکلے۔“

”میرے سوال کے جواب تو اذہور اندہ چورہ شہا باں، اسے پورا کر!“ بھیم سنگھ نے سنو تائی کو پکار کر کہا۔

”جی یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“

”تجھے بہت بھگس اور شوق ہے نہ اس ازار بند نے۔“ سنو تائی کے بارے میں تو سن ماما جی! بھیم سنگھ نے کہا۔ ”یہ ازار بند پولیس ٹیم کو جاسے واردات سے کلدھپ کی فاش کے ہاتھوں میں بندھا ہوا ملا تھا۔“

انسپکٹر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرا تجربہ اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ کلدھپ کے قتل میں اس حویلی کے کسی کردار کا ہاتھ ہے اور تجھس علاقہ سے

ابا، کمیشنر سنو تائی نے مجاز آفیسر کے سامنے اس پر اعتراف کیا کہ موجودہ انکوائری تھا بندہ کو تبدیل کر دیا جائے کیونکہ ان کو اس پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے لیکن مجاز آفیسر نے ان کی یہ استدعا مسترد کرتے ہوئے پونم کے ساتھ ایک اور تفتیشی آفیسر انسپکٹر بھیم سنگھ کو بھیج کر دیا۔ یعنی اب کلدھپ کے قتل کی تحقیق ایک کے بجائے دو ہاتھوں میں آگئی تھی۔

انسپکٹر بھیم سنگھ چند روز پہلے ہی بھیرہ سے ترقی کر کے نی آئی سی تھانہ میں تعینات ہوا تھا۔ یہ ایک قابل تفتیش آفیسر کے ساتھ شکل و صورت سے انتہائی کرخت اور زبان کا کڑوا، دوسروں کو ذلیل کرنے والا انسان تھا۔ تین روز بعد انسپکٹر بھیم سنگھ اپنے ساتھ دو پولیس والوں کو لے آیا۔ انہیں دیکھ کر سنو تائی بھڑک گئی۔ انہوں نے پولیس ٹیم کو اپنے روایتی انداز میں کوسنا، چلا تا شروع کر دیا۔

”تم لوگ پھر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے آ گئے۔ اسے بھگوان تمہارے پوت بھی اسی طرح کہیں جس طرح کہ میرے دل کا ٹکڑا کلدھپ نامعلوم ہتھیاروں کے ہاتھوں کٹا ہے۔“

”چپ کر بڑھیا! ہم تیرے پر یوار کے فرد نہیں ہیں جو تویوں ہم سے جاہلوں کی طرح لڑ رہی ہے۔ ہم لوگ سرکار کی ذیولٹی دینے اور کلدھپ کے اندھے قتل کی تفتیش کے لئے یہاں آئے ہیں۔“ انسپکٹر بھیم سنگھ نے یہ جملہ بڑے غصے اور بلند آواز میں کہا تو سنو تائی دہل کر بت بن کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

”کہاں ہے تیری بہو دیپا؟“

”جی وہ تو۔۔۔ اپنے عزیز سے ملنے بھاٹ گئی ہے۔“ سنو تائی نے بڑے سہمے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”وہ کب آئے گی؟“ انسپکٹر بھیم نے انتہائی غصہ سے ان سے پوچھا۔

READING  
Section



تھانید کا یہ سوچنا سراپا نہیں ہے کہ کلمہ پکھڑا اس علاقہ کے لیروں، ڈاکوؤں نے قتل کیا ہے۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں پتا کہ لیرا ڈاکو اپنے شکار کو صرف لوثا ہے یا اگر کوئی لٹنے والا اس سے زیادہ ہی مزاحمت کرتا ہے وہ اسے پہلے ڈراتے احمکاتے ہیں یا زد و کوب کرتے ہیں اور اگر زیادہ ہی لٹنے والا ان کے سامنے مزاحمت کرتا ہے وہ اسے صرف جان سے ہار دیتے ہیں اور پھر اسے مار کر وہی پھینک دیتے ہیں۔ اب یہ کون سا ایسا ڈاکو تھے جنہوں نے کلمہ پکھڑا کو پہلے مارا اور پھر اس کی لاش کے ہاتھوں میں گزار بند باندھ کر اتنی دور سیلابی پانی کو پار کر کے گھنٹس گاؤں کی اندلی جگہ پر ٹھکانے لگایا۔

”انسپکٹر صاحب! آپ سچ کہتے ہیں۔“ اسے ایسے آئی نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں مجھے اب سولہ آنے برابر دشواں ہو گیا ہے کہ کلمہ پکھڑا کی لاش کی کتنی سلجھانے میں یہ ازار بند اور تم دونوں بہت اہم کردار ادا کرو گے۔“ بھیم سنگھ نے یقین بھر سے سچہ میں کہا۔ ”شرافت اسی میں ہے کہ تم مجھے اس ازار بند کی اصل بات بتاؤ ورنہ میں اپنے طریقہ سے تیری زبان کھٹواؤں۔ دیکھ میں جب اپنی کرلی پر آ گیا تو میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ میرے سامنے کس عمر اور نحیف جسم کا ملزم کھڑا ہے۔ میں تیری بوڑھی بڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔“

سنوتائی ہاتھ جوڑتے ہوئے انسپکٹر بھیم سنگھ کے قریب آئی اور اس کے قدموں میں جینے کر روتے ہوئے بولی۔

”بھٹوان کے واسطے میں اس ازار بند کی حقیقت کا راز بتاتی ہوں لیکن میری یہ منی (استدعا) ہے کہ میں آپ سے علیحدگی میں بات کر لی چاہتی ہوں۔“

موٹی کے سامنے بڑے کمرے میں سنوتائی انسپکٹر بھیم سنگھ سے کافی دیر تک کچھ باتیں کرتی رہیں۔ وہ بار

بار بھیم سنگھ کے پاؤں پکڑ کر ان سے نہ جانے کیا لہریں نکھیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں کمرے سے باہر آئے۔ بھیم سنگھ کے چہرے پر تجسس اور سنوتائی کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے اثرات نمایاں تھے۔ بھیم سنگھ کچھ سوچتا ہوا حویلی کے اندر منگشت کرنے لگا۔ وہ بار بار رسوئی، کلمہ پکھڑا، دیپا کے کمرے کا جائزہ لینے کے لئے آتا جاتا رہا۔ اسی دوران حویلی کے داخلی دروازہ پر دستک کی آوازیں پیدا ہوئیں۔

”کون ہے؟“ سنوتائی نے پوچھا۔

”جی میں دھونند، لالہ جی پرستھا کا دم لڑنے والا اپنے ساتھ لایا ہوں۔“

”ارے بھگوان کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔“ لالہ جی طبیعت پھر سے خراب ہو رہی ہے۔“ سنوتائی نے حویلی کا داخلی دروازہ کھولا۔ دھونند اپنے ساتھ ایک ستراسی سا بڈھے کو لے کر آیا تھا۔ جس کا جلیہ بالکل فقیروں جیسا تھا۔ بوسیدہ لنگی پہنے اور اس کے سمجھے سر پر لنگی چٹیا بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ دھونند نے اپنے سامنے پولیس پارٹی کو دیکھا تو اس نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا۔ وہ چونکا اور نہ ہی اس نے تھانید اور بھیم سنگھ کی موجودگی کو کوئی اہمیت دی۔ بس نحیف سا سمستے کہا۔

اپاج لالہ جی کو وہیل چیر میں لایا گیا۔ دھونند کے ساتھ آئے جوگی قسم کے بڈھے نے کونڈ اور حرجل کی دھونی سے سنتا کا عمل شروع کیا۔ (سنتا دراصل ہندوانہ عقائد کے مطابق ہر قسم کے جادو کی عمل کا توڑ ہے، جس کا باہر محض ویدوں، پرانوں، گیتا کے کچھ مخصوص حصوں کو لے کر پڑھتا ہے۔ اس کا مقصد کسی انسان سے چھپنے بیماری پھیلانے والی شیطانی طاقتوں کو بھگتا ہوتا تھا۔ اس میں کوکلوں پر حرجل کے دانوں کو ڈال کر دھونی دی جاتی تھی اور یہ عمل اپاہجوں، فالج زدہ لوگوں کے لئے جوگی قسم کے لوگ کیا کرتے تھے۔ یہ عمل آج بھی ہندوستان میں شامل

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



سندھ کے ماہر سنتا جوگی کرتے ہیں۔

ٹی آئی سی تھانے کی ٹیم اس عمل کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ پوری حویلی میں حرج کی شدید ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ دھوند کے سنتا کے عمل کے بعد لالہ جی کی گردن کے ارد گرد اپنے تھیلے میں موجود کالے رنگت پر مشتمل چھپا سا مرہم لگایا۔

”ہاں جی، لالہ جی کچھ سکون مل رہا ہے؟“

لالہ نے لغو زدہ زبان سے لڑکھڑا کر اثبات میں مسکرا کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں!“

دھوند آہستہ آہستہ تھیلیوں کی مدد سے کافی دیر تک اس کی گردن کے حلقوں میں اپنا لیپ لٹا رہا۔ وہ جیسے ہی اس کی گردن سے اپنا ہاتھ اٹھاتا تو لالہ کیدار تھ اسے اشارہ سے کہتا کہ اور مل۔

سنتو تائی بولیں۔ ”ارے جب سنتا کے عمل کے ساتھ تمہاری جانب سے مزاحم کا ہاتھ ان پر پھرتا ہے تو یقین کرو لالہ کو بہت شانتی ملتی ہے۔“

دھوند کے ساتھ آیا بڈھا جوگی بولا۔ ”بھن جی! بس آپ دیکھتی رہیں، بھگوان نے چاہا تو لالہ جی چند ہفتوں میں بالکل بھلے پختے ہو جائیں گے۔ بس آپ مجھ پر دوش اس کریں۔“

سنتو تائی نے چار روپے منگ با بے کی تلی پر رکھے تو وہ کان پکڑ کر بولا۔ ”بھن جی! آپ ایسا کر کے مجھے شرمندہ کر دیتی ہیں۔“

”ارے نہیں میں تمہیں تمہارے اس احسان کا کیا بدلہ دے سکتی ہوں، یہ تو صرف آپ کے آنے جانے کا خرچہ ہی ہوگا۔ یہ تو آپ کو لینا ہی چاہئے۔“

تھانیدار بھیم سنگھ جو ابھی تلک خموشی سے بیٹھا ان دونوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے دونوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی ایک لمحے کو بات سنیں۔

دھوند اور وہ منگ با بے اس کے پاس آئے۔

”آپ دھوند جی جوگی ہیں۔ آپ تلے دار ہے میں میں نے اپنے ساتھ تھانیدار بھیم سے سنا ہے کہ آپ بڑے پختے ہوئے قابل جوگی اور جادوئی عملیات کی کاٹ کے ماہر ہیں۔“

”جی ہاں، مجھ تاپیز کا ڈنکا اور دور منگ با بے۔“

”اچھا یہ جو آپ اپنے ساتھ منگ با بے لائے ہیں یہ واقعی سنتا کے گرد ہیں؟“

”جی ہاں سرکار! یہ سولہ آنے کھڑے بڑے بڑی گرامی سنتا عمل کے یکتا گمانی ہیں۔“

”لیکن دھوند جی! کسی سنتا کے ماہر کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے لاکھوں ہرنوں میں سے نافہ والا ہرن تلاش کرنا۔“

پھر بھیم سنگھ نے بابا جی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بابا جی! میرے سر پر دانگی جکڑاؤ والا درد شقیقہ رہتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکٹروں، حکیموں سے اس کا علاج کرایا، ٹوٹکے کر دئے مگر کوئی آرام نہ آیا۔ میرا اگر آپ یہ مسئلہ حل کر دیں تو میں آپ کو خوش کردوں گا۔“

میرے پاس بھگوان کا دیا بہت کچھ ہے۔“

”سرکار! میرے ہوتے ہوئے اس کی چٹا کیوں کرتے ہیں؟ میں اپنے میدان کا شہسوار گرد ہوں۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں آپ کے سر پر ایسا ”مونام“ پڑھوں گا کہ بھگوان کی کرپا سے آج کی تاریخ کے بعد آپ کے قریب کبھی بھی درد شقیقہ کی بیماری نہیں پھٹے گی۔“

مونام دراصل سنتا سے بلکہ دوسرے درجہ کا ہندوانہ انداز کا جادو ٹونہ ہوا کرتا تھا۔

”اچھا یہ بات ہے تو آئیں مجھے بھی اپنی کچھ شکتی دکھلائیں۔“ انسپکٹر بھیم سنگھ نے چیخ دینے والے انداز میں بابا جی سے کہا۔

(جاری ہے)

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



## جنہیں ہم بھول گئے



☆ عارف محمود

جب بھی کوئی ایسی کہانی یا واقعہ سننے کو مل جائے جس کے کرداروں کا تعلق 1947ء قیام پاکستان سے ہو تو قلم بے اختیار اس وقت کے مہاجرین اور شہداء کے ذکر کے لئے چل پڑتا ہے۔ وہ پاکستان کی تاریخ ہو ہی نہیں سکتی جس کے اوراق ان کے لبو سے سرخ نہ ہوں۔ خاص طور پر اس وقت متاثر ہونے والی خواتین کے متعلق سوچتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے کو آ جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کو کون بھول سکتا ہے جن کے نازک اعضا کاٹ کر ہندوؤں اور سکھوں نے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ قوم کی ان ہزاروں بیٹیوں کے متعلق ذرا سوچیں جنہیں ہم بھول گئے ہیں، جن میں عائشہ تھیں، فاطمہ تھیں، زینب اور زہرہ تھیں مگر وہ اغوا ہو کر بلونت کور، مہندر کور اور امیت کور بنیں اور انہوں نے ہر نام سنگھ، کرتار سنگھ، ایشر سنگھ اور درشن سنگھ کو جنم دیا۔ ان میں سے کئی آج بھی وہاں زندہ ہوں گی۔ ایسی ہی ایک بیٹی کی کہانی پیش ہے جو اپنے اندر کئی سوال لئے ہوئے ہے۔

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



میریانی صاحب کے وسیع و عریض قبرستان میں غازی  
میریانی علم الدین شہید کے پچھوڑے ایک خستہ حال  
قبر ہیں۔ قبر پر پتھر نہیں رکھا گیا تھا۔ ایک گڑھا ہے،  
مجھے گورنمنٹ بتا رہا تھا۔

یہ قبر بھی عجیب قبر ہے بابو بھئی۔ کبھی ملتی تھی اور کبھی  
گھڑتی تھی۔ ہندو ایمان والے کہتے تھے اس نے محمد صلی  
اللہ علیہ وسلم کا ٹکڑا کھا لیا ہے یہاں اس کا عظیم الشان  
قبر رکھا گیا ہے۔ ہندو لوگوں کا خیال تھا یہ شخص  
بہرہ پرست تھا، دھوکے باز تھا، ایک مسلمان خاتون کے پیچھے  
نفس کے پاتھوں میں پڑ گیا اور جب غیرت مند  
مسلمانوں نے اس مسلمان خاتون کو اس کے حوالے نہ کیا  
تو ان لوگوں کی موت مر گیا۔ پتا آپ گورنمنٹ گاڑی کے  
سامنے گرا دیا اور ختم ہو گیا۔

سب شہداء قبروں کے پتھروں پر یہ گڑھا ایک ایسی شخص  
کا اپنی لاشیں رکھتے ہوئے ہے جو نفس، فہرہ، سہواں،  
ہوا اور واقف کی داستان و ہر تار ہوا راہی ملک عدم ہوا۔  
اس نے اس قبر کی کوئی کونہ میں سوئے ہوئے ہوا  
تنگہ کی کھائی سے ڈال دیا جو بعد میں قتل ہوا۔ یہ کہانی  
اسے اندر کی پچھتے ہوئے سوال لئے ہوئے ہے۔ یوں تو  
اس کے قاتل کے قاتل کے قاتل ہیں ہر قاتل آزاد ہے لیکن کوئی بھی  
اسے قاتل کر سکتے ہوئے غیر جانبداری اور انصاف کا دامن  
نہ پھوڑے۔

جہاں ہے۔ جہاں ہے۔ جہاں ہے۔ جہاں ہے۔ جہاں ہے۔ جہاں ہے۔  
پتا ہے۔ 1947ء کے فسادات کا زمانہ ہے۔ دسکی اور  
نائب گھر سرحد اور بدواس دو شیرازوں کا تعاقب کر  
رہے ہیں۔ بھاگتی ہوئی لڑکیاں کبھی اس کوئے میں پناہ  
دیتی ہیں اور کبھی اس کوئے میں۔ ان کے اعضاء کئے  
ہوئے ہیں انہیں برہنہ ہیں۔ بدن کے ایک ایک سے لہو  
نہا رہا ہے۔ ہر رجمی ہیں اور وہ چمکتی بھاتی رہی  
ہیں۔ پناہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ فسادات میں سسکیوں، چیخوں

اور تڑاہوں کے ساتھ ساتھ قہقہوں اور گائیوں کا بے شمار  
شور مچا ہوا ہے۔ ہر طرف افراتفری ہے اور ان آدم  
صد ہوں کی غازی کے بعد جشن آزادی کا ہر سہ

کتنا عجیب ہے یہ جشن، کتنی عجیب ہے یہ آزادی،  
ای عرصے محشر میں دس بارہ ماہ سب بھی انی  
آہ کی طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہیں۔ اس نے  
ماں باپ اور بہن بھائی اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر  
اسے کئے ہیں۔ اس کا خشیوں بھرا گھر جلا دیا گیا ہے،  
ہندو غنڈے تلواریں لہراتے ہوئے اس کے تعاقب میں  
ہیں اور وہ چمکتی چمکتی دیوانہ وار دوڑ رہی ہے۔ اچانک ایک  
ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے وہاں ایک بوڑھا سٹھاپنڈ  
ہوتا ہے۔ وہ اس پر فاس اور گھبراہٹ ہوئی تڑکی نوکھتا  
ہے۔

اتھم کون ہو بیٹی؟

میں انسان ہوں بابا میں ایک مسلمان لڑکی  
ہوں۔ بابا یوں سمجھ لو، میں تمہاری لڑکی ہوں۔ غنڈے  
میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔

گھبراؤ نہیں بیٹی! تم سردار بھگت سنگھ کی پناہ میں  
ہو۔ کوئی تمہارا بال تک ہکا نہیں کر سکتا، دھند رکھو، یوں  
گھبرائے اور بڑے بڑے تو سمجھ نہیں پئے گا۔

اچانک دو مٹوئی منہ سے کھ بھاتے ہوئے اور  
تواریں بھراتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ سردار  
ابھی ابھی ایک لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی وہ اسے  
ہمارے حوالے کر دے گا۔

وہ میری لڑکی ہے بابا! یہاں جھٹ سنگھ کی لڑکی  
پرانا تھا، ہاتھ ہوتے ہوا کیا ایک باپ کے روپر اس کی  
بیٹی کی عصمت سے کھیلنا چاہتے ہو۔ جاؤ، دھک ہو جاؤ،  
پاگل پن اور ہونے لے تمہیں اندھا بنا دیا ہے۔ تم نے  
اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کی تعلیمات کو اپنے قدموں  
تھے روند ڈالا ہے۔ تم انسانیت کے نام پر ایک داغ ہو،

READING  
Section



ہند کا نیکا ہوا۔

دونوں "سورماؤں" کے سر ڈھٹک جاتے ہیں اور وہ بڑبڑاتے ہوئے سردار کی حویلی سے چلے جاتے ہیں۔ سردار بھگت سنگھ اب عمر کی اس میز پر تھا کہ یاد آئی ہی اس کا اوڑھنا کھوتا بن کر رہ گئی تھی۔ بیوی اپنے اسے داغ مفارقت دے کر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور اس سسنان، بھائیں بھائیں کرتی حویلی میں وہ یکا و تنہا تھا۔ فطرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اسے بیٹھے بٹھائے ایک بیٹی مل گئی۔ اگر وہ مسلمان تھی تو کیا ہوا ایک انسان تو تھی۔ بالکل اس کی ہر نام کور کی ہم شکل، اس کی چھوٹی بیٹی شتام کور کی عمر کے لگ بھگ۔ ہر نام اور شتام بھی ان بنگالوں کا شکار ہو گئیں لیکن نہ سب نے اس کا کیا بکاڑا تھا؟ ان دو بچیوں کے قتل اور عصمت دہری میں اس کا تو کوئی ہاتھ نہ تھا۔ سیاست کے گھناؤنے کھیل سے ناہند یہ سیدھی سا دی سی دیہاتی لڑکی اس کے سائے میں پناہ لینے آئی تھی۔ اسے باپ کہہ کر پکارا تھا۔ بھگت سنگھ کے ہوا میں شریف انسان کا لبو موجزن تھا۔ بھگت سنگھ نے وجہ میں شریف انسان کا لبو موجزن تھا۔ اس نے نہ سب کون صرف پناہ دینی بلکہ اسے اپنی بیٹی بنالیا۔ نہ سب بھگت سنگھ کے گھر کی فردا بن گئی۔ اس نے حالات سے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور بوز سے سردار کی خدمت گزار بن کر اپنا شعار بنالیا۔ ابھی کبھی یہ خیال ایک کوندے کی طرح ان کے ذہن میں رہتا کہ اگر سردار کو کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ وہ اس مجمع و عریض دنیا میں کسے اپنا کہہ کر پکارے گی اور کون بھگت سنگھ بن کر اس کے ڈھٹکتے ہوئے آنچل کو گرنے سے بچائے گا۔

وقت یونہی دسبے پاؤں گزر رہا رہا۔ نہ سب بچپن کی مدد چھانگ کر جوانی کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ اس کے مناسب خدخال نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا۔ اس نے ایک ایک عورت کے سراپا میں ڈھٹنے لگا تھا جسے

چاہتے اور چاہے چاہتے گئی ہے پناہ خواہش ہوتی ہے اور پھر فطرت کا تقاضا بھی تو یہی تھا کہ وہ تحقیق کائنات کے مقدس کام میں اپنا کردار ادا کرے۔ بھگت سنگھ نے زمانے کا گرم سرد چکھا تھا۔ وہ اپنی مزہ بولی بیٹی کی فکر میں بہروں پریشان رہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے سے پیٹے وہ اسے دہن کے روپ میں اچھوٹے۔

مگر یہ کیونکر ممکن تھا؟ وہ مسلمان تھی اور اس کا دل کے سارے مسلمان یا تو سرحد پار دھکیں اپنے گئے تھے اور یا بنو بنوں کے ہاتھوں لہری فیند سو چلے تھے۔ ایک روز اس نے نہ سب کو پاں بلایا، پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔ "بیٹی نہ سب اتم، تجھ ہی پر ہی ہو میں اب کچھ دنوں کا مہمان ہوں۔ میں پاتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تمہارے ہاتھ پیٹے ہو جائیں۔ مگر یہ کیونکر ممکن ہے بیٹی! سب مسلمان یہاں سے چلے گئے ہیں اگر تم سنگھ مذہب اختیار کر لو تو شاید۔"

نہ سب سر جھکا کر سلامیاں جبرے لگی۔ واقعی اب اس کا اس سر زمین پر کوئی نہ تھا۔ کوہاں گاؤں کے مسلمان کینوں کو موت نہ چاہت تھی۔ اونچی اونچی نیلی دیو کی نویلیاں اب فیروں کے قبضے میں تھیں اور سرحد کے اس پار جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ طاردار گاؤں اور کڑے پھرے نے پیار، محبت، اغرت اور تقاربت کو قفسہ کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی نہ سب سے ہندو بن گئی۔

اس کے مہندر کو ہٹنے کے چند ہی دنوں بعد بھگت سنگھ کا بھائی بوم سنگھ اپنے مومن سے ملے آیا۔ یہ بچپن چھبیس سال کا ایک گھرو تھا۔ انہی بولی جوالی، منو، سید، سم، کھتا ہوا رنگ، پنجاب کے پانیوں نے اس کے حسن و اور نکھار دیا تھا۔ اس نے مہندر کو روٹو نکھیوں سے کٹی بار دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اپنے دل کی غیر متوازن دھڑکنوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ مہندر کو روٹو زلفوں کا امیر بن چکا ہے۔ دل کے آنے کے ڈھٹک بھی نہالے

READING  
Section



اب۔ جب تک اس نے مہندر کور کو نہ دیکھا تھا، جوانی کے بھڑکتے ہوئے الاؤ کو اپنے من میں چھپائے بھرتا رہا۔ مہندر کور پر ایک اچھٹی سی نگاہ پڑنے کی دیر تھی کہ اس کا وجود جوالہ کھسی بن گیا اور وہ ایک پتنگے کی طرح اس کا طوائف کرنے لگا۔

بھگت سنگھ کی بوڑھی آنکھوں نے پتنگے کی یہ دائرگی اور شوریدہ سہری دیکھی تو بھانپ گیا کہ بوٹا سنگھ دل کے ہاتھوں لاچار ہو گیا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ دونوں کو ازدواجی بندھن میں خسلک کر دیا جائے۔

اس لئے نسب کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اس کی نیم خاموشی کو اس کی رضا سمجھتے ہوئے اسے کچھ ہی دنوں بعد بوٹا سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بوٹا سنگھ اپنی مہندر کور کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلا آیا اور یوں کسی خوشی ان کے دن گزرنے لگے۔ مہندر کور اگر شمع تھی تو بوٹا سنگھ پروانہ۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور اس کے ادنیٰ سے اشارے پر ہر وہ کام کر گزرتا جو شاید عام حالات میں وہ نہ کر سکتا۔ شادی کے ایک سال بعد مہندر کور کے بطن سے تنور کور اور پھر دوسرے سال دلیر کور پیدا ہوئیں۔ دونوں بچیاں ماں اور باپ کی طبیعتوں اور شکلوں کا حسین استراج تھیں۔ بوٹا سنگھ انہیں دلچ کر بھولا نہ سکتا۔ اس کی زندگی کے لقی و لقی صبرا میں بہار دے پاؤں چلی آئی تھی۔ تنہا اس گھر میں اب قہقہے کو بجنے لگے تھے۔ وہ بے حد خوش تھا۔

برصغیر نے حالات اب کچھ زوہ سنوں ہو چکے تھے۔ درندگی اور وحشت کی جگہ اب سنجیدگی اور متانت نے سسلے لی تھی۔ دونوں حکومتوں نے اس عظیم ایسے پر انسانی نقطہ نظر سے سوچنا شروع کر دیا تھا، رفاہی اور اصلاحی تنظیموں نے دونوں مملکتوں کے تعاون سے مغویہ عورتوں کی بازیابی کا کام شروع کر دیا۔ مغویہ عورتوں کی بازیابی کا کمپ مختلف آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ افسر اور سہ کار فہرستیں مرتب کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک

ایک شخص ہوا۔

”بھگت سنگھ کے گھر میں بھی تو ایک مغویہ لڑکی ہے جسے سنگھ دھرم قبول کرنے پر مجبوراً ایک سنگھ سے بیاہ دیا گیا ہے۔ کمپ کے انچارج افسر نے اپنی نوٹ بک میں نسب کا نام لکھا اور اپنے رضا کار اور مکملے کے چند آدمی بھگت سنگھ کے گاؤں کو ہالہ روانہ کر دیئے۔ یہ لوگ جب گاؤں پہنچے تو بھگت سنگھ مرض الموت میں مبتلا تھا۔ سانس کی ایک ہلکی سی ڈوری رکی ہوئی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چراغ سحری ہے اور کسی دم بجھ جائے گا۔

”سرور صاحب! کیا نسب کو آپ نے پالا چوسا اور اپنی لڑکی بنائے رکھا؟“

”ہاں بیٹا! نسب میری بیٹی ہے، منہ بولی بیٹی۔ دانگورو کی کرپا سے میں نے اس کی جوانی کی حفاظت کی اور جب اس کے بیاہنے کا وقت آیا تو اس کا ہاتھ ایک گھبرو بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب وہ اس کے ساتھ اس کے پند رہتی ہے۔ اب وہ نسب نہیں رہی بلکہ لوگ اسے مہندر کور کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ دو بچیوں کی ماں ہے۔“

”مگر وہ مسلمانوں کی اولاد ہے سرور، جی! دونوں حکومتوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مغویہ لڑکیاں برآمد کرائیں اور انہیں متعلقہ حکومتوں کے حوالے کر دیا جائے۔“

”کس نے انہیں کیا ہے نسب کو؟ کس میں جرات تھی کہ اسے میرے جیسے ہی ہاتھ لگا تا۔ وہ فسادات میں بے یار و مددگار بھٹک رہی تھی کہ میں نے اسے سہارا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ نسب نے مہندر کور بن چکی ہے لیکن کسی نے اس پر جبر تو نہیں کیا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں رہنا تھا اس کو سنگھ مت قبول کرے پر مجبور ہوئی۔“

مہندر کور اور بوٹا سنگھ کے گاؤں کا نام نوٹ کرنے کے بعد وہ لوگ جانے لگے تو بوڑھے سرور نے دنگھی



RTM 234574

# بولو

# میں

سیلنگ فین  
پیدسٹل فین  
ایگزاسٹ فین



## اے، جے، چکے

سیلنگ فین پیدسٹل فین  
ایگزاسٹ فین

اے۔۔۔ جے ایم۔۔۔ اندرون  
مختار نور پور شتی تجارت

053-3521165, 3601318

ہوئی آواز میں تھا۔

”بھائیو! اگر مہندر نے پاکستان جانا ہی ہے تو خدا نے لئے مجھے اس کی ایک جھلک ضرور دکھا دینا۔ میں اپنی بیٹی کو مرنے سے پہلے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ ناممکن ہے سردار جی!“ اور پھر وہ چلے گئے۔

جھلک سنگھ اس واقعے کے بعد صرف چار دن زندہ رہا اور پھر آنکھیں موند لیں، ہمیشہ ہمیشہ لئے۔ بونا سنگھ بہتیرا چیخا چلایا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ مریضہ قوانین کے تحت زینب عرف مہندر کو اپنی بیٹی تنویر کو رکھنے سے لگائے پاکستانی حدود میں داخل ہو گئی۔ دلیر کو رکھ بونا سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

”مہندر! تو میرا انتظار کرنا، میں ضرور آؤں گا۔ یہ دنیاوی قوانین ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہم دونوں انسان ہیں۔ ہم نے انسانوں کی طرح پاک محبت کی ہے اور اس محبت اور پیار کے بدلے میں رب نے ہمارے جہنم میں دو پھول کھلائے ہیں۔“ بونا سنگھ نے جاتے وقت مہندر کو رکھ سے کہا۔

سرکاری گاڑی نے سرحد پار کی اور بونا سنگھ دیر تک گرواڑائی گاڑی کی دھول دیکھتا رہا۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی ڈاڑھی میں جذب ہوتے رہے اور پھر گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مہندر اس سے دور جا چکی تھی۔ مغویہ خواتین کے کیمپ میں عجیب طرح کی افراتفری مچ چکی ہوئی تھی۔ پھڑپھڑے ہوئے اپنے پیاروں کو متلاشی نگاہوں سے دھونڈ رہے تھے۔ اگر کوئی کسی سے اتفاقاً مل بھی جاتا تو ہاتھوں کے بند ٹوٹ پڑتے، ہچکیاں بندھ جاتیں، سسکیوں سے فضا ہو جھل ہو جاتی۔

مہندر اپنی بیٹی تنویر کو رکھ سے لگائے ہر آنے جانے والے کو گھور رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک عورت کافی دیر سے اسے ملنے کی باندھ کر دیکھ رہی ہے مگر وہ تو ان ہے، کیا وہ بچھے جانتی ہے؟ خیالات کا ایک ریڑا اس

READING  
Section



نئے ذہن میں آتا اور وہ بھاگتے، روہرتے، سہمے ہوئے لوگوں کے چہرے تکٹے لگ جاتی۔

وہ عورت تھوڑی ہی دیر بعد اس کے قریب آئی اور پوچھا:

”بی بی! تو کہاں سے آئی ہے اور تیرا نام کیا ہے؟“  
مہندر کو یہ آواز مانوس سی معلوم ہوئی۔ بچپن کی یادیں کسی متحرک تصویر کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومنے لگیں۔ کوہاڑے کے جنوبی کونے میں ان کا صاف ستھرا مکان، مکان کے سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا وسیع سرسبز میدان، اس میدان میں اس کی بڑی بہن انوری سے اس کی لڑائیاں، کھیل کود، آنکھ پھولی۔

”میرا نام نہیب ہے کوہاڑے میں اپنی بہن انور ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں باپ میری آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے، بہن کو فساد یوں نے اغوا کر لیا اور پھر میں ایک نیک دل سردار کے گھر چلی، بڑھی۔“

”میری نہیب، میری بہن! میری طرف دیکھ، میں تیری بد نصیب بہن انوری ہوں۔ آج میرے سینے سے لگ جا۔ میرے کپڑے کی ٹھنڈک، میری آنکھوں کا نور۔“  
دونوں بچنیں یوں ایک دوسرے سے چٹ گئیں جیسے ازل سے دو پھڑکی ہوئی روہیں ہوں۔ آنسو ایک سیلاب کی طرح بہنے لگے غبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ دس سال کے طویل عرصے کے بعد وہ مل رہی تھیں۔

”بہنا! میں جلتے میں ایک بار ضرور اس کیسپ کا پتھر لگانے آ جاتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا تم زندہ ہو اور ایک روز ضرور تم آؤ گی۔ میری زینو! تو کیا جانے میں نے جدائی کی یہ گھڑیاں کس طرح رو رو کر کالی ہیں۔ میری بائبل جالی اٹھا اگر نہ ملتی تو میں رو رو کر اندھی ہو جاتی۔ دیواروں سے سر پھوڑ لیتی، ان سے مل، یہ تیرے بہنوئی بشیر ہیں۔“

بشیر نے پیار سے نہیب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی گود میں چمکتی تصویر کو گلے سے لگا لیا اور پھر یہ لوگ چوکی

روانہ ہو گئے۔ ادھر ہونا سنگھ مہندر (نہیب) نے فراموشی سے اپنی سب کی طرح نڈپ رہا تھا۔ دو دن فجر البیر کو کاندھوں پر اٹھائے دفتروں کے چکر کاٹا۔ کبھی ہائی کمیشن کے دفتر، کبھی آباد کاری کے دفتر اور کبھی مغویہ خود متین کے دفتر لیکن ہر جگہ سے اسے نکالنا جواب ملتا۔ سب اسے یہی کہتے کہ وہ مہندر کا خیال دل سے نکال دے۔ مہندر اس کے لئے کمان سے نکلا ہوا ایک ایسا شیر بن چکی تھی جس کی تلاش بے سود تھی لیکن عشق ان دنیاوی بندھنوں اور انسانی رکاوٹوں پر خندہ زن تھا۔ انسانی حد بند یوں اور قوانین کا دل کی راجدھانی پر حکم نہ چل سکتا تھا، اس نے کوشش جاری رکھی اور آخر وہ کسی نہ کسی طرح بشیر کا پتہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نہ جانے کس طرح اس نے سرحد پار کی۔ چھپتا چھپاتا مسلمانوں کے گھیس میں وہ چوکی پہنچا اور بشیر کے دروازے پر دستک دی۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ بشیر نے پوچھا۔  
”میں سرحد پار سے آیا ہوں اور اپنی بیوی مہندر کو ر سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ مہندر کون نہیں ہے، نہیب ہے۔ ہم نے اسے دوبارہ مسلمان بنالیا ہے۔ تم سنگھ ہو اور تم نے مسلمانوں کی ایک عورت کو خراب کیا ہے۔ اگر عافیت چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ مسلمان تمہاری جگہ بولی کر دیں گے۔“

”مہندر کون پھر سے مسلمان ہو گئی ہے۔ وہ میرے لئے نہیب سے مہندر بنی تھی تو کیا میں اس کے لئے ہونا سنگھ سے جیل احمد نہیں بن سکتا۔“  
”جیل احمد!“

”ہاں، ہاں جیل احمد۔ یہ نام مجھے بے حد پسند ہے۔ میرے بچپن کا ایک بار بھی جیل احمد تھا۔ غنڈوں اور فساد یوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں بشیر صاحب! مجھے مسجد میں لے چلئے۔ میرا انتظام

READING  
Section



نسیب پر انہی طرح واضح کر دیا گیا کہ مسلمانوں کے اذنی دشمن سنگھ سے اس کا نبھاہ نامکس ہے۔ اس سیدھی سادی دیہاتی لڑکی نے ان باتوں کا گہرا اثر لیا اور اپنے ”سابقہ گناہوں“ پر چھٹانے لگی۔ تاریخ مقررہ نہ نسیب اور بوٹا سنگھ عدالت میں پیش ہوئے لیکن بوٹا سنگھ کی توقعات کے بالکل برعکس نسیب نے اس سے مکمل انعطاف کا اظہار کیا اور بھری عدالت میں اسے صلواتیں سناتے لگی بوٹا سنگھ نے چیختے ہوئے کہا۔

”میرے بچوں کی ماں نسیب! مجھے یوں نہ نظر آ رہی میں اپنا وطن، اپنے عزیز اور اپنا قبیلہ چھوڑ کر تیرے در پہ آیا ہوں۔ نسیب! تجھے پیارے رسول کا واسطہ نہ رہی تہ لیل نہ کر۔ میں اب بوٹا سنگھ نہیں ہوں بلکہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تیرے رسول پر ایمان لے لیا ہوں۔ اپنا قدیم مذہب ترک کر دیا ہے۔ تیرے بھائی بندوں میں شامل ہو گیا ہوں۔ نسیب! اسے قول و قرار سے آنکھیں بند نہ کر۔ تجھے تویر کا واسطہ دھیر کا واسطہ۔ مجسٹریٹ صاحب! مجھ پر دلی پر رحم کیجئے۔ ہمارے رسول کا بھی یہی حکم ہے کہ جو شخص زبان سے یہ کہہ دے کہ وہ مسلمان ہے اسے مسلمان ہی سمجھنا چاہئے۔ میں کیونکر اپنا دل چیر کر آپ کو دکھاؤں۔ خدا کے لئے میرا گھر نہ اجاڑیے۔ مجھے نسیب اور میرے بچے دے دیجئے۔“

وہ نہ جانے کتنی دیر وہاں چلا تا رہا لیکن نسیب اپنے رشتہ داروں کے جلو میں وہاں سے چلی گئی وہ چیختا رہا اور پھر اس کی چیخیں گاڑیوں کے شور اور لوگوں کے ہجوم میں جذب ہو کر ڈوب گئیں۔

عدالت نے بوٹا سنگھ کے استدلال کو رد کر دیا تھا اور نسیب کو اپنے شوہر منظور کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

جیل احمد کی دنیا اجاڑ ہو گئی۔ وہ اپنے کاندھے پر لمبر کو اٹھائے بے مقصد آوارہ گردوں کی طرح گھومتا رہا۔

جیل احمد کو دیکھتے لیکن خدا اور رسول کے واسطے میری بیوی اور بچی کو مجھ سے ملوا دیجئے۔ میں ان کے بغیر ایک بے گھر شخص بن رہا ہوں۔

لیکن نسیب تو یہاں نہیں ہے وہ لاہور کے ایک موضع نور پور چلی گئی ہے۔ وہاں ہمارے بچہ رشتہ دار ہیں وہ ان کے ساتھ راتی ہے۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ اگر واقعی تمہارا دل نور ایمان سے متور ہے اور تم اسلام کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو سبحان اللہ، آج کے بعد تم انارک سے واپس بھائی ہو۔

دوسرے روز اتوری، اس کا شوہر بشیر اور پاکستان میں نو وارد بوٹا سنگھ موضع نور پور جا رہے تھے ان پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور بوٹا سنگھ تصور ہی تصور میں نسیب سے باتیں کر رہا تھا۔

نور پور پہنچ کر بوٹا سنگھ کو ایک الگ جگہ ٹھہرایا گیا سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک سنگھ نسیب کا تعاقب کرتے ہوئے اسے لینے آیا ہے۔ سولویوں نے فتوے دیئے کہ مرد و دو قابل گردن زدنی ہے۔

بڑے بوڑھوں نے کہا کہ کافر حیلہ بازیوں سے کام لے رہا ہے۔

بڑوسیوں نے کہا یہ خبیث ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے آیا ہے۔

عورتوں نے کہا اس کی ٹکا پوٹی کر ڈالو۔ بوٹا سنگھ نے کہا۔ ”مجھے اور نسیب کو عدالت میں لے چلو۔ وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

پنجابیت نے یہ بات مان لی اور فیصلہ ہوا کہ اگلے چاند کی دس تاریخ کو دونوں کو لاہور کے کسی مجسٹریٹ کے روئے پیش کر دیا جائے۔ بوٹا سنگھ اس دوران لاہور چلا آیا اور چاند کی دسویں تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔

اس اثنا میں گاؤں والوں کے مشورے سے نسیب کا نکاح بستی کے ایک نوجوان منظور احمد سے کر دیا گیا اور

READING  
Section



کے تازخروں سے برداشت کرنے میں کسی قسم کی شرم یا خجاست محسوس نہیں کرتے تو وہ ایک معصوم لادارٹ اور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی بچی کو کیوں اپنے کلیجے سے نہیں لگا سکتی؟ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق منور کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس کی نشست و برخاست کا خیال رکھا۔ اسے سوسائٹی کے معزز اور نامور افراد سے ملایا اور جوان ہونے پر اس کا ہاتھ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیا جو ہر طرح سے منور کے اہل تھا۔

اس نیک دل خاتون نے بتایا کہ دراصل تقسیم ملک کے وقت میں نے انسانی ظلم و ستم کے جو واقعات دیکھے تھے اس نے میری روح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں پہرہوں سوچتی رہتی کہ آخر انسان اس قدر بوکھلا کیوں گیا ہے؟ کیوں اس پر وحشت اور پاگل پن سوار ہو گیا ہے؟

مغویہ خواتین کی بازیابی کے سلسلے میں میں نے درندگی اور مردم آزاری کے جو ہولناک مناظر دیکھے انہیں دیکھ کر میں انسان کے مستقبل سے تقریباً مایوس ہی ہو گئی اور جب منور ایک بے سہارا بچی کے روپ میں میرے سامنے آئی تو میں تڑپ اٹھی اور اسے گھٹے لگایا اور میں سوچ رہا تھا کہ جس روز مشیت نے یہ محسوس کیا کہ خطہ ارض پر اس کا خلیفہ سرکش بنے رہے اور اس سے بدگمان ہو گیا ہے وہ انسانی وجود کی بقا کا آخری دن ہو گا اور پھر

”بڑے بڑے دیوبند کے پہاڑ اس طرح فضاؤں میں اڑتے پھریں گے جیسے روٹی کے گالے ہوں۔ آسمان سے آگ برسنے لگے گی اور سمندر آبادیوں پر چڑھ دوڑیں گے اور کائنات آٹن واحد میں دم توڑ دے گی۔“

جمیل احمد کے دل میں کیا تھا؟

کیا اس نے اسلام تہہ دل سے قبول کر لیا تھا؟

کیا وہ واقعی شہیدِ محبت تھا؟

خدا کی باتیں خدا ہی جانتے۔

\*\*\*

پھر اسے ایک خیالی سوچا۔ ایک ادارہ سا خیال ایک عاشق کا خیال۔ وہ شاہد رہ رہوے شیشیں پر بے مقصد گھومتا رہا۔ اچانک اسے دور سے گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس نے ہل بھر لے لئے کچھ سوچا اور پھر اپنی بچی سمیت اپنے آپ کو ریلوے لائن پر گرادیا۔ دیوبند کے انجن کے چمچنے نے بچی کو اٹھا کر پرے پھینک دیا لیکن اس کے ہنسی اسٹاک پہنے یوٹا سنگھ کو کچلتے ہوئے گزر گئے وہ جسم کی قید سے آزاد ہو چکا تھا اس کی جیب سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا:

”میری جیب سے ملنے والا اثاثہ چودہ سو روپے کسی نیک کام پر لگایا جائے۔ مجھے نسیب کے گاؤں نور پور میں دفن کیا جائے۔ نسیب کو کہا جائے کہ اگر اس سے ہو سکے تو کبھی کبھی میری قبر پر آ کر چراغ جلا دیا کرے۔“

(جمیل احمد)

لیکن انتظامیہ نے فرقہ وارانہ فساد کے پیش نظر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ اس کی نماز جنازہ میں ڈیڑھ دو ہزار افراد نے شرکت کی۔

کیا نسیب اس کے مزار پر اس کی وصیت کے مطابق چراغ جلاتی ہے؟ کیا اب بھی نسیب کے دل میں جمیل جگنو بن کر چمکتا ہے؟

کیا دیکر جو اب منور کے نام سے مشہور ہے اپنی ماں نسیب عرفہ مہندر کو یاد کرتی ہے؟

افسوس، نسیب مجھ سے دور ہے پتہ چلا تھا کہ وہ بیرون ملک چلی گئی تھی۔ اس کی شادی بھی وہیں ہوئی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میں اس سے نہیں مل سکتا۔ ”منور اب پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ ایک برادر اسلامی ملک میں رہتی ہے۔ منور چار سال کی بچی تھی جب لاہور کی ایک خاتون وکیل نے اسے گود لے لیا اس وقت اس مہربان خاتون کے احساسات یہ تھے کہ جب لوگ کتوں، گھوڑوں اور طوطوں کو پالنے اور ان

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



# آگ ابھی بجتی نہیں

بھارت کے ساتھ امن کی آشا اور پیر کی بھاشا کا راگ اپنے والوں کے لئے تازیانہ



☆ اشتیاق احمد

کوئی نہ تھا جو ڈاکوؤں کے مقابلے پر نکلتا۔ انہوں نے اپنی لائیاں نہیں اور ڈاکوؤں پر ہل پڑے۔ پھر لوگوں نے ڈاکوؤں کو دم دبا کر بھاگتے ہی دیکھا۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ان کی ذات سے منسوب تھے۔

اجیت سنگھ کہا کرتا تھا۔ ہم تینوں بھائی ہیں۔ وقت پڑنے پر ہم ایک دوسرے کے لئے جان کی بازی لگا دیں گے۔ جواب میں محمود الحسن اس کا شانہ تھپکتا۔ کوئی وقت آئے تو کسی، تم سے پہلے میں جان دوں گا۔ فاروق بھی پیچھے نہ رہتا۔ تم دونوں سے پہلے میں مروں گا۔

پھر وہ وقت آئی گیا۔ جب انہیں ایک دوسرے کے لئے مرجانا چاہئے تھا۔ ملک میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ ہندو اور سکھ مل کر مسلمان بستیوں پر دھاوے بولنے لگے۔ آگ پھیلنے لگی اور ایک دن اس آگ نے پانی پت کو بھی

لحوں تک بغور دیکھنے کے بعد محمود الحسن پہچان گیا۔ چند کہ اس کا بدترین دشمن آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دشمن جو کبھی جگر کی دوست تھا۔ پندرہ بیس سکھوں کے درمیان کھڑا اجیت سنگھ، آج بھی نیلی قمیص میں تھا۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کہتے جا رہا تھا۔ اس بات سے اعظم کہ اس کے دیرینہ دوست نے آج اسے اڑھوٹ لیا ہے اور موت اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔

پچیس سال پہلے محمود الحسن اور اجیت سنگھ پانی پت کے ایک ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔ وہ لنگوٹے یا رہتے۔ ان کا ایک اور دوست بھی تھا جس کا نام فاروق تھا۔ یوں کبھی اسے فاروق اعظم کہا کرتے تھے۔ اجیت سنگھ کو نیلا رنگ بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ نیلی قمیص میں ملبوس نظر آتا۔ انہوں کی دوستی مثالی تھی۔ ایک بار ان کے محلے پر مسلح ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تو پورے محلے میں ان تینوں کے سوا

READING  
Section



محمود اجیت کی باؤں سے مصمتن نہیں تھا۔ پائنتار کا اعلان ہوتے ہی ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ اجیت بازار پہلے کی نسبت زیادہ زور شور سے شرم ہو گیا۔ اس سے محمود اور فاروق تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اجیت سنگھ کا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے اور انہیں یہاں ٹھہرنے میں بھی عافیت نظر نہیں آتی تھی۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ایک صبح محمود کی والدہ پر ہلکا دورہ پڑا۔ اس وقت تینوں وہیں موجود تھے۔ اجیت سنگھ نے محمود کو قہراً ڈاکٹر کو لانے کا مشورہ دیا۔

”ایسے میں ڈاکٹر کہاں سے گا؟“  
”تم کوشش تو کرو، ہم دونوں یہاں چوکس بیٹھے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“  
”ہاں محمود! تم ضرور کسی ڈاکٹر کو ڈھونڈنا۔“  
فاروق نے بھی موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

وہ ڈاکٹر کی تلاش میں نکلا۔ اسے کسی دکان، کسی شفا خانے میں کوئی ڈاکٹر نہیں ملا۔ دکانیں دواؤں سے جوں کی توں بھری پڑی تھیں مگر کوئی تنفس نہیں تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مارے مارے پھرنے کے بعد لوٹا تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ وہاں اجیت تھانہ فاروق دیاں تھی نہ بہن گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں پتھر کی گئیں۔ ایک برچھی ماں کے سینے میں پیوست تھی، دوسری فاروق کے سینے میں لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا بچہ تو بہن کی لاش دیکھ کر دھل گیا۔ وہ لڑا تھا۔ کاش بہن کی بہن کی لاش بھی ماں اور فاروق کی لاشوں کی مانند ہوتی۔ اس کے جسم میں بھی کوئی برچھی پیوست ہوتی۔ اسے گا گھونٹ کر مار دیا ہوتا۔ وہ کیسے مر گئی۔ اس کا تصور بھی محمود کے سینے اس قصد وحشت ناک تھا کہ اس کا جی چاہا، والدہ کے سینے سے برچھی نکال کر اپنے سینے میں بھونک لے یا پھر باہر نکل کر ان وحشی درندوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے ایک

اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”اجیت سنگھ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے، آخر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، یہ کیوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ اجیت سنگھ! تمہارے بھائی بھی تو ہندوؤں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ تم ان کو کیوں نہیں روکتے اجیت سنگھ؟“ یہ کہتے وقت محمود کی آواز بھرا جاتی اور آنکھیں اند بڑھتی۔

”میں تو ان کے ساتھ نہیں ملا ہوں محمود! پھر تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم پر اور تمہارے گھر پر آج نہیں آئے گی۔ اسی طرح فاروق کا گھر بھی محفوظ رہے گا۔ سب جانتے ہیں، تم دونوں میرے دوست ہو۔“

”مگر اجیت! میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ان کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا جا رہا ہے۔ ان کی بیٹیوں کی عصمت لٹی جا رہی ہے۔ کیا یہ آگ ہمارے مکے تک نہیں پہنچے گی؟ تم تنہا کیا کر لو گے۔ تم انہیں کیسے روک سکو گے؟ کیا وہ تمہارا اس وقت تک خیال کر لیں گے؟“

”تم فکر نہ کرو۔ اجیت پھر کہتا۔

”میں فکر نہ کروں یہ کیسے ہو سکتا ہے اجیت! میرے گھر میں میری بوڑھی ماں ہے، جوان بہن ہے۔ اسی طرح فاروق کے بھی ماں باپ ہیں اور بہن بھی، اور ہم صرف تین آدمی ہیں۔ کوئی گروہ ہم پر ٹوٹ پڑا تو ہم کیا کر لیں گے؟“

”تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ ہم تینوں نے ڈاکوؤں کے پورے گروہ کو مار بھگایا تھا؟“

”وہ ڈاکو تھے اجیت! ان کا کام صرف دولت لوٹنا تھا۔ یہ ڈاکو انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان سے نبھنا اتنا آسان نہیں۔“

”میں کہتا ہوں تم فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی براقت نہیں

آئے گا۔“

READING  
Section



مسلمانوں کا قافلہ تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلا نہیں تھا کہ قافلہ ایک پیشل ٹرین میں سوار ہو گیا۔ محمد حسین نے اسے بھی سوار کرایا۔ اس وقت اس پر غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ پھر محمد حسین نے اسے بتایا کہ تمہارے جاتے ہی اجیت سنگھ گھر سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گھر سے چندہ بیس سنگھ نکل کر تمہارے گھر کی طرف بڑھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے فاروق پر برچھیاں تان لیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اجیت اس طرح دغا دے گا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس وقت چونکا جب اجیت تمہاری بہن کی طرف بڑھ چکا تھا۔ فاروق سے رہا نہ گیا۔ وہ پوری قوت سے چلایا: ”اجیت یہ ظلم نہ کرو۔ ہمیں جان سے مار ڈالو۔ مگر ایسا نہ کرو۔“

”اگر تم نے زیادہ بکواس کی تو تمہاری بہن کا بھی یہی حشر ہوگا۔“ یہ کہہ کر اجیت پھر رخسانہ کی طرف بڑھا۔ فاروق کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے برچھیوں کی پروا کئے بغیر اجیت پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے ایک برچھی اس کے جسم کے پار ہو گئی۔ محمود نے تقریباً چلاستے ہوئے پوچھا: ”مگر تم کہاں تھے؟“

”مم..... میں..... چھت کے قریب والے روشن دان سے دیکھ رہا تھا۔“

”اور تم دیکھتے رہے؟“

”میں مجبور تھا دوست، میں بالکل نہت تھا اور پھر مجھے اپنے بیوی بچوں کو بھی قافلے تک پہنچانا تھا۔“

”بے غیرت ہو تم۔“ محمود غصے سے کانپ اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ محمد حسین کے گلے کی طرف بڑھے۔ پھر جیسے وہ ہوش دھواں کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس کے بازو نیچے لٹک گئے۔ نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔

آج وہی اجیت سنگھ اس کے سامنے موجود تھا۔ آج

چادر سے بہن کے برہنہ جسم کو ڈھانپا اور لاشی ہاتھ میں لئے باہر نکل آیا۔

دفعۃً اسے فاروق کے ماں باپ اور بہن کا خیال آیا۔ وہ بجلی کی طرح فاروق کے گھر کی طرف دوڑا۔ سڑکوں کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ یہاں کا منظر بھی مختلف نہ تھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو گر ہی گیا ہوتا۔ ابھی وہ گم سم کھڑا تھا کہ کسی نے اسے دھتکتے سبھ میں پکارا۔ ”محمود..... محمود..... تم کہاں ہو.....“ خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو، ورنہ تم بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

یہ محمد حسین کی آواز تھی، اس کے پڑوسی کی۔ وہ باہر نکل آیا۔ محمد حسین دو آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟ اجیت کہاں ہے؟ اور تم اس وقت کہاں تھے؟“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے محمود! مسلمانوں کا ایک قافلہ جلد ہی روانہ ہونے والا ہے، ہمیں فوراً اس تک پہنچ جانا چاہئے ورنہ ہمارا بھی یہی انجام ہو گا۔“

”اب مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں، تم یہ بتاؤ یہ سب ہوا کیسے اور کن نے کیا؟ اجیت کہاں گیا؟“

”اس کا نام نہ لو..... یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ آؤ اب چلیں۔“

”کیا! یہ اجیت کا کام ہے؟“ محمود پر ایک بار پھر بجلی گری۔ اس کے حواس تحمل ہو گئے..... وہ بڑبڑایا۔ ”اگر یہ سب اس نے کیا ہے تو میں اس سے انتقام لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔“

”تم یوں نہیں مانو گے۔“ اس کے ساتھ ہی محمود کے سر پر ایک ڈنڈا لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ ایک تیل گاڑی میں تھا۔ یہ

READING  
Section



میرے دوست، میرے پڑوسی، میرے افسر، یہ وقت انتقام کا نہیں، انتقام کی آگ کو اندر ہی اندر دبا بیٹھنے کا ہے۔ یہ لو اپنا پستول، اب تم مختار ہو۔

محمد حسین خاموش ہو گیا۔ اسی کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہا ہے تھے۔ محمود کے سینے میں لاوا ابل رہا تھا، مگر وہ مجبور تھا، بے بس تھا۔ یک لخت اس کے قدم اجیت کی طرف اٹھنے لگے۔ محمد حسین بوکھلا گیا۔ اس نے چاہا کہ دوڑ کر محمود کو روک لے، مگر پھر اس کے قدم زمین میں گڑ گڑ کر تر ہو گئے۔ نہ جانے کیوں؟

اجیت کا منہ دوسری طرف تھا۔ محمود نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اجیت پلٹا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ محمود کو پہچان لینے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر اس کی وردی اور ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول پر بھی پڑی۔ وہ تھرا اٹھا۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

”تت..... تت..... تم.....“ اس کے منہ سے بس یہی الفاظ نکل سکے۔

”ہاں، میں..... میں تم سے انتقام لوں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے مگر اس وقت یہ ممکن نہیں۔ افسوس تم میرے سامنے اس وقت آئے جب فرض کی پہنی بیڑی نے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہیں اور میں جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔ یہ مرتے دم تک بدستور رہے گی، یہاں تک کہ ایک دن تم پھر میرے سامنے ہو گے اور اس وقت میں مجبور نہیں ہوں گا۔ قانون کا پابند نہیں ہوں گا۔ میں ہر طرح آزاد ہوں گا۔ اس دن میرے پستول کی گولی تمہارے سینے میں اتر جائے گی۔ وہ دن آئے گا، ضرور آئے گا..... اور یہ تمہاری دھرتی پر ہوگا۔“

محمود کا گلا زندہ گیا اور وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

\*\*\*

جس کا وہ پوسٹل اسپیکٹر تھا۔ چند روز پہلے اسے ہدایات ملی تھیں کہ سکھ یا تری پاکستان آ رہے ہیں۔ ان کے جان و مال کی حفاظت پر تمہیں مامور کیا جاتا ہے۔ کسی ایک سکھ کو بھی گزند نہ پہنچے اور نہ ان کے مال و اسباب کا نقصان ہو کیونکہ یہ ملک کی عزت کا سوال ہے۔

وہ خیالات میں سمم ٹنگی ہاندھ کر اجیت کو گھورے جا رہا تھا۔ دفعۃً اس کا ہاتھ پستول کے دستے کی طرف بڑھا۔ چمڑے کی پٹی کا ٹن کھلا اور پھر پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی وقت ایک سب اسپیکٹر اس کی طرف بڑھا۔ ”کیا بات ہے جناب!“

”اوہ، محمد حسین! ادھر آؤ۔ اس نیلی قمیض والے سکھ کو دیکھ رہے ہو تم..... ذرا پیچا تو اسے۔“

محمد حسین نے سکھ کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں دیکھتا رہا پھر چونک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محمود کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے، لاؤ پستول مجھے دو۔“ محمود غرایا۔

”میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ تمہارا مجرم اجیت سکھ ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں انتقام کی آگ ابھی بجھ نہیں ہے۔ تم نے قسم کھائی ہے کہ زندگی میں اگر کبھی اجیت سامنے آیا تو اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کرو گے۔ یہ ہے بھی اس سے بڑی سزا کا مستحق، تم میرے افسر ہو اور میں تمہارا ماتحت ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا پڑوسی بھی ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنے افسر کا نہیں، پڑوسی کا نہیں، تمہارے جذبات کا نہیں، ملک کی عزت کا پاس زیادہ ہے۔ فرض کا احساس ہے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ان سکھوں کی حفاظت کا فرض ہمیں سونپا گیا ہے۔ کیا تم فرض کی انجام دہی سے غفلت برتنے کے مرکب ہونا چاہتے ہو؟ تم اپنے افسردہ کو، اپنے ملک کو کیا جواب دو گے جس نے تمہارے کندھوں پر ان کی حفاظت کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ نہیں میرے بھائی،

READING  
Section



## پاکستان کیوں ضروری تھا؟



ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں جو کبھی ایک نہیں ہو سکتیں

baloehsk@yahoo.com

☆ سکندر خان بلوچ

اتنے ام گرتے تھے۔ پھر آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ ایک ہزار سال اکٹھا رہنے کے بعد ہم علیحدہ ہو گئے اور صرف علیحدہ ہی نہیں ہوئے بلکہ ایک دوسرے کے ویری ہو گئے۔ ہزار سال کی دوستی چند دنوں میں اتنی شدید نفرت میں بدل گئی کہ 1947 میں مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے 10 لاکھ آدمیوں کو سبے رحمی اور بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ نفرت کی آگ سے نہ تو معصوم بچے بچ سکے نہ کمزور بے سہارا خواتین اور نہ کمزور بیمار و لاغر عمر رسیدہ اشخاص۔

کیا انسانی رشتے اتنے کمزور و بے مایہ ہیں؟ کیا نفرت کی آگ انسانی اقدار سے بھی زیادہ طاقتور ہے؟ ہماری نئی نسل، ماشاء اللہ بہت ذہین، سمجھدار، با علم اور باشعور ہے۔ ان دلائل میں کافی وزن ہے جنہیں آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہم چونکے و پھلے 68 سال سے علیحدہ رہ رہے ہیں لہذا ہماری نئی نسل ہندو راج اور ہندو سامراج کے مزاج سے ناواقف ہے۔ اس لئے ان

آج کل ہمارے حکمران بھارت کو "ہندو ملک" قرار دینے کے لئے بہت بے چین ہیں۔ "ارن کی آشا" کی ذیلی بھی زور سے بجائی جا رہی ہے۔ بھارت دوستی کا جوش اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ بھارت کا کشمیر پر غاصبہ قبضہ اور مشرقی پاکستان کا زخم بھی ہم بھول چکے ہیں۔ بھارت دوستی کے لئے نوجوان نسل کی بھی مختلف انداز میں برین واشنگ کی جا رہی ہے جس وجہ سے نوجوان نسل باشعور اور پڑھے لکھے نوجوان پاکستان و ہندوستان کے تعلقات کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ برصغیر کئی سو سال ایک ملک رہا ہے۔ ہندو مسلم کم از کم ایک ہزار سال اکٹھے رہے ہیں۔ کئی مسلمان بادشاہوں اور امراء نے ہندو گھرانوں میں شادیاں کیں۔ ایک جگہ رہتے ہوئے باہمی ایک دوسرے کی خوشی مٹی اور دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں بن سنور کر شرکت کرتے رہے، ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کا بھی

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



ہیں۔ یہ عملی مثالیں بہت گہرے معانی رکھتی ہے۔ اس۔  
بعد ہندو وفد بغیر کسی مزید بحث کے واپس چلا گیا۔

اب جبکہ زنیہ رمودی کا ہندوستان اور نواز شریف کا  
پاکستان تعلقات کے سنے دور اسے پرکھنے سے ہیں اور خدا  
کرے کہ نفرت کی آگ بجھ جائے لیکن میدان سے کیونکہ  
ہندومت بنیادی طور پر بنیاد پرست مذہب ہے جو دنیا کی  
باقی اقوام کو تو شاید برداشت کر لے لیکن مسلمانوں کو قطعاً  
برداشت نہیں کرتا۔ حسب ذیل چند مثالیں میرے نقطہ نظر  
کی وضاحت کریں گی۔

1820ء میں جب گلاب سنگھ ڈوگرہ جہوں کا  
جائیدادار بنا تو اس نے بہت جلد ارد گردی چھوٹی چھوٹی  
مسلمان جائیدادوں پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا اور 1840ء  
تک اس کی فتوحات کلکتہ بلتستان اور تبت تک وسیع  
ہو چکی تھیں۔ بد قسمتی سے وہ مسلمانوں کے خلاف سخت  
متعصب تھا اور مسلمانوں کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ایک  
وقت اس نے متھرا میں ہندومت کے بڑے پرہت و  
کشیر آنے کی دعوت دی اور وہ جب آیا تو اس نے  
مسلمانوں کو زبردستی ہندومت میں تبدیل کرنے کا فتویٰ  
مانگا جس سے اس نے انکار کر دیا اور نہ آج کے پورے کشمیر  
میں مسلمان خال خال ہوتے۔ ہندو مذہب اور تعصب کی  
اس سے زیادہ کیا مثالی ہو سکتی ہے کہ مسلمان کئی سو سال  
ہندوستان کے حکمران رہے لیکن کبھی ہندو مذہب میں  
داخل اندازی نہیں کی لیکن ہندوؤں کو جب بھی موقع ملا  
مسلمانوں کی جان، مال عزت اور مذہب پر کاری ضرور  
لگائیں۔ گجرات کے فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام  
ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

ایک دفعہ مہاراجہ گلاب سنگھ مختلف علاقوں کے  
دور سے پر لکھا۔ ایک جگہ اس نے دیکھا کہ کچھ قیدی ایک  
چھوٹی سی ندی پر پل بنا رہے تھے۔ ان قیدیوں میں ایک  
نوجوان شخص بڑی محنت اور تندہی سے کام کر رہا تھا۔

میں سے کچھ لوگ انسان دوستی کے نام پر پاک و ہند کی  
تقسیم کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہندو سامراج  
کی میٹھی باتوں کی یہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہذا ان سوالات کا  
جواب دینا ضروری ہے اور اس کے لئے کچھ سچے واقعات  
پیش خدمت ہیں۔ نتیجہ خود اخذ کر سکتے ہیں۔

یہ 1946ء کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جناب قائد  
اعظم غالباً مدراس یونیورسٹی میں مسلمان طلباء سے خطاب  
کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ خطاب سے پہلے  
ہندو طلباء کا ایک وفد ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اس وفد  
کے لیڈر نے قائد اعظم سے جذباتی انداز میں ایک لمبی  
تشریح کے بعد سخت الفاظ میں سوال کیا کہ ”آپ آخر  
بھارت مانا کے ٹکڑے کرنے پر کیوں بضد ہیں؟“ قائد  
اعظم نے بڑے تحمل سے یہ ساری باتیں سنیں۔ جب  
طالب علم لیڈر جواب کے لئے خاموش ہوا تو قائد اعظم  
نے بجائے لمبا جواب دینے کے اپنے سامنے رکھا ہوا پانی  
کا گلاس اٹھایا۔ دو تین گھونٹ پانی پیا اور پھر بقیہ گلاس اس  
طالب علم کی طرف بڑھا کر کہا لو اسے پی لو۔ لڑکا حقارت  
سے پیچھے ہٹ گیا کیونکہ ہندو مسلمانوں کو ناپاک سمجھتے ہیں  
اور ان کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی کوئی چیز کھانا حرام سمجھتے  
ہیں بلکہ اگر پکٹا ہوا کھانا کوئی مسلمان دیکھ لے تو ان کے  
لئے وہ پکا ہوا کھانا بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ لہذا طالب علم  
نے نفرت سے جواب دیا کہ یہ ناپاک پانی میں کیوں  
ہوں؟ قائد اعظم نے پھر پوچھا آخر یہ ناپاک کیسے ہو گیا؟  
طالب علم نے جواب دیا، آپ نے اس گلاس میں سے پانی پیا  
ہے اور مسلمان کا جوٹھا پانی پینے کے لئے میرا مقدس  
مذہب اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے وہی گلاس ایک ساتھ  
کھڑے ہوئے مسلمان طالب علم کی طرف بڑھا کر اسے  
پینے کا حکم دیا جو وہ غٹا غٹا پی گیا۔ اب قائد اعظم نے ہندو  
وفد اور ہندو طالب علم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے  
عزیزو! یہی وہ وجہ ہے کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ وطن چاہتے

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



رہی تھی۔ 1888 میں انگریز کرنل الٹرمین ڈیورینڈ تان علاقہ جات کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا بعد میں اس نے اپنے تجربات MAKING OF A FRONTIER کے نام سے کامیاب کتب میں شام ہوئی ہے۔

کرنل ڈیورینڈ لکھتا ہے کہ جب وہ گلگت کے لئے روانہ ہوا تو اس نے ضروری سمجھا کہ جانے سے پہلے سری نگر میں مقرر برٹش پولیٹیکل ایجنٹ اور مہاراجہ کیمبرے راہنمائی حاصل کی جائے۔ لہذا وہ اس مقصد کے لئے سری نگر پہنچا تو مہاراجہ نے اس کی سہولت کے لئے چند سپاہی اور کچھ مزدور ساتھ کر دیئے۔ سری نگر سے روانگی کے بعد پہاڑی اڈا ٹھری پورہ کے نزدیک تھا۔ یہ صاحب خود تو گھوڑے پر وہاں پہنچ گئے لیکن غیہہ وغیرہ اور بقیہ سامان کا حال نہیں پہنچے تھے لہذا انتظار کرتا پڑا۔ وہ لکھتا ہے کہ کچھ دیر بعد کچھ مزدور سر پر سامان اٹھائے ہوئے وہاں پہنچے لیکن تیزان کن بات یہ تھی کہ تقریباً ڈیڑھ من سے زیادہ وزن کا خیمہ ایک ہی شخص نے اٹھا رکھا تھا اور ڈوگرہ سپاہی اسے ڈنڈے مارے ہوئے لارہے تھے۔ یہ شخص سینے میں شرا اور داغہ اٹھا کر تقریباً نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنا زیادہ وزن ایک آدمی کے سر پر لاد کر نئی سکل پیدل چلانا اور وہ بھی ڈنڈے سے زور پر سہا سہا غیر انسانی فعل اور ظلم تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تمام مزدور مسلمان ہیں اور تمام سپاہی ڈوگرہ سے اور یہ لوگ مسلمانوں سے اسی طرح جبری مشقت لیتے ہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جب میں ڈوگرہ سپاہیوں کو ان مزدوروں کے لئے مزدوری دینے لگا تو اس شخص نے رد کر کہا کہ حضور یہ مزدوری ہمیں تو نہیں ملے گی لہذا اس نے مزدوری خود ان مسلمانوں کو ادا کی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ رقم تو یہ لوگ ان سے چھین لیں گے لہذا اس نے ڈوگرہ سپاہیوں کو بھی سے منع کیا کہ رقم نہ چھینی جائے ورنہ وہ ان کے خلاف

گلاب سنگھ اس کے کام سے بڑا خوش ہوا۔ اسے بلا کر شاباش دی اور پوچھا کہ تم کیا انجام چاہتے ہو؟ قیدی نے جواب دیا کہ جناب مجھے آزاد کر دیں۔ پوچھا تم کس جرم میں قید ہو؟ قیدی نے امید سے جواب دیا۔ مجھ سے ایک چھوٹی لڑکی کا قتل سرزد ہوا تھا۔ مزید پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟ جواب ملا حضور مسلمان ہوں۔ قتل ہونے والی لڑکی ہندو تھی یا مسلمان؟ حضور شاید وہ ہندو تھی۔ گلاب سنگھ گھوڑے سے اتر آئے ساتھ کھڑے مصائب کو نزدیک بلا کر انگلی سے قیدی کے جسم پر اوپر سے نیچے اور پھر دائیں سے بائیں ایک کراں کا اشارہ کرتے جسم دیا کہ آرا منگوا کر اس طرح سے اس کے جسم کے چار ٹکڑے کئے جائیں۔ ایک ٹکڑا شمال کی طرف روانہ کیا جائے۔ ایک جنوب کی طرف۔ ایک مشرق کی طرف اور ایک مغرب کی طرف تاکہ میری رعایا کو پتہ چل جائے کہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی ہندو لڑکی کا قتل اس طرح کھاف نہیں کیا کرتا۔

انیسویں صدی کے وسط میں روس بڑی تیزی سے وسط ایشیا میں بڑھا۔ ایک کے بعد دوسری تمام بڑی ریاستیں فتح ہوتی چلی گئیں لہذا ہندی انگریز حکومت کو خطرہ پیدا ہوا کہ گلگت بلتستان اور کشمیر وغیرہ کا علاقہ بھی روسی ہوس کا نشانہ نہ بن جائے اس لئے روس کو روکنا ضروری ہوگا۔ اطلاعات یہ تھیں کہ میر آف ہنزہ روڈیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا اور کچھ روسی افسران میر صاحب کی دعوت پر خفیہ طور پر ہنزہ اور اردگرد علاقوں کا دورہ بھی کر چکے تھے۔ انگریز حکومت نے روسی اثر اور روسی افواج کے اس تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی غرض سے گلگت میں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ انی علاقہ جات پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ علاقے کشمیر کے زیر اثر تھے لیکن مہاراجہ کشمیر صحیح طور پر کبھی بھی اپنی حکمرانی یہاں قائم نہ کر سکا۔ ہر وقت انہیں نہیں شورش و دروہی

READING  
Section



تھے۔ شروع میں یہ سولگ تھے جن میں سے تیس نے قریب پچیس اور بیسہ سے مر گئے۔ اب صرف سترہ گئے تھے جن کے کپڑے پھنے ہوئے تھے۔ بھوک اور بیماری سے بری حالت تھی۔ ایک مزدور نے پیٹھ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس کی پیٹھ پر بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ایک بڑا گہرا زخم تھا لیکن ڈوگرہ سپاہیوں کو پھر بھی رحم نہ آیا۔ وہ بوجھ اٹھانے پر مجبور تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ بالکل غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ رو رہے اور ہاتھ جوڑ کر آزادی کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن کرنل ڈیورنڈ انہیں سے لکھتا ہے کہ وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

یہ دو مثالیں تو وہ ہیں جو اسے پہلے ہی سفر میں پیش آئیں۔ ویسے یہ تو وہاں روزمرہ کا معمول تھا۔ مسلمان جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ اسی لئے وہ انگریزوں سے کسی حد تک رحم اور انصاف کے طلبکار تھے اور یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک بھی ممکن ہو سکا انگریزوں نے ان لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کیا اور اپنے نظام حکومت کی بنیاد انصاف اور انسان دوستی پر رکھی۔ لوگوں کو ڈوگرہوں کے ظلم و ستم سے نجات ملی۔

کہنا جاتا ہے کہ ہندو خدمت گزار نوکر تو ثابت ہو سکتے ہیں لیکن بہت خالما اور خطرناک حکمران ہے۔ تاریخ نے ہندوؤں کو جب بھی حکمرانی کا موقع دیا تو مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ شاید یہی وہ حالات تھے کہ مسلمان عظیمہ دشمن کے لئے مجبور ہوئے اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں تک پہنچے۔ لہذا اس مقدس وطن کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

یاد رکھیں اجتماعی غلطیاں تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔

خون دلی دے کہ نکھاریں گے زرخ برگ کا ب  
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے



مہاراجہ سے شکایت کرے گا۔ لیکن پھر بھی اسے یقین نہ تھا کہ یہ قلم مزدوروں کے پاس رہنے دیں گے یا نہیں کیونکہ مسلمان مزدوروں کو مزدوری دینے کا ڈوگرہ حکومت نے لئے رواج ہی نہ تھا۔ جبری مشقت بغیر کسی اجرت کے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں سے عیاشی بھی اپنا فرض۔ انہیں کھیتوں میں کام کرتی یا جانور چراتی کسی بھی مسلمان عورت کو پکڑنے کے لئے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ اکثر جوان عورتیں ڈوگرہ سپاہیوں کو دیکھ کر چھپ جاتی تھیں۔ بعض اوقات ڈوگرہ سپاہی نو جوان لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر اسپتھکمپ میں لے جاتے تھے۔ اس مثال سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کا کرنل ڈیورنڈ نے خصوصی ذکر کیا ہے وہ اسے پنجہ میل ملکیت سے پہلے پیش آیا۔ وہ گھوڑے پر جا رہا تھا کہ اچانک 70 مزدور روتے ہوئے اور ہائیاں دیتے ہوئے گھوڑے کے سامنے لیٹ گئے۔ جب انھا کر ایسا کرنے کا مقصد پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ یہ مسلمان مزدور ہیں جنہیں چند ماہ پہلے بلتستان سے ڈوگرہ سپاہیوں نے جبری مشقت کے لئے زبردستی پکڑا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ ملکیت میں مقیم ڈوگرہ فوج کے لئے بار برداری کا کام کریں۔ چونکہ اس وقت سڑکیں نہ تھیں اور نہ ہی مال برداری کا کوئی دوسرا ذریعہ لہذا سہری مگر سے ڈوگرہ سپاہیوں کے لئے جتنا راشن اور ایسومینشن وغیرہ بھیجا جاتا تھا یہ لوگ استور سے اپنی پیٹھ پر لا کر ملکیت لاتے تھے جو کہ 80 میل کا فاصلہ ہے اور سب پہاڑی چڑھائیاں اور دریا کے ساتھ ساتھ سخت دشوار گزار راستہ۔ انہیں کھانے کے لئے ایک وقت گھٹے مڑے اناج کی روٹی ملتی تھی اور پینے کے لئے دریائے سندھ کا گدلا پانی۔ لہذا یہ لوگ ہر وقت بخار، پچیس اور بیسہ کا شکار رہتے تھے لیکن ڈوگرہ سپاہی ان کی پیٹھ پر بوجھ لا کر ڈنڈوں سے ہانک کر لاتے

READING  
Section



اس طرح مال حرام اور خلق خدا کی بددعاؤں نے حاجی  
خادم حسین کے خاندان کو عبرت کی ایک دردناک مثال بنادیا۔



## عبرت کا مقام

مکافاتِ عمل

0323-4546115

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ایک نذیر مائی کی چھین بلند ہوئیں۔ وہ بے طرح  
سے تڑپ رہا تھا اور مدد کے لئے شور مچا رہا تھا۔ سراج نے  
اس کی انگلیاں دانتوں میں مضبوطی سے دبالی تھیں اور کسی  
طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

پہلے تو لوگ اسے مذاق سمجھے اور قہقہے لگانے لگے  
لیکن جب کئی منٹ گزر گئے اور سراج مائی کا ہاتھ چھوڑنے  
پر آمادہ نہ ہوا تو لوگوں نے آگے بڑھ کر زبردستی بے  
چارے نذیر کا ہاتھ آزاد کرایا اور ایک شخص نے سراج کے  
سر پر دو تین دھولیں بھائی تھیں، تب اس نے منہ کھولا تھا  
اور نذیر کی انگلیاں آزاد ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے مہر  
سراج پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

دوسرے واقعے کا بڑا کردار بھی نذیر مائی ہی تھا۔  
ہمارے علاقے میں تین گاؤں بالکل قریب قریب ہیں،  
تقریباً ایک ایک فرلانگ کے فاصلے پر۔ نذیر کا گاؤں  
آخری اور تیسرا تھا۔ وہ ایک روز شام سے پہلے اپنے کام

### اذیت پسند

مہر سراج میرا دور کا رشتے دار تھا۔ بڑا عجیب و  
غریب آدمی تھا۔ چنانچہ آن پڑھ تھا لیکن منفی ذہانت کا خاصا  
بڑا حصہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ اذیت پسندی  
اسے محبوب تھی اور دوسرے کو دکھ دے کر، تکلیف میں مبتلا  
کر کے گویا اسے راحت ملتی تھی۔ میں نے یہ منظر چشم سر  
دیکھا کہ نذیر مائی اس کی داڑھی مونڈھنے کی تیاری کر رہا  
تھا اور جیسا کہ اس زمانے میں دیہات کا کلچر تھا، مائی  
کسانوں کی شیو بنانے میں مسابن یا کریم کا استعمال نہیں  
کرتے تھے بلکہ خالی پانی سے چہرے کے بالوں کو گھیلا اور  
نرم کر کے استرے سے شیو بنا دیتے تھے..... چنانچہ نذیر  
مائی روایت اور عادت کے مطابق بار بار پانی کی پیالی  
میں انگلیاں ڈبواتا اور مہر سراج کے چہرے کا مساج کرنے  
لگتا۔

READING  
Section







خوشامد اندھیرا بھرتی ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ والد صاحب کا ہمدردی سے  
انداز بھی نہ اس لئے ان سے درخواست کی آپ دیکھ  
رہے ہیں کہ دنیا میں کوئی میرا ہمدرد نہیں۔ رشتہ دار  
وہ سب سب دور ہو گئے ہیں۔ کوئی مجھے ملنا پسند نہیں کرتا۔  
اب وقت آپ کے سوا کوئی میرا خیر خواہ نہیں۔ آپ  
میرا ہائیڈروجن اور کھلے پیر کی شادی کراویں تاکہ میرے  
گھر کا بار بار کھل جائے، مجھے کئی پکائی روٹی مل جاوے  
تو میں ہوں۔

سہیل نے اس لئے عرض کیا میرے والد بڑے ہی  
نرم و مہذب انسان ہیں، پھر صوم و صلہ کے پابند اور فطرتی حد تک  
سچے ہیں۔ انہوں نے وہ پریشان حالی لوگوں کی مشکلات دور  
کرنے میں کئی دفعہ اٹھانے دیکھے، چنانچہ انہوں نے اس  
سراج سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا گھر آباد کرنے کی پوری  
کوشش کریں گے۔

حالات کا ستم اور فطرت کا انتقام دیکھتے کہتا ہوں  
عمر سہیلے والد صاحب کے چچا زاد بھائی کی ایک گونگی  
بہن بی بی کو طلاق ہو گئی تھی اور وہ لوگ اپنی اس معذور بیٹی  
کے لئے پریشان تھے۔ والد صاحب نے سراج سے بات  
کی اور صاف بتا دیا کہ بیٹی گونگی ہے، بہری ہے، خوبصورت  
بھی نہیں اور طلاق یافتہ ہے۔ انہی طرح سوچ کر بعد  
میں اعتراض نہ کرتا۔ منصف ہے تو شادی کرا دیتا ہوں۔  
میرے اندھیرا بات یہ ہے کہ سراج نے یہ رشتہ محفوظ کر لیا تھا  
نیا اور رشید اس بی بی سے اس کی شادی ہو گئی۔

سراج اور رشید اس کی جوڑی کم از کم پانچ سال  
تک قائم رہی۔ پہلے پچیس سال رشید اس تنہا رہے۔ پھر  
اور سراج کا پھوپھا جلتا رہا لیکن پھر رشید اس پر ایک بون  
یکا ایک فالج سے حملہ کر دیا اور وہ تقریباً پندرہ سال تک  
چار پائی پر مقید رہی۔ اگر پندرہ رشید اس نے ایک بیٹے کو جنم  
دیا تھا لیکن اس کی دیکھ بھال زیادہ سراج ہی کو کرنی پڑی  
گی۔ وہ یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے اس کے حضرات کا ج

طاہر ہو گا۔ اس کے قصے اور کہے وعدہ ہیں۔ کوئی طاہر ہو جائی  
گا۔

انہوں نے سراج کے حالات سے بہت کم عہدہ  
حاصل کیا، اس کی ایذا پسندی کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا  
لیکن جب رشید اس بی بی مشکوک ہو کر صاحب فرماں ہو کر  
تو وہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور اس کو اکثر روکے ہوئے رکھا  
تھا۔

اسی عالم میں ایک اور سراج کے چچا نے ایک  
پست گئی اور وہ بکا تیک رہا تھا کہ رشید اس بی بی پر  
بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔  
بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔  
بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔ بہت برا تھا۔

### اس کے ظلم پر گھر پرانے کی تھی

حقیقی ظلم سب سے گہرا اور سب سے زیادہ  
مہر و فکرت اور دیکھ بھال کا تھا۔ وہ اپنے والدین سے  
بھائی اور بہن کے لئے اور اس کی فرائض کے لئے  
تو اس نے بہت کچھ کیا اور سب کچھ کیا۔ سب کچھ کیا۔  
انہوں نے اس کے لئے کیا کیا اور کیا کیا۔ کیا کیا۔  
آپ کا والد اس کے لئے کیا کیا اور کیا کیا۔ کیا کیا۔

حقیقی ظلم سب سے گہرا اور سب سے زیادہ  
مہر و فکرت اور دیکھ بھال کا تھا۔ وہ اپنے والدین سے  
بھائی اور بہن کے لئے اور اس کی فرائض کے لئے  
تو اس نے بہت کچھ کیا اور سب کچھ کیا۔ سب کچھ کیا۔  
انہوں نے اس کے لئے کیا کیا اور کیا کیا۔ کیا کیا۔  
آپ کا والد اس کے لئے کیا کیا اور کیا کیا۔ کیا کیا۔

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

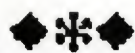
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



ایک غریب آدمی کو اس نے دن دیہاڑے بے رحمی سے قتل کر دیا لیکن چونکہ کسی نے حاجی کے خلاف کوئی دینے کی جرأت نہ کی تھی، اس لئے وہ چھ ماہ بعد ہی رہا ہو کر گھر آ گیا اور اس کی چہرہ دستیاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں لیکن جیسا کہ اللہ کا دستور ہے، آخر کار وہ مکافات عمل کی گرفت میں آ گیا۔ اس کے چھ بیٹے تھے، ایک ٹریفک کے حادثے میں مر گیا۔ اور چونکہ اس خاندان میں شراب اور بدکاری کا عمل دخل عام ہو گیا تھا، اس لئے حاجی کے بیٹوں میں مختلف حوالوں سے شدید اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں ایک بھائی نے ایک ہی بے میں اپنے تین بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قاتل گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ اس طرح اس کی نظروں کے عین سامنے چھ میں سے پانچ بیٹے دروٹا کٹ حشر سے دوچار ہوئے اور اس کا سارا غرور بڑی طرح خاک میں مل گیا۔

مخالفوں نے جب دیکھا کہ حاجی حالات کی شدید گرفت میں ہے، تو وہ شیر ہو گئے اور ایک دن انہوں نے اس پر سامنے سے فائر کھول دیا گولی اس کے سر کی کھال کو کاٹی ہوئی نکل گئی، وہ مہلک وار سے بچ گیا، مگر بیٹوں کی ہلاکت کے بعد وہ اس خیمے سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اسے فارج ہو گیا۔ پہلے جلنے سے معذور ہو کر بستر پر پر گیا اور کئی سال تک شدید اذیت میں مبتلا رہا۔ اسی حالت میں اس کا دینی توازن بگڑ گیا اور وہ انتہائی بے چارگی اور ذلت کی موت مر گیا۔ موت سے پہلے مقدمات اور ظلم و ستم کی نحوست نے اس کی ساری جائیداد ختم کر دی۔ بیس بک گئیں، اڈے ختم ہو گئے اور اس کا خاندان تلاش اور کنال ہو گیا۔

اس طرح مال حرام اور خلق خدا کی بددعاؤں نے حاجی خادم حسین کے خاندان کو عبرت کی ایک دروٹا کٹ مثال بنا دیا۔ (مصنف کی کتاب "مکافات عمل" سے ماخوذ)



حاجی خادم حسین بہت ذہین اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے علاقے میں گوجر برادری کو منظم کیا، خود ان کا سربراہ بن گیا اور مطالبہ کیا کہ مجھے گوجروں کے سب گھرانے ایک ایک بچھیا فراہم کریں۔ اس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے گائیوں کے بہت بڑے ریوڑ کا مالک بن گیا۔ یہ ریوڑ بھی اپنے مالک کی طرح منہ زور تھا، اور لوگوں کے کھیتوں میں تباہی پھیلتا رہتا۔ اگر کوئی غریب اعتراض کرتا تو حاجی اور اس کے بیٹے اور ملازم اس کی خوب پٹائی کرتے اور وہ خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ٹریکٹر ٹرائی کے بعد حاجی نے ٹرکوں کی بار برداری کا کاروبار شروع کیا اور اس میں بھی دھونس اور غنڈہ گردی کے بل پر علاقے میں ٹرکوں کے کاروبار پر چھا گیا اور سب متعلقہ ٹرک مالکان دبا کر الگ ہو گئے۔

حاجی موصوف مزید آگے بڑھا اور اس نے بسوں کا پورا ایک بیڑہ تیار کر لیا۔ یہ بسیں پسرور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کی طرف چلتی تھیں اور ان کے سامنے باقی سارے بس مالکان سب سے سڑے رہتے تھے اور پولیس ان کے سامنے بھگی بلی بنی رہتی تھی۔

اس زمانے میں حاجی خادم حسین علاقے کا سب سے طاقتور آدمی تھا۔ وہ ایک مضبوط قبضہ گروپ کا سرغنڈ بن گیا تھا۔ کمزور لوگوں کی جائیدادیں ناجائز شکنڈوں سے ہتھیانا اس کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ اس طرح اس نے کروڑوں کی جائیداد بنالی اور قبضے کی میوہل کمپنی کا پہلے کنسلر اور پھر وائس چیئرمین بن گیا۔ اب وہ اس قدر منہ زور ہو گیا کہ مخالفوں کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کرتا، چونکہ پولیس سے اس کے مراسم خاصے مضبوط تھے، اس لئے وہ بڑے سے بڑا جرم بھی کرتا تو پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ چنانچہ وہ جس، ہیروئن، جوئے اور شراب کا کاروبار بھی اعلانیہ کرنے لگا اور کوئی اسے روکنے تو کئے والا نہیں تھا۔



READING  
Section



تفیس

امیر انٹلی سٹریٹجی سوسائٹی انسٹیٹیوٹ کی کہانی

## صحرائی جاسوس اور صحرائی طوفان (2)

موساد کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا آغاز ہو گیا

☆ 16: قسط: 0300-4154083 ..... میاں محمد ابراہیم طاہر



READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



عراق میں کھپائی پڑے ہیں تو اس سے عربوں سے ہمدردی رہتی ہے۔ اس لیے مغربی ممالک میں یہ پیغام جانا تھا کہ اس ہمارے اسرائیل ایک دفعہ پھر امریکہ اور برطانیہ کو عراق پر نیا حملہ کرنے پر اکسارہا تھا۔

صدام کے اسلحہ خانے کے بارے میں پبلک نو آگاہ کرنے کا سوال اس لئے بھی اہم تھا کہ اس سے ان خفیہ مذاکرات پر اثر پڑ سکتا تھا جو ذل ایسٹ میں امن قائم کرنے کے بارے میں پی ایل او اور اسرائیل کے مابین چل رہے تھے۔ 1992ء تک یہ مذاکرات مارے بے سہل ہو رہے تھے اور احسن طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے میں تقریباً ایک سال لگا، جب اکتوبر 1993ء میں یاسر عرفات نے اسرائیل وزیراعظم یزہاک رابن سے وائٹ ہاؤس کے ان تین صدور امریکی کلنٹن کی مسکراہٹوں کے سامنے میں ہاتھ ملائے۔ دونوں رہنماؤں کے خیال میں یہ ایک شاندار سیاسی کامیابی تھی۔

تاہم موساد میں ہر شخص کو یہ امید نہ تھی کہ طے کردہ فارمولا امن کے لئے زمین یعنی فلسطینیوں کے وطن اور اسرائیلیوں کے لئے امن، کامیابی سے ہمکنار ہو سکے گا اور مزید ترقی پائی نہیں ہوگی۔ اسلامی بنیاد پرستی تیزی سے پھیل رہی تھی اور اسرائیل کے ہمسائے اردن، مصر اور شام، ایرانی احتجاج پسند قوتوں کے پھیلاؤ کی زد میں تھے۔ پھر ان ممالک کے نزدیک اسرائیل ایک ناجائز مملکت تھی۔ موساد کے اندر اور بہت سی اسرائیلی پبلک کے اندر بھی یہ خیال پایا جاتا تھا کہ پی ایل او کے ساتھ دیرپا امن کا فارمولا، کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں اور یہ ایک غیر حقیقی خواب تھا۔ یہودی اسرائیل کو عربوں کے ساتھ مفاہمت سے رہنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ عربوں کے مذہب اور کلچر کو وہ اپنے مقابلے میں گھٹیا اور تاریخی طور پر کم تر سمجھتے تھے۔ وہ اسلحہ معاہدے کو اپنی ارض موجود کی

موساد میں کھپائی پڑے ہیں تو اس سے عربوں سے ہمدردی رہتی ہے۔ اس لیے مغربی ممالک میں یہ پیغام جانا تھا کہ اس ہمارے اسرائیل ایک دفعہ پھر امریکہ اور برطانیہ کو عراق پر نیا حملہ کرنے پر اکسارہا تھا۔

اب شہزادی، دوسری انٹرنی جنس ایجنسیوں کے سربراہوں اور سیاستدانوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس خفیہ اطلاع کو منکشف کیا جائے یا نہیں۔ اس اطلاع تو عام کے سامنے اسرائیلی پبلک میں خوف و ہراس اور سراسیمگی کا پیدائشی اثر پڑی ہو گا اور اس کے بڑے بھائی تک قتل اثرات برپا ہو سکتے تھے۔ ملک کی سیاحت انڈسٹری کو گھٹاؤ پڑے گا۔ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اسرائیلی اکاؤنٹی تباہی کے بارے میں پوری اور ملک میں ہی اتنا خوف بہت سنسٹ تھا کہ اس وجہ کا انکشاف کرنا کہ اسرائیل اب بھی مہلک اور بلاتلخت خیز ہتھیاروں کی زد میں تھا، کے بعد نہ تو سیاحت ملک میں آئیں گے اور نہ پیر۔

گھٹاؤ وار کے حاتمے اور اتحادیوں کے الگ ہو جانے کے بعد روجب مہالک ہو بخوری کے تحت جنگ میں شامل ہونے لگے لیکن جنگ کے دوران بھی ان کا رویہ سرد مہری کا ہی رہا تھا۔ کیونکہ ان کو پسند نہیں تھا کہ ان کے ایک عرب ہمسائے کے خلاف جنگ چھیڑی جائے۔ عربوں کے لئے ان کی ہمدردی میں اضافہ ہوا ہاتھ اتحادیوں کی اندھا دھند بمباری نے عراق جو بے تحاشہ تباہی چھائی تھی اور معصوم اور بے گناہ شہریوں کے مصائب میں جو اضافہ ہوا تھا، اس سے پورے ذل ایسٹ کے عوام کے دلوں میں اسرائیل کے خلاف دشمنی اور نفرت کے جذبات اپنی انتہا تک پہنچا دیے تھے۔ ایسے حالات میں اسرائیل اگر یہ انکشاف کرنا کہ عراق کے پاس جنگ کے بعد میں بھی ہلاکت خیز کیمیکل اور بیولا جیکل ہتھیار بڑی

READING  
Section



کارڈی نہیں سمجھتے تھے نہ ہی وہ اس بات کے قائل تھے کہ دونوں آرمی اکٹھی رہ سکیں، خوشی اور ایک دوسرے کی عزت و وقار کے ساتھ۔

میدانی شہادت نے عراقی ہتھیاروں کے بارے میں کوئی انکشاف کرنے سے قبل ان سب پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو خطیر بن رہے دیا جائے تاکہ واشنگٹن معاہدے سے اسرائیل کے باہر امن دہانوں کے بارے میں جو فضا بن رہی تھی، وہ متاثر نہ ہو۔ اگر معاہدے کے مطابق امن دہانوں کی صورت حال میں بہتری نہ آتی تو عراق کے زیرِ پریشانی ہتھیاروں کے بارے میں کسی وقت بھی عام پبلک کی آگاہی کے لئے انکشاف کیا جاسکتا تھا۔ ٹکدوں اور ظالم صدام کا کوئی ایجنٹ بدیا ایک سب سے شیش پر اٹھ کر ایس کا کنٹرول کھینک تھا، یا کوئی دہشت گرد کسی بونگ 747 جہاز کے انٹرکام سسٹم میں ایرویز اور داخل کر سکتا تھا تاکہ جہاز کا ہر سافٹوئیر ہتھیاروں کا نامبریم بن کر ہزاروں لوگوں کو متاثر کر سکیے۔ قبل اس کے سچائی سامنے آنے، موساد نے لئے یہ تمام افکات اس کے اندرانی جنگ سے ماہرین کے لئے پہلا پیمندہ کے لئے اور پر عراق کے خلاف مخالفانہ فضا پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔

دو دوسرے واقعات جنہیں موساد نے چھپا کر رکھا تھا، امریکائیوں کے لئے بڑی براہ راستی کا باعث بن سکتے تھے۔

دسمبر 1986ء کی ایک سہ پہر کو پان امریکن ایرویز کی فلائٹ نمبر 103 لندن سے نیویارک جاتے ہوئے سکاٹ لینڈ میں لاگہلی (Lockerbie) کے اوپر دھماکے سے پھٹ گئی تھی۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر لیپ کے کارندے اپنے رابطہ کار اور اسرائیلی کے ہمدرد صحافیوں کو فون کر رہے تھے کہ وہ یہ خبر شائع کریں کہ نیکو قابلِ تردید ثبوت موجود ہیں کہ جہاز کی اس جہاں میں

لیپ کا ماتھ تھا کیونکہ ہارنی اٹلی میں اس کی اطلاع سے مطابق جمہوریہ اس جرم کی سزا کا مستحق تھا۔ اس وقت کتاب ہذا کو بھی لیپ کی طرف سے اسی نوعیت کی دہائی کا کال اس انٹارکٹ حادثے کے چند گھنٹے سوسولی ہوئی تھی۔ فوراً ہی مغربی ممالک نے غذائی حکومت کے خلاف پابندیوں عائد کر دیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے لیپ کی پابندیوں پر قرار عائد کر دی اور انہیں پان امریکن جہاز کی جہاں کا اسمہ دار قرار دے دیا۔ غذائی نے دونوں افراد کو مقدمہ چلائے جانے کے لئے امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

لیپ نے بعد ازاں شام اور ایران کو لا کر لی جانے میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ دمشق حکومت کے خلاف اس الزام کے سوا لیپ کوئی الزام سامنے نہ لاسکی بلکہ وہ ہمیشہ دہشت گردی کی پشت پناہ تھی۔ ایران پر خصوصی طور پر یہ الزام لگایا گیا کہ پان ایم 103 کو ایران کے انقلاب اس ایرانی جہاز کے بدلے میں تباہ کیا جسے امریکن بحری جہاز USS Vincennes نے 3 جولائی 1988ء کو مار گرایا تھا جس میں 290 مسافر جان بحق ہو گئے تھے۔ یہ مسافر برطانوی و خلیج فارس میں گرا تھا۔ یہ امریکہ کی ایک فائنٹ غلطی تھی جس پر اسے سچائی آگئی پڑی تھی۔

پھر لیپ نے اس حادثے میں فلسطینی مفاد آزادی کو ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اسرائیل کے ہمدرد صحافیوں نے جو لیپ کی پھیلائی ہوئی کہانیوں کو وسیع پیمانے پر چھاپ رہے تھے۔ بھی یہ سوچنے کی رحمت نہیں کی کہ صرف لیپ کو ہی کو کیوں جہاز کی جہاں کا ذمہ ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر اس نے شام اور ایران سے مدد لینے کی بجائے ایک غیر معروف فلسطینی گروپ کو کیوں منتخب کیا؟

ایک برطانوی اٹلی جس ذریعہ کے مطابق لاگہلی سامنے میں لیپ کا اپنا ایک کردار تھا۔ دنیا کو یاد دہانی

READING  
Section



دسمبر 1988ء کی اس ذات کو لندن سے روانگی کے وقت جہاز پر امریکن انٹیلی جنس ایجنسی کے آٹھ ارکان بھی سوار تھے جو مشرق وسطیٰ میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ ان میں چار سی آئی اے کے فیلڈ افسر تھے جن کی قیادت میٹھیو گنن (Mathew Gannon) کے ہاتھ میں تھی۔ جہاز کے مسافروں میں امریکن فوج کے میجر چارلس میکسی اور اس انخوائے کنگڈان کے خلاف کارروائی کرنے والی مختصر ماہرین کی ٹیم کے ممبران شامل تھے۔ وہ ٹڈل ایسٹ میں اس لئے مقیم تھے کہ بیروت میں ابھی تک ریغمال بنائے گئے مغربی شہریوں کی رہائی کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔ اگرچہ لا کر بی حادثے کی تحقیقات کی ذمہ داری سکاٹ لینڈ کی تھی کیونکہ سانحہ اس کی حدود میں رونما ہوا تھا لیکن سی آئی اے کے ایجنٹ بھی وہاں موجود رہتے تھے۔ اس دوران حیرت انگیز طور پر میکسی کا سوٹ کیس بالکل صحیح سالم حالت میں مل گیا۔ یہ سوٹ کیس مختصر وقت کے لئے وہاں سے غائب کر دیا گیا۔ یقینی طور پر یہ ایک سی آئی اے افسر کا کام تھا لیکن اس کی شناخت کبھی بھی سامنے نہیں آ سکی۔ بعد ازاں یہ سوٹ کیس سکاٹ کی تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا گیا۔ جنہوں نے اپنی رپورٹ میں اسے بالکل خالی لکھا۔

کسی نے بھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ میکسی کا ساز و سامان کدھر گیا، یادہ خالی سوٹ کیس کے ساتھ کیوں سفر کر رہا تھا لیکن اس وقت کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ شاید سی آئی اے افسر نے سوٹ کیس سے وہ ڈاکا نکال لیا ہو گا جس سے یہ پتہ چل سکتا کہ بین ایم 103 کو کیوں تباہ کیا گیا۔ مگرین کے سامان کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا جس سے اس شبہ کو تقویت ملی کہ دراصل بم اس کے سوٹ کیس میں موجود تھا۔ کبھی اس بات کی وضاحت سامنے نہیں آئی کہ کیسے اور کیوں ایک سی آئی اے افسر سوٹ کیس میں بم

کرانے کا ایک اچھا موقع تھا کہ لیبیا دہشت گردوں کا نیٹ ورک موجود تھا جس کی خود لیب سرپرستی کر رہی تھی۔ لا کر بی کے لئے اتنے زوردار پروپیگنڈے کی ضرورت نہ تھی۔ بہت سے ناموں کو اس میں ملوث قرار دینے کا نتیجہ مثبت نہ تھا۔ ہمیں پتہ تھا کہ صرف لیبیا اس کا ذمہ دار تھا۔ پان ایم 103 حادثہ ایسا نہ تھا جسے آسانی سے بھلا دیا جاتا۔

جہاز کی تباہی کا واقعہ ایسے وقت میں پیش آیا تھا جبکہ جارج بش امریکہ کا صدر منتخب ہو چکا تھا اور اس کی ٹیم ٹڈل ایسٹ کے معاملات پر غور و فکر کر رہی اور حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ لہذا بش اول آفس میں داخل ہوتے ہی اس معاملے پر سرگرم عمل ہو سکتا تھا۔

بش، امریکن انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کا 1976-77ء میں ڈائریکٹر رہ چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کسنجر نے امریکی پالیسی کو اسرائیل کے حق میں تبدیل کر دیا تھا۔ اگرچہ بش نے صدر ریگن کی اسرائیل سے ہمدردانہ پالیسی کو برقرار رکھا لیکن اپنے سی آئی اے کے دور میں وہ جان چکا تھا کہ ریگن کی پالیسی اسرائیل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ نرمی پر مشتمل تھی۔ بش اپنے صدر کا عہدہ سنبھالنے کے انتظار میں تھا اور اسے اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہ تھی کہ کس طرح 1986ء میں اردن کو اسلحے کی فروخت کا معاہدہ جس کی مالیت 109 بلین ڈالر تھی۔ واشنگٹن کی یہودی لابی اور کانگریس کے یہودی ارکان کے دباؤ پر منسوخ کرنا پڑا تھا۔ بش نے اپنی آئندہ بننے والی حکومتی ٹیم کو بتا دیا تھا کہ وہ یہ بات برداشت نہیں کرے گا کہ کسی لابی کے دباؤ پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ خدا ترس امریکن کس سے تجارت کریں اور کس سے نہ کریں۔ یہی رویہ پان ایم 103 فلائٹ کی تباہی کا باعث بنا تھا۔

READING  
Section



پاس ایسے ذرائع ہیں جن کی مدد سے وہ اصلیت سامنے لے آئے گا۔

جب ایب کی رپورٹ انشورنس کمپنی کے سامنے آئی تو اس کے کارپرداز سرپیٹ کر رہ گئے۔ ایب نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ”جہاز کو تباہ کرنے کی پلاننگ سی آئی اے کے ایک بد معاش گروپ نے کی تھی، جو جرمنی میں تعینات تھا اور جو ڈل ایسٹ سے فرینکفرٹ کے راستے منشیات کی امریکہ کو سٹنگ کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ سی آئی اے اس کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ سنگھ بھی ریغالیوں کے بدلے اسلحہ کے مذاکرات میں ایران کو اسلحہ پہنچانے میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ منشیات کی سٹنگ کا طریق کار بڑا سادہ تھا۔ آنے والی فلائٹ کے سامان میں سے ایک شخص ملتا جلتا سوٹ کیس نکالتا تھا اور اگلی فلائٹ میں سامان چڑھانے پر مامور شخص منشیات سے بھرا دیا ملتا جلتا سوٹ کیس سامان میں رکھ دیتا تھا۔ آخری رات کو ایک شامی دہشت گرد نے جسے یہ معلوم تھا کہ منشیات کی سٹنگ کا معمول کیا ہے، منشیات کی جگہ وہ سوٹ کیس سامان میں رکھ دیا جس میں بم موجود تھا۔ اس کا مقصد ان سی آئی اے کے اہلکاروں کو قتل کرنا تھا جن کے بارے میں شام کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسی فلائٹ میں سوار ہوں گے۔“

ایب کا دعویٰ تھا کہ میکی کیسی کو سی آئی اے کی اس بد معاش ٹیم کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا جو کوڈ نام کوریا (Corea) کے نام سے کام کرتی تھی اور اس کے ممبروں کے کچھ ایسی بڑے اسرار شخصیات سے بھی رابطے تھے جنہیں معلوم تھا کہ میکی کے بھی دنیائے جاسوسی سے رابطے تھے۔ منظر القصار، یورپ میں اسلحہ کے بیوپاری کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ کرنل اولیور نارتھ (Colonel Oliver North) کو بھی ہتھیار سپلائی کرتا رہا تھا جو وہ آگے نکاراگوا کے کونتراز کو 1985-86ء میں پہنچایا کرتا

کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ تحقیقاتی ٹی وی چینل پی بی ایس نے بعد ازاں اپنے پروگرام فرنٹ لائن میں دعویٰ کیا کہ اس نے اس سانحہ کا معرکہ حل کر لیا ہے۔ بین الاقوامی فلائٹ 103 نے اپنے سفر کا آغاز جرمنی کے ائرپورٹ فرینکفرٹ سے کیا تھا، جہاں سے امریکہ جانے والے مسافر جو ڈل ایسٹ سے آئے تھے، اس فلائٹ 103 پر ٹرانسفر کئے گئے تھے۔ ان میں کین اور اس کی سی آئی اے کی ٹیم شامل تھی۔ یہ لوگ ڈل ایسٹ سے ائر مائنز کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔ ان کا ساز و سامان بھی اسی طرح کا تھا۔ جیسا فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر کام کرنے والے ورکرز کے ہاتھوں سے ہر روز گزرتا تھا۔ ان ورکرز میں سے ایک دہشت گردوں کی پے لسٹ (Pay List) پر تھا۔ ائرپورٹ پر سامان سنور کرنے والی کسی جگہ اس دہشت گرد نے ایک سوٹ کیس چھپا رکھا تھا جس میں بم موجود تھا۔ اس کو ہدایات یہ تھیں کہ وہ آنے والی فلائٹ سے بم والے سوٹ کیس سے ملتا جلتا سوٹ کیس تلاش کر کے اسے بم والے سوٹ کیس سے بدل کر بین الاقوامی 103 کے سامان کے ڈنکر میں پہنچا دے۔ یہ تھیوزی سمجھ میں آنے والی تھی لیکن ان بہت سی قیاس آرائیوں اور کہانیوں میں سے ایک، جو پھیلائی جا رہی تھیں۔

ائر لائن کی انشورنس کمپنی نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ جہاز دہشت گردی سے تباہ ہوا تھا اس لئے وہ کلیم کی ادائیگی کی ذمہ دار نہ تھی، نے ایک پرائیویٹ تفتیشی فرم انٹرفور (Interfor) کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ کمپنی ایک اسرائیلی یووال ایب نامی شخص نے 1979ء میں اپنی امریکہ ہجرت کے ایک سال بعد قائم کی تھی۔ ایب کا دعویٰ تھا کہ وہ موساد کا سابقہ ذیک آفیسر تھا۔ اس دعوے کو موساد نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ تاہم ایب نے انشورنس کمپنی کو یقین دلایا کہ اس کے

READING  
Section



لانے سے روک دیا۔

تو فرسٹ انٹ کا پتہ نہ مل سکا۔ ایب اور نہ جوئیکل سینٹر میں ٹیلیفون کے ذریعہ ایب کے جواب دینے میں تسلی بخش طور پر کامیاب ہوئے۔ کوریہ کی سرگرمیوں کی پردہ پوشی مقصود تھی تو یہ سرگرمیاں کی آئی اسے کی اعلیٰ سطح تک جانی تھیں؟ کس نے اس کا اہتمام دیا تھا؟ کیا اسی شخص یا اشخاص نے مسکی کے سوٹ کیس سے ڈاکا غائب کرنے کا حکم دیا تھا؟ برمنی کی خفیہ ایجنسی بی کے اسے نے کوریہ یونٹ کو ہی اطلاع دینا ضروری کیوں سمجھا؟ کیا یہ صرف حادثاتی طور پر ہوا تھا؟ یا اس کا محرک وہ فیصلہ تھا جس میں کوریہ کی سرگرمیوں کو ہی آئی اسے نے ہائی افراد کے لئے ناقابل قبول اور خطرناک قرار دیا گیا تھا؟ غیر قومی سلامتی کی حدود و قیود کیا تھیں جن کے انکشاف سے بین الاقوامی کے اندر کو تصاف جواب دے دیا گیا تھا۔

پہلے عالم کی سال تک مختلف خفیہ ایجنسیوں کے اندر براہ کھانا اور زیر بحث آتا رہا لیکن ہمیشہ پردہ راز میں ہی رہے اور چھائی سامنے نہ آ سکی اور نہ راز کا بھید کھل سکا۔

موساد کے ذہن سے اپنا ایک ایکٹ بین ایم 103 کے سامنے کے چند گھنٹے کے اندر شمال میں لائے بی گئیں بھیج دیا تھا؟ اب تک اس خفیہ سر میں نے اپنی معلومات کو اپنے تک چھپائے رکھا ہے اور جہاز کی جاتی ہارے کچھ نہیں بیان کیا۔ کچھ بہت ذرا ہی موجود ہیں جو اپنی زندگیوں کے خوف سے اپنا آپ ظاہر کرنا نہیں چاہتے، کا کہتا ہے کہ موساد اپنی معلومات کو اس لئے چھپائے ہوئے ہے کہ اس وقت ٹرمپ کارڈ (Trump Card) کے طور پر استعمال کر سکے جب امریکہ اس پر دباؤ ڈالے کہ موساد امریکہ کے اندر اپنی سرگرمیوں کو بند کرے۔

ایف اور ساتھ بھی امریکہ کی انٹیلی جنس کیسوں کے لئے بڑی پریشانی اور دردِ دہری کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کا

تھا۔ مقصود اسے ابوالکمال کی تنظیم سے بھی رابطہ تھے اور یہی طرح اس کے خاندان کے بھی مشکوک لوگوں سے تعلقات تھے۔ شام کی انٹیلی جنس تنظیم کا سربراہ علی عیسیٰ با اس کا سالہ تھا اور مقصود کو کوریہ میں ڈرگ سٹنگ کے آپریشن کے لئے ایک اچھا حصہ دار مل گیا تھا۔ سٹنگ کا یہ سلسلہ بین ایم 103 کی تباہی سے قبل کئی ماہ کے جاری تھا۔ رپورٹ میں مزید دعویٰ کیا گیا تھا اس ”بد معاش ٹیم“ کا پتہ مسکی کو اس وقت ملا تھا جب وہ خود انڈر ورلڈ کے کسی گروپ کی تلاش میں نڈل اینٹ میں سرگرداں تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح بیروت میں یرغمال بنائے گئے مغربی ممالک کے باشندوں کو رہا کرا سکے۔ ایب نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا: ”مسکی نے فیصلہ کیا تھا کہ بد معاش تنظیم جنس ٹیم کے خلاف مکمل ثبوت اور مقصود سے رابطے بارے معلومات کے لئے کراہی لے لے گا۔“

1994ء میں جوئیکل بیرمن (Joel Bainerman) جس نے اسرائیلی انٹیلی جنس کے شائع کی تھی اور جس کے تجزیے بعد ازاں مشہور اخبارات ”ڈال سٹریٹ جرنل“ ”کریچین سائنسی سونیٹر“ اور ”ہٹلر“ اخبار ”نیشنل ہینٹرز“ میں شائع ہو جائے، لکھا تھا: ”فلائٹ 103 کی روانگی سے 24 گھنٹے قبل موساد نے جرمنی کی خفیہ ایجنسی بی کے اسے کو اشارہ دیا تھا کہ اس فلائٹ پر بم لگایا جائے گا۔ بی کے اسے نے یہ اطلاع کوریہ کی آئی اسے ٹیم کو جو فریگٹرٹ کے باہر کام کر رہی تھی، پہنچادی۔ انہوں نے کہا وہ اس کا ہندوستان کر لیں گے۔“

بین ایم کے وکیل جارج بکھر نے ایف بی آئی، سی آئی اے، ایف اے اے، ڈی ای اے، این ایس سی، این ایس اے کو رگیدا کہ سب ایجنسیاں جو کچھ جانتی ہیں وہ حقائق سامنے لائیں لیکن بعد ازاں اس نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے قومی سلامتی کے نام پر حقائق منظر عام پر

READING  
Section



نیر کی عمر اس وقت 34 سال تھی اور انٹیلی جنس کے شعبے میں اس کا تجربہ آئی ڈی ایف میں ایک مختصر کورس تک محدود تھا حتیٰ کہ اس کے دوستوں کے خیال میں بھی اسے نئی جاب کے لئے مزید تجربے کی ضرورت تھی۔

موساد کا سربراہ ناہوم ایڈمونی پہلا شخص تھا جس نے نیر کی نئے عہدہ پر تعیناتی بارے میں مکمل کا اظہار کیا۔ اس نے انٹیلی جنس اداروں کے سربراہوں کی میٹنگوں میں نیر کی شمولیت کو روک دیا۔ مایوسی کے عالم میں نیر نے اپنے جاب کے پہلے ہفتے کے دوران وہ تمام چیزیں سیکھنے کی تیزی سے کوشش کی جن کی اس کے عہدے کے مطابق سمجھنے کی ضرورت تھی۔ ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی کے آپریشن نے جلدی اس کی توجہ حاصل کر لی، جو اب تک جاری تھی۔ اس نے پیئرز کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے اس آپریشن میں وہ کردار دے دیا جائے جو اس وقت تک ڈیوڈ کیشے ادا کرتا رہا تھا۔ اس کردار میں اس کے اپنے خیال میں وہ بہترین کارکردگی دکھا سکتا تھا۔ انتخابی انٹیک، تختی اور تجربہ کار راری بن مناشے کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اسے اولیور مارٹھ کے ساتھ بھی کام کرنا پڑا۔

جلد ہی دونوں آدمیوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ دونوں ہی دنیا بھر میں سفر اور ہتھیاروں کی سودا بازی کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے برغالیوں کے بدلے ہتھیار کے آپریشن کو انتخابی کامیاب بنانے کے لئے ایک انوکھا منصوبہ تیار کیا۔ وہ تہران آتے جاتے اور ایرانی رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتے اور برغالیوں کی رہائی بارے مذاکرات کیا کرتے تھے۔

دونوں 25 مئی 1986ء کو اپنے آپ کو ائر لنگس (Aer Lingus) کے ٹھیکے ماہرین کے روپ میں ایک اسرائیلی جہاز میں، جسے آئرش قومی ائر لائن کا رنگ کیا گیا اور ائر لنگس کا مخصوص نشان چنٹ کیا گیا تھا۔ تل ابیب سے اڑان بھر کے تہران پہنچے۔ نیر اور مارٹھ کے ساتھ

تعلیق امیرام نیر (Amiram Nir) کی سوت سے تھا۔ یہ شخص "جہاز ہائٹ" ٹائپ کی فلموں کا بڑا رسا تھا اور جس نے "ایران کیٹ" میں اسرائیل کے ڈیوڈ کیشے کی جگہ فرانسس سنہالے تھے۔

امیرام نیر بجا طور پر اسرائیلی وزیراعظم شمعن پیئرز کا اتنا دہشت گردی کا مشیر تھا۔ یہ شخص انتہائی دعا باز، فریبی، ہوشیار، مکار، استحصال پسند، ظالم، بے رحم، حقیقت اور افسانے کو ملا کر اپنی ذہنی اختراع کے جھوٹ کو بیچ اور بیچ کو جھوٹ ثابت کرنے کا ماہر تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحافی تھا۔

جہاں تک اس کی خفیہ معلومات تک رسائی اور انٹیلی جنس مہارت کا تعلق تھا وہ بطور رپورٹر اسرائیلی ٹیلیوژن اور بعد ازاں ملک کے سب سے بڑے اخبار "یادیت ابارناٹ" (Yediat Abaronot) میں کام کرتا رہا تھا۔ جس کا مالک موسز (Moses) خاندان تھا اور اسی خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اپنی مطلب براری اور مفاد کے لئے قواعد و ضوابط کی دھجیاں بکھیرتا اور قانون کی مٹی پلید کرتا اس کا معمول تھا۔ اس خاندان کا اشاعتی ادارہ اتنا بڑا تھا کہ رابرٹ میکسویل جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مالی طور پر انتہائی مضبوط اور روزانہ سے کی اشاعت کے لحاظ سے انتہائی بلند معیار کا حامل تھا۔ یہ اپنے ملازمین کو بہترین اجرت دیتا تھا۔ اس خاندان میں نیر (Nir) کی شادی نے نہ صرف اسرائیل کی ایک نہایت دولت مند خاتون کا خاوند بنا دیا بلکہ حکومتی حلقوں میں اعلیٰ سطح تک اس کی رسائی کے راستے بھی وا کر دیئے۔

لیکن سب سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز بات اس وقت سامنے آئی جب اسرائیلی وزیراعظم شمعن پیئرز نے اسے اسرائیل کی انٹیلی جنس کیونٹی کا نہایت اہم رکن بنا دیا اور 1984ء میں اسے دہشت گردی کے خلاف اپنا مشیر بنالیا۔



READING  
Section



شکار ہو رہا تھا، لہذا امیر امیر نے وزیراعظم کے مشیر کے عہدہ سے مارچ 1987ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اب اس کی شادی بھی مشکلات کا شکار تھی اور اس کے دوست بھی اس سے منہ موڑ گئے تھے۔ صرف اری بن مناشے، ماضی کے تعلقات کی وجہ سے اس سے قدرے رابطے میں رہتا تھا۔ 1988ء کے شروع میں نیر اسرائیل کو خیرباد کہہ کر مستقل رہائش کے لئے لندن چلا گیا۔

لندن میں اس نے ایک خوبصورت سیاہ بالوں والی پچیس سالہ دوشیزہ ایڈوریا نہ سٹین کے ساتھ رہنا شروع کر دیا جس کا دعویٰ تھا کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ٹیکرٹری کا کام کرتی تھی اور جس سے نیر کی ملاقات اپنے سفر کے دوران ہوئی تھی۔ بہت سے موساد کے افسروں کا خیال تھا کہ اس کا تعلق ہی آئی اے سے تھا، ایک ایسی عورت جسے انجینیئر اپنے شکار کو پھانسنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ لندن میں نیر نے میکسیکو کی کہنی کا یورپ میں پرچیزنگ نمائندہ ظاہر کیا۔ کہنی کا نام نوکال ڈی میکسیکو اور جس کا ہیڈ آفس یورٹاپان (Iruapan) شہر میں تھا۔ کہنی ایک سپورٹ مارکیٹ کے ایک تھائی جیسے کنٹرول کرتی تھی۔ یہ کوئی امپورٹ ایکسپورٹ سے متعلق معاملہ نہ تھا جو اری بن مناشے کو نومبر 1988ء کی رات کو نیر کے دروازے پر لے آیا، حالانکہ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور موسم بھی ناموافق تھا۔ وہ دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ آئندہ دنوں میں اولیور ناتھ کے خلاف ایرانی کونٹرا سکیئنڈل میں اس کے کردار کے بارے میں جو مقدمہ شروع ہونے والا تھا، اس میں اپنی گواہی میں نیر حقیقتاً کن کن چیزوں کا انکشاف کرنے والا تھا۔ نیر نے صاف صاف بتا دیا کہ اس کا بیان حلفی نہ صرف امریکن صدر ریگن کی انتظامیہ کے لئے بہت زیادہ پریشان کن، بلکہ اسرائیلی حکومت کے لئے بھی سراسیمگی اور شرمندگی کا باعث ہو گا۔ وہ یہ ثابت کرے گا کہ بعض اوقات حکومتوں

جہاز میں 97 ٹی او ڈبلیو (TOW) کا میزائل لڈے ہوئے تھے اور ہاکس میزائلوں کے پیئیر پارٹس کا ایک بکس بھی تھا۔ نیر امریکہ کے جعلی پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا اور یہ اسے ناتھ نے مہیا کیا تھا۔

ناتھ جو عیسائیوں کے فرقتے ایوٹکوں سے تعلق رکھتا تھا، نے صدر ریگن کو قائل کر لیا تھا کہ ہائیل کا ایک نسخہ اپنے دستخطوں کے ساتھ روانہ کرے تاکہ ایرانی مسلمان رہنما آیت اللہ رجسجانی کو بطور خیر سگالی پیش کیا جاسکے۔ وہ اپنے ساتھ چاکلیٹ کیک اور کولٹ (Colt) پستولوں کا ایک سیٹ بھی اپنے میزبانوں کے لئے لے کر آئے تھے۔ یہ اس دور کی یاد دلانے کے لئے تھا جب نیویارک کے مین مین کے علاقے میں گورے ریڈ انڈین سے اشیاء کے بدلے میں ان کی زمین ہتھیا لیا کرتے تھے۔

موساد کو اس مشن کے بارے میں پہلی خبر اس وقت ملی جب جہاز ایرانی فضائی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ موساد کے سربراہ ٹاموم ایڈمونی کے رد عمل کے بارے میں کہا گیا تھا۔ ”وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔“

ایرانیوں نے جہاز کو زمین پر اتار کر صرف سواروں کو باہر نکال لیا۔ اور اس مشن کو امریکہ کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے خوب استعمال کیا۔ صدر ریگن غصے سے پھنکار رہا تھا۔ کل ایب میں ایڈمونی نیر پر لعن طعن کر رہا تھا اور اسے کاڈبوائے کے لقب سے یاد کر رہا تھا۔ تاہم اس واقعے کے دس ماہ بعد تک حکومت کی نوکری کرتا رہا حتیٰ کہ اٹلی جنس کمیونٹی کے اندر اس کے خلاف مہم چل پڑی۔ انہی دنوں اس کے ڈسک کے اوپر سے ہندوئی، وائونو اور سوان کے کیس اس کی نظروں سے گزرے۔ اس نے ان کیسوں کے بارے میں جو بھی ریمارکس پاس کئے، سب موساد کی طرف سے رد کر دیئے گئے۔

اب نہ تو واشنگٹن میں کوئی اسے خوش آمدید کہنے کو تیار تھا اور نہ ہی تل ابیب میں کوئی منہ لگا رہا تھا اور تنہائی کا

READING  
Section



## فرمان قائد اعظم

پشاور کے ہوائی اڈے پر 15 پنجاب رجمنٹ کی مشین گن بٹالین کو پرچم Colour عطا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ”جن اوصاف سے کوئی رجمنٹ ایک اچھی رجمنٹ بنتی ہے ان کا معیار بہت بلند ہے۔ وہ اوصاف ہیں، ذہن، وفاداری، فرض کی لگن اور جسمانی مشقت۔ یہ تمام اوصاف صرف اس ایک وصف۔۔۔ رجمنٹ سے وفاداری۔۔۔ میں سمٹ آتے ہیں۔ الفاظ کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو اعمال کو ہے۔ آپ کی رجمنٹ نے جنگ عظیم میں جو معرکے لڑے ہیں میں ان سے بے خبر نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ملک کے دفاع اور قوم کی سلامتی کے لئے میدان میں اتریں گے تو اپنی روایات کو برقرار رکھیں گے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اپنی رجمنٹ کے پرچم اور اپنے وطن کے جھنڈے کو بلند اور ایک عظیم قوم کی طرح اس کی آبرو کو محفوظ رکھیں گے۔“

لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ یا اس کے دماغ کے کسی گوشے میں اری بن مناشے سے ملنے کے بعد، خوف کی کوئی کیفیت موجود تھی۔ بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح، ان بھی کوئی جواب نہ مل سکا۔

28 نومبر 1988ء کو میکسیکو سٹی پہنچے۔ ایر پورٹ پر ان کے انتظار میں ایک ایسا شخص موجود تھا جس کی شناخت کبھی سامنے نہیں آ سکی۔ تینوں کمپنی کے ہیڈ کوارٹر یوروپاں شہر کی طرف ہو کر بعد دو پہر وہاں پہنچے۔ نیر نے وہاں کی مقامی کمپنی ایرولکسیز ڈی یوروپاں سے چھوٹا سیٹا جہاز 210-2 چارٹر کیا۔

اب پھر نیر نے عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جہاز پٹرک ویر کے نام پر کرائے پر حاصل

کے لئے اپنے غیر قانونی اور ناجائز اقدامات کے لئے قانونی ضابطے، جانچ پڑتال کا نظام اور معمول کے قواعد و ضوابط کس دیدہ دلیری سے پامال کئے جاتے رہے تھے۔ ان غیر قانونی آپریشنز میں کئی دوسرے ملکوں مثلاً جنوبی افریقہ اور چلی جیسے دور افتادہ ممالک کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ ایک کتاب لکھنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور اسے یقین ہے یہ کتاب اسے اسرائیلی تاریخ کا سب سے بڑا انتباہ کنندہ بنائے گی۔ بن مناشے نے یہ انتظام کیا کہ نیر کے ساتھ، اس کی اپنی کمپنی نوکال، میکسیکو کے دورے سے واپسی پر دوبارہ ملاقات ہونی چاہئے۔ اس دوران اس کے مہمان نے نیر کو انتباہ کیا کہ وہ اس عورت سے ہوشیار رہے۔ جبکہ ایڈرینا انہیں بات چیت کرتے ہوئے تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی بن مناشے نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ اس انتباہ کی وجہ کیا تھی؟ اس نے صرف اتنا اشارہ کیا اس کی پڑا سہارا۔ گرمیاں میں اسے پہلے سے جانتا ہوں، حالانکہ نیر نہیں جانتا تھا کہ ایڈرینا سنٹن اس کا اصلی نام نہیں تھا۔“

27 نومبر 1988ء کو نیر اور سنٹن نے جعلی ناموں سے میڈرڈ (سپین) کا اگٹھے سفر کیا۔ وہ اپنے آپ کو پٹرک ویر کہلاتا تھا۔ یہ وہ نام تھا جو اس نے اپنے آخری تہران کے ناکام سفر میں اختیار کیا تھا۔ آئی پیریا ایر لائن (Iberia Air) کے مسافروں کی فہرست میں سنٹن کا نام آکسٹر (Easter Arriya) آ رہا تھا۔ انہوں نے جعلی ناموں سے سفر کیوں کیا جب کہ ان کے پاس اپنے اصلی پاسپورٹ، اسرائیلی اور کینڈین موجود تھے۔ اس بات کی کبھی وضاحت نہیں کی گئی۔ ان کے سفر کی دوسری پڑا سہارا یہ تھی میکسیکو جانے کے لئے پہلے میڈرڈ جانا ضروری کیوں سمجھا جبکہ لندن سے میکسیکو سٹی کے لئے براہ راست کئی فلائٹس موجود تھیں۔ کیا نیر اپنی محبوبہ کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ کتنی آسانی سے بہت سے

READING  
Section



قریب کیا کر رہا تھا؟ جب پولیس نے اس سے کہا کہ وہ شناختی کارڈ پیش کرے تو اس نے کہا کہ بل فائنٹ کے دوران اپنا شناختی کارڈ گم کر چکا تھا۔ بعد ازاں ثابت ہوا کہ کروچت اسل میں ارچنٹائن کا باشندہ تھا جو غیر قانونی طور پر میکسیکو میں رہ رہا تھا۔ جب تک اس کے خلاف یہ ثبوت سامنے آتا، وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ حادثے کی جگہ پر کروچت نے نیر کی لاش دریافت کی تھی اور سائنٹسٹ کے ساتھ ہسپتال بھی گیا تھا۔ وہ وہیں تھا جب ایک مقامی اخبار کے رپورٹر نے مزید معلومات کے لئے اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔

جول بیئرمن جو اسرائیل کا پولیٹیکل انٹیلی جنس ڈائجسٹ شائع کرتا تھا کا دعویٰ تھا کہ ایک نوجوان عورت نے بتایا تھا کہ جب وہ اسے گھر سے بلانے گئی تو وہ وہاں موجود تھا لیکن ایک دوسری عورت نے دروازے پر آکر صفائی سے کہا کہ وہ وہاں نہیں رہتا اور اس نے کبھی اس کا نام ہی نہیں سنا۔ ایک دوسری عورت نے دہرایا کہ جہاز سینا پر سائنٹسٹ کی موجودگی محض حسن اتفاق تھا، ورنہ اس کا اسرائیل سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ اس عورت نے اپنی شناخت اس سے زیادہ کرائے سے انکار کر دیا کہ وہ ارچنٹائن سے میکسیکو کی سیاحت کے لئے آئی ہوئی تھی۔ سائنٹسٹ نے اس کے اسراریت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس نے حادثے کی انکوائری کرنے والوں کو بتایا جیسا کہ اسرائیلی صحافی ران ایڈیلست نے 1997ء میں لکھا۔ ”زخمی ہونے کے باوجود اس کی آواز معمول کے مطابق تھی۔ اس نے امیرام نیر کو چند میزوروں ہاتھ ہلاتے اور اسے تسل دیتے ہوئے کہا۔ ”ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی امداد پہنچے ہی والی ہے۔“ بعد کے دنوں میں اسے دو دفعہ یقین دلایا گیا کہ تیر زندہ تھا۔

تدقیق کے لئے نیر کی میت واپس اسرائیل آئی مگر ایک ہزار سے زائد افراد نے اس کے جنازے میں

کیا اور اسی نام کے گریڈ شدہ کارڈ ہے کرائے کی ادائیگی کی۔ اس نے جہاز کے پائلٹ کو حکم دیا کہ دو روز تک انہیں کمپنی نوکال کے پروسیسنگ پلانٹ اور گرو نوواچ کی سیر کرائے۔ جس ہوٹل میں انہوں مشترکہ رہائش کے لئے کمرہ لیا، وہاں نیر نے اپنا اصلی نام درج کرایا۔

وہ شخص جو میکسیکو سے ان کا ہم سفر بنا تھا، دو جس پراسرار طریقے سے ان رپورٹ پر سامنے آیا تھا، یہاں پہنچتے ہی اسی طریقے سے غائب ہو گیا۔

30 نومبر کو نیر اور سائنٹسٹ یورو آپان کے چھوٹے سے ان رپورٹ پر آئے تو اب ان کے ہمراہ ایک دوسرا شخص تھا۔ مسافروں کی فہرست میں اس کا نام پیڈرو اسپینوزا (Pedro Espinoza) ہخاڈو (Huntado) درج تھا۔ وہ کس کے لئے کام کرتا تھا؟ یہ راز بھی رازی ہی رہا۔ یہ بھی ایک منغمہ ہی تھا کہ مسافروں کی فہرست میں انہوں نے اپنے اصلی نام درج کرائے، حالانکہ جہاز کسی اور نام سے چارٹر کیا گیا تھا لیکن پائلٹ نے اس تضاد کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

جہاز نے بہترین موسم میں اڑان بھری۔ جہاز میں پائلٹ، معاون پائلٹ کے ساتھ ان کے تین مسافر سوار تھے۔ ایک سوئیل کے سفر کے بعد سینا کے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی اور لمحوں میں کریش ہو گیا جس میں نیر اور پائلٹ ہلاک ہو گئے۔ سائنٹسٹ بری طرح زخمی ہوئی تھی لیکن معاون پائلٹ اور پیڈرو بھی زخمی لیکن قدرے بہتر حالت میں تھے۔ جب امداد کے لئے پہلا شخص حادثے کی جگہ پر پہنچا جس کا نام پیڈرو کروچت تھا، تو ہخاڈو وہاں سے غائب ہو چکا تھا، جو پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ کروچت سب سے پہلے کس طرح حادثے کی جگہ پر پہنچا۔ یہ بھی ایک راز ہی رہا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ نوکال کا ملازم تھا لیکن نوکال پلانٹ تو وہاں سے بہت دوری پر واقع تھا۔ وہ اس وقت کی کوئی وضاحت نہ کر سکا کہ وہ کریش کی جگہ کے

READING  
Section



# طاہرہ

قیمت 120 روپے

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔

## حاکم کی زندگی

قیمت 270 روپے

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

## بی آئی پی مکتبی رہے گی

مکتبہ عنایت القرآن، لاہور، پاکستان کا  
شعبہ کتب و ادب، لاہور، پاکستان کا شعبہ کتب و ادب  
کو کالوں پر فون کیمر اور مکتبہ لاہور سے۔

ایکٹر حضرت رابعہ عیسیٰ عباسی نے لکھے  
لکھے دیکھیں جو ان کے طریقہ پر ہے۔

مکتبہ داستان

مکتبہ داستان، لاہور، پاکستان کا شعبہ کتب و ادب  
شعبہ کتب و ادب، لاہور، پاکستان کا شعبہ کتب و ادب  
کو کالوں پر فون کیمر اور مکتبہ لاہور سے۔

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب ان کے لئے ہے جن کو کتاب پڑھنا چاہیے۔  
سیاست اور روحانیت کے بارے میں  
معلومات کے لئے کتاب پڑھنا چاہیے۔  
اب اس سے مراد ہے جو بصری طور پر  
عالم کے ساتھ کئے گئے کی ضرورت  
پیش کی جا رہی ہیں۔

READING  
Section



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



موقع پر ان کے لئے پریشانی اور پشیمانی کی کوئی بات سامنے نہیں آ سکتی تھی۔

اس تصویر کو امریکن نیوی کے اس کمانڈر نے بھی تقویت پہنچائی جو نیر کے ساتھ یرغالیوں کی رہائی کے لئے تہران گیا تھا۔ اس کی کہانی اس کے اس دعوے کے گرد گھومتی تھی کہ نیر نے جارج بش سے، جو اس وقت وائس پریزیڈنٹ تھے، سے 20 جولائی 1986ء کو یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں ملاقات کی تھی اور انہیں امریکن ایسٹ کی اسرائیل کے ذریعے ایران کو فروخت ہارے تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔ صحافی جوئل ہیزمن کے مطابق ”نیر خفیہ طور پر تمام بات چیت کو نیپ کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ بش کے ”اسلحہ برائے رہائی یرغالی“ میں مٹوٹ ہونے کا پکا ثبوت آ گیا۔ اس مینگل میں مسکی بھی شامل تھا اور گیسین بھی، جو بعد ازاں لاکربی کے چن ایم جہاز کی تباہی میں ہلاک ہو گیا تھا۔“

ہیزمن کی تحریر کے مطابق اس کمانڈر نے اولیور ہارٹھ کا ٹرائل شروع ہونے سے چند ماہ قبل سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز واقع لیننگٹن کا وزٹ کیا تھا اور ہارٹھ سے ملاقات کی تھی۔ صحافی کے الفاظ میں کمانڈر نے ہارٹھ سے سوال کیا تھا کہ نیر کو کیا ہوا تھا؟ ہارٹھ نے کمانڈر کو بتایا کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے یروشلم مینگل کی نیپ کو منظر عام پر لانے کی دھمکی دی تھی۔“

جن صحافیوں نے ہارٹھ سے سوال کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں دھتکار دیا گیا تھا۔ بش کے مددگاروں نے کئی سال سے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ امریکہ کے سابق صدر نے ایران گیٹ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، پہلے ہی بیان کیا جا چکا تھا۔“

جولائی 1994ء کے آخر میں نیر کی بیوہ جودی کے گھر میں نقب زنی کی واردات ہوئی۔ گھر سے جو کچھ چرایا گیا وہ صرف نیر کی فیس اور دوسری دستاویزات و

کاغذات تھے۔ پولیس نے بیان دیا۔ ”نقب زنی کا کام انتہائی ماہر ہاتھوں کا لگتا تھا۔ جودی نیر نے کہا۔“ چوری شدہ کاغذات و دستاویزات سے لگتا تھا کہ ان سے کسی کی ذات کو خطرہ تھا۔“ اس نے اس سے آگے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ مال مسروقہ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ یہ سوال کہ چوری کس نے کی؟ اس کا کبھی جواب نہ مل سکا۔

اگلے چار سال تک ہجائی شادت موساد کی سربراہی کرتا رہا۔ اس کی کوشش رہی کہ ادارے کو اخبارات کی شہ سرخیوں سے دور کہانیاں گھڑنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھ کر اپنا جاسوسی کام کرتا رہے۔

پبلک کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر کام کرنے سے انٹیلی جنس کمیونٹی کے اندر طاقت حاصل کرنے کی کوشش کم ہوئی بلکہ کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ سیاستدان اب بھی انٹیلی جنس اور سائٹ سب کمیٹیوں میں بیٹھتے تھے لیکن انہیں خوب یاد تھا کہ شادت نے کلف دار کے بعد ان کے منہ کس طرح بند کئے تھے۔ اس کی کارکردگی کی یادیں تازہ تھیں، اسرائیل کے اندر اور باہر بھی اور اس کے خلاف کاٹا پھوسی کی مہم بھی جاری تھی کہ وہ تنگ نظر خود پسند اور مغرور ہے۔ سی آئی اے سے خفیہ رابطوں کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا۔ اس کا حوصلہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔

اس کے ارد گرد کیا ہو رہا تھا، ہجائی شادت کو کچھ ہوش نہ تھا۔ اچانک موسم بہار 1996ء کی خوشگوار صبح کو وزیراعظم نیتن یاہو نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور اسے بتایا گیا کہ اسے تبدیل کیا جا رہا تھا۔ شادت نے بحث کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ نیتن یاہو کے مزاج کو سمجھتا تھا کہ بحث کرنا فضول تھا۔ اس نے صرف ایک سوال پوچھا۔ ”میری جگہ کس کو لایا جا رہا ہے؟“

نیتن یاہو کا جواب تھا۔ ”ڈیٹی یا طوم۔“

اسی دن سے موساد کی ناکامیوں کا آغاز ہو گیا۔

\*\*\*

READING  
Section

SCANNED BY AMIR

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY